نگاہیں بند کر کے حسنِ جاناں دیکھ لیتا ہوں
اندھیرا ہے مگر خورشیدِ تاباں دیکھ لیتا ہوں
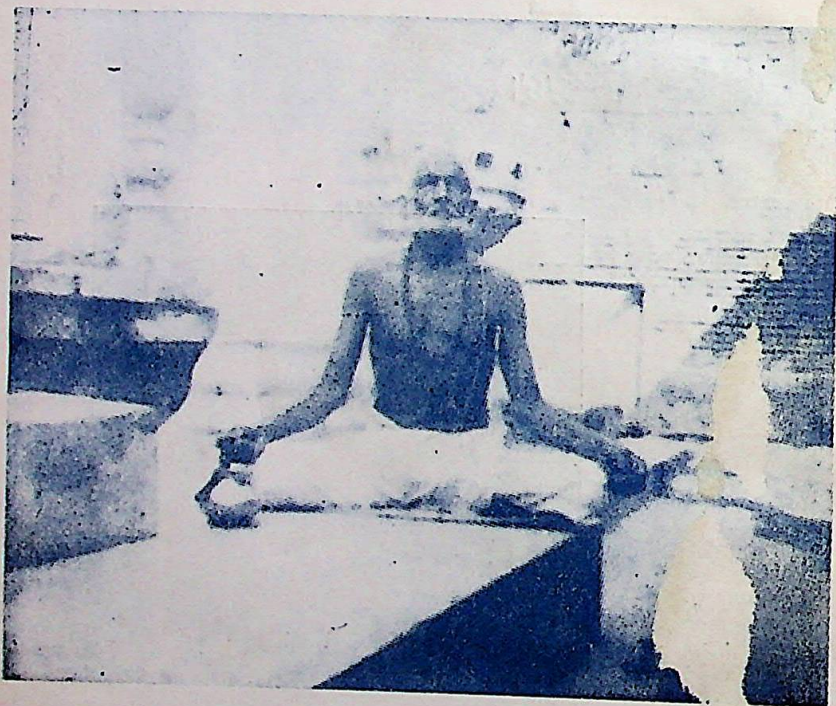
ابوالبلاغت حضرت رتن پنڈوروی
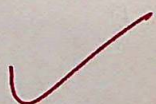
ابوالبلاغت حضرت رتنؔ پنڈوروی

حضرت رتنؔ پنڈوری کا کفش بردار۔
ودّیا پرکاش سرورؔ تونسوی

عالیجناب الحاج حافظ محمد یوسف دہلوی
مُدیرِ اعلیٰ "شمع"

جناب راجندر کرشن

نثار ایاز بیگی

اکرم صابری

جناب سردار گورپال سنگھ واحد

سید محمد اکبر رضوی عادل سیتاپوری

حافظ مولانا محمد یوسف عزیز سیمابی

جناب عقیل صدیقی (جدہ)

علامہ مضطر خیر آبادی

سید سرور عالم سوامی مارہروی

جناب ڈاکٹر اودے سرن ارمان (دہلی)

جناب حکیم رئیس سنبھلی

سلطان ماما

راجہ مہدی علی خان

حامد الہ آبادی

سائل حیدری مینائی گوالیاری

کاشف الہاشمی اوجینی
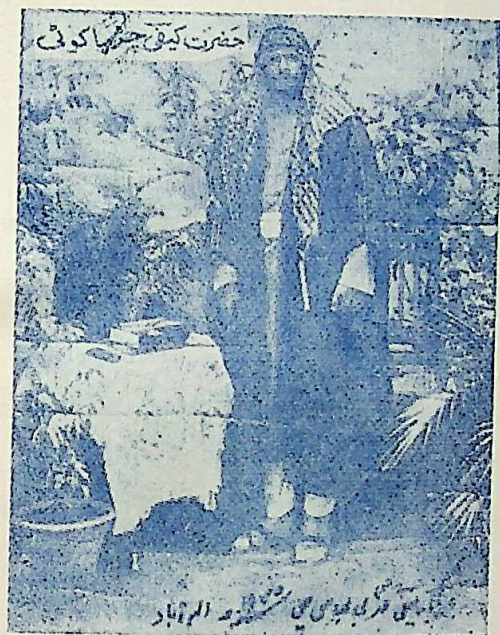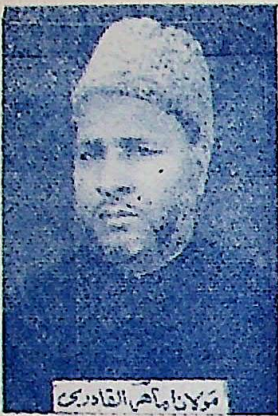
بیچین شفائی دھولپوری

منزلؔ لوہا کٹھیری

حضرت کیفی چڑیاکوٹی

سلطان اوجینی

مہر جائسی

بزمی چڑیاکوٹی

مولانا ماہر القادری

انور بیگ چمن اناوی

سید فدا حسین لکھنو

دلکش لوھا ٹھیری

فرمان ککرالوی

نثار دہاروی

خورشید بڈنگری

عنوان چشتی

قانت جائسی

حضور سہسوانی
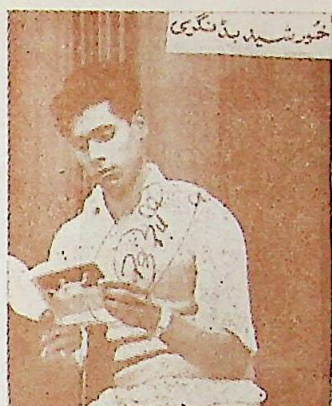
بنامِ آں کہ او نامے نہ دارد
بہ ہر نامے کہ خوانی سر بر آرد

ہندی کے مسلمان شعرا

(ابو البلاغت) سرتن پنڈوروی

اشاعت	۱۹۸۴ء
تعداد	پانچ سو
طباعت	جمال پرنٹنگ پریس دہلی
کتابت	محمد احسن
قیمت	اکیاون روپے

ناشر

ماہنامہ شانِ ہند

فلیٹ ۸ء انصاری مارکیٹ دریا گنج

نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

دُعائیہ رُباعیات

تاریکیٔ شب ہیبتِ طوفاں حائل
دریائے خطرناک نہ دارد ساحل
در راہِ بلا غبیر فتادم یارب
آ! دستِ مرا گیر!! رساں بر منزل

در راہِ طلب بسکہ پریشاں ہستم
بے یار و مددگار و نگہباں ہستم
اے ناصرِ کونین نصیرِ من شو!
متمنیٔ افضالِ فراواں ہستم

رتن پنڈوردی

قطعۂ تاریخ اشاعت

"ہندی کے مسلمان شعراء"

خالقِ کون و مکاں کا شکر ہے
آج ہے میری تمنّا بار یاب

ایک مدت سے تھا جو وجہِ خلش
وہ ہوا شرمندۂ تعبیر خواب

حضرتِ سرور کا ہے لطفِ عظیم
کر دیا ناکام کو بھی کامیاب

یہ سخا۔ یہ جود۔ یہ حسنِ عطا
پا لیا ہے دونوں عالم کا ثواب

رحم کھایا ہے مری افتاد پر
ان کا ایثار و کرم ہے لاجواب

دست گیری کی ہے میری آپ نے
دے رہا ہے دل دعائیں بےحساب

ناز کیوں نہ ہو مجھے تقدیر پر
مہرباں ہے سرورِ عالی جناب

کہہ دے یوں سالِ اشاعت اے رتنؔ
فیضِ سرور سے چھپی آساں کتاب

۱۹۸۱ عیسوی

خاک نشین
رتن پنڈوروی

ہدیۂ تشکّر

"ہندی کے مسلمان شعراء" کی تیاری میں اِس فقیر حقیر گوشہ گیر مؤلف کتاب ہٰذا کی عمر کا ایک خاص حصّہ صرف ہُوا انتہائی صبر آزما حالات کے ماتحت آنکھوں کا تیل ٹپکا کر اور صحت کا جنازہ اُٹھا کر جب مسوّدہ مکمل ہوا تو طباعت و اشاعت کے لئے مُلک کے ہر گوشے پر نظر دوڑائی۔ دستِ سوال دراز کیا۔ دستک پر دستک دی لیکن ہر طرف فضا تاریک تھی اور مایوسی دامنگیر نظر آئی۔ آخر عین ایسے نازک ترین لمحہ میں جب کہ کشتیٔ اُمید طوفانِ شدائد و مکائد کے سخت پرزور تھپیڑوں سے تہ نشین ہونے کو تھی، خالقِ لایزال نے جناب وِدّیا پرکاش صاحب سرورؔ تونسوی مدیر ماہ نامہ "شانِ ہند" دہلی کو ایک غیبی فرشتہ کی شکل میں ناخدائی کے لئے بھیجا جنھوں نے پہلی ہی نظر میں میرے ڈوبتے ہوئے سفینے کو ساحل آشنا کر دکھایا اور کتاب مذکور کی طباعت و اشاعت کا بیڑہ اُٹھایا۔ خاکسار اُن کے اس احسانِ بے پایاں اور عنایتِ بے غایت سے متاثر ہو کر دلی ارادت اور قلبی دعاؤں کے ساتھ ہدیۂ تشکّر و امتنان پیش کرنے کی جراُت کر رہا ہے۔ ؎

ایں ہدیۂ ناچیز تراُفتد قبول ار اگر
نازم نصیبِ خویش را باشم عزیز و مفتخر

▲

خاکنشین: رتن پنڈوروی

انتساب

١- الحاج حافظ محمد یوسف صاحب دہلوی مدیر اعلیٰ ماہنامہ "شمع" نئی دہلی۔

٢- ڈاکٹر اودے سرن صاحب ارمان بلاروی

٣- جناب راجندر کرشن صاحب (بمبئی)

٤- سردار گورپال سنگھ واحد (موگا) پنجاب

٥- جناب ایم عقیل صدیقی صاحب جدہ (سعودی عرب)

٦- حکیم رئیس صاحب سنبھلی (سنبھل)

عرضِ ناشر

ابوالبلاغت حضرت رتن پنڈوروی سے میرے نیازمندانہ تعلقات ایک عرصہ سے ہیں۔ مجھے دلی مسرت ہے کہ جب بھی مجھے یا "شانِ ہند" کو رتن صاحب کی کسی بھی خدمت کے لئے نبرد آزما ہونا پڑا تو قدرت نے کامیابی اور کامرانی سے ہمکنار کیا اور میرا سر اُس ربّ العزّت کی بارگاہ میں سجدہ ریزی کے لئے جھک گیا جس کے سامنے ہر ذی رُوح کا سر ہمیشہ جھکتا رہا ہے۔

یہ کتاب "ہندی کے مسلمان شعراء" ایک عرصہ سے ترتیب دئے جانے کے بعد اشاعت کی گھڑیوں کے انتظار میں تھی کہ یوں ہی ایک خط میں رتن صاحب نے ذکر فرمایا اور اس نادرِ روزگار کتاب کے بارے میں تفصیل سے بتایا کہ کن مشکلات پر قابو پانے کے بعد یہ کتاب پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

رتن صاحب نے انتہائی دلی کرب کے ساتھ تحریر فرمایا کہ کاش ان کی زندگی میں یہ کتاب شائع ہو جاتی۔ اِدھر اپنی یہ عادت کہ ہر وہ کام جو ربّ العزّت کی راہ میں کیا جانا ہو، یا ہر وہ خدمت جو کسی دوست، مُربّی، محسن، یا کسی مظلوم کے لئے انجام دینی ہو، تو پھر ہوش و حواس سے بیگانہ ہو کر "خود بخود کو د پڑا آتشِ عشق میں نمرود" کی معنوی تفسیر بن جانا اپنا ایمان

لہٰذا رتن صاحب کی خدمت میں لکھا گیا کہ آپ "مسودہ" بھجوا دیجئے اسے میں شائع کروں گا۔ کچھ دنوں کے بعد رتن صاحب کے ایک شاگرد کتاب کا مسودہ پہنچانے آئے تو مسوّدے کی ضخامت دیکھ کر حیرت ہوئی مگر اس حیرت و سراسیمگی کو ظاہر کئے بغیر مسوّدہ بخوشی قبول کر لیا گیا اور اُسی رات کتاب کا دیباچہ پڑھنا شروع کیا۔ دو دنوں میں دیباچہ پڑھنے کے بعد

میں نے یہ طے کر لیا کہ اگر اپنا رہائشی مکان بھی گروی رکھنا پڑے تو بھی یہ کتاب شائع کی جائے گی۔ آٹھ دس دن میں جب حقائق نے جذبات اور محسوسات کا بھوت اُتار کر اپنے آپ کو اصلی رنگ میں پیش کیا تو اپنے گردوپیش نظر دوڑائی اور ہر لحاظ سے اپنے آپ کو یہ کتاب شائع کرنے میں بے بس پایا۔ کیونکہ اُس وقت (سنہ ۱۹۸۰ء کے وسط میں) تخمینہ لگایا گیا تو پتہ چلا کہ کسی بھی حالت میں یہ کتاب پندرہ ہزار روپیہ سے کم میں شائع نہ ہو سکے گی اور ادھر "چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں"۔ مگر ایک دروازہ ایسا تھا جہاں سے ہمیشہ دامنِ اُمید حسبِ دلخواہ بھرا ملتا تھا۔ لہٰذا اسی در پر دستک دی۔ اور ربّ العزّت پر بھروسہ کرتے ہوئے محمد احسن صاحب خوشنویس کو بُلوایا اور کتاب کا مسوّدہ کتابت کے لئے ان کے حوالے کر دیا گیا۔ اور ادھر قُدرتِ کاملہ نے میری یوں مدد فرمائی کہ میری درخواست پر ڈاکٹر اوُدے سرن آرمان، جناب راجندر کرشن صاحب جناب گوپال سنگھ واحد اور جناب ایم عقیل صدیقی (جدہ) نے اکیس اکیس صد روپیہ اور حکیم رئیس سنبھلی نے پانچ صد روپے اس کتاب کی اشاعت کے لئے مرحمت فرمائے۔ قبلہ حافظ محمد یوسف صاحب دہلوی مدیر اعلیٰ "شمع" سے اس کتاب کی اشاعت کا ذکر کیا گیا تو اُنہوں نے کتاب کی افادیت، اہمیت اور نوعیت کو دیکھتے ہوئے فرمایا کہ یہ کتاب ضرور شائع ہونی چاہیئے اور اس سلسلے میں ان کا ہر تعاون حاصل رہے گا۔ اعلیٰ پریس دہلی کے ٹھیکیدار اور ان کے صاحبزادے نے سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ریاست کی ایک قابلِ قدر تصنیف "سیف وقلم" کی اشاعت میں جس طرح بددیانتی کا ثبوت دیا تھا وہ میری نظروں میں تھا اور میرا یقین ہے کہ اعلیٰ پریس کے اس ٹھیکیدار اور اس کے لڑکے کو اس بددیانتی کا بدل اللہ تعالیٰ یوں دیں گے کہ ان کی قبروں کو سانپ، بچھو اور دیگر زہریلے کیڑے اپنا مسکن بنائیں گے۔ میں نے بڑے احتیاط اور چوکنے پن سے کام لیتے ہوئے اس کتاب کی کتابت شُدہ کاپیاں اور کاغذ ایک پریس کے حوالے کر دیے

ابھی کتابت شدہ کاپیوں کو پلیٹوں پر جمانے کی نوبت بھی نہ آئی تھی کہ عدالتی فیصلہ کے مطابق اس پریس میں تالہ بندی ہو گئی اور جب کئی ماہ بعد پریس کھلا تو مالکان کاغذ ہضم کر چکے تھے یہ بھی ان کا احسان ہے کہ کتابت شدہ کاپیاں خستہ حالت میں واپس مل گئیں۔ اب ۶۴ ریم کاغذ پھر سے خریدنا کارے دارد والا معاملہ تھا جب کہ کاغذ کے بھاؤ ڈیڑھ گنا ہو چکے تھے۔ تگ و دو کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ کتاب ایک ہزار کی بجائے پانچ صد کی تعداد میں چھاپی جائے لہذا کسی نہ کسی طرح ۳۲ ریم کاغذ کا انتظام کر کے جمال پرنٹنگ پریس کے حوالہ کیا گیا۔ یہ پریس جماعتِ اسلامی کا ہے اور کئی بار سرکاری حکم سے تالہ بند کیا جا چکا ہے۔ اللہ اپنا رحم فرمائے کہ یہ کتاب چھپنے تک پھر تالہ بندی کی نوبت نہ آ جائے۔

بہر کیف ،،ہندی کے مسلمان شعراء،، جو پچھلی تہائی صدی پہلے ترتیب دینی شروع ہوئی وہ طبع ہو کر آپ کے سامنے ہے۔ مجھے تو یہ خوشی ہے کہ قبیلہ رتن صاحب کی محنت بر آئی اور اردو ادب میں ایک ایسی قابلِ قدر کتاب کا اضافہ ہوا کہ جب تک ہندی اور اردو زبانیں اس دنیا میں بولی جائیں گی اس کتاب کی اہمیت میں کمی نہ آئے گی۔

اس کتاب کے مطالعہ سے آپ خود اندازہ لگا سکیں گے کہ کیسی کیسی کتابیں ان سرکاری عہدہ داروں اور ان علمی ادبی اداروں کے کارکنان کی بے التفاتی اور نااہلیت کی شکار ہو کر رہ جاتی ہیں جن پر ہماری سرکار بے انداز روپیہ برباد کر رہی ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد یہ بھی آپ پر روشن ہو جائے گا کہ ہندی زبان کے ارتقاء میں مسلمانوں کا حصہ کس قدر وافر ہے۔ قومی یک جہتی کی زندۂ جاوید مثال یہ کتاب۔ کاش ان سرکاری اداروں کے سربراہوں کو یہ احساس دلا سکے کہ ان لوگوں نے اپنے فرائضِ منصبی کی ادائیگی میں کس قدر مجرمانہ غفلت سے کام لے کر ایسی کتاب کو شائع کرنے سے

انکار کر دیا۔

یہ کتاب ملک کی ہر اُردو اکاڈمی کو بھجوائی جائے گی تاکہ پتہ چل سکے کہ اُردو کے یہ نام نہاد ٹھیکیدار اپنی ذمہ داریوں سے کس حد تک عہدہ برآ ہوتے ہیں۔

مَیں ایک بار پھر اپنے مُربیانِ کرام جناب حافظ محمد یوسف صاحب دہلوی، جناب ڈاکٹر اُودے سرن صاحب ارمانؔ، جناب راجندر کرشن صاحب، جناب ایم عقیل صدیقی صاحب (جدّہ) جناب سردار گوپال سنگھ واحد اور جناب حکیم رئیس سنبھلی کا شکرگزار ہوں جنہوں نے مجھے اپنا وعدہ نبھانے میں مدد دی اور یہ کتاب منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو سکی۔

حضرت رتن پنڈوروی کا کفش بردار
وِدّیا پرکاش سرورؔ تونسوی
دفتر شانِ ہند نئی دہلی
۶؍ جولائی ۱۹۸۲ء

صالح
23.9.14

فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوانِ مضمون	صفحہ

نمبر شمار	عنوانِ مضمون	صفحہ
۱۷۶	عظمت اللہ خاں	۳۵۵
۱۷۷	حسرت موہانی	۳۵۶
۱۷۸	علی امجد حسین	۳۵۷
۱۷۹	قدر بلگرامی - محمد احسن سخن	۳۵۸
۱۸۰	سیّد مقبول حسین	۳۵۹
۱۸۱	آغا حشر کاشمیری - آغا شاعر قزلباش دہلوی	۳۶۰
۱۸۲	سلیم مختار دیوی	۳۶۱
۱۸۳	سردار - حلم	۳۶۲
۱۸۴	عثمان	۳۶۳
۱۸۵	احسان	۳۶۴
۱۸۶	بسمل	۳۶۵
۱۸۷	حبیب	۳۶۶
۱۸۸	خلیل - عاصم	۳۶۷
۱۸۹	ناطق - عزیز سلیمانی	۳۶۸
۱۹۰	یحییٰ اپچولوی - حاجی شاہ وارث علی	۳۷۱
۱۹۱	شاہ امین الدین وارثی	۳۷۲
۱۹۲	بیدم وارثی	۳۷۳
۱۹۳	الف شاہ وارثی	۳۷۴
۱۹۴	اکبر وارثی	۳۷۵
۱۹۵	شائق وارثی	۳۷۷
۱۹۶	نادم وارثی	۳۷۸

صفحہ	عنوانِ مضمون	نمبر شمار

نغمۂ اقبال ← ۲ گرہ

صفحہ	عنوانِ مضمون	نمبر شمار
۴۳۲	سائل حیدری گوالیاری	۲۳۹
۴۳۴	فدا پیا لکھنوی	۲۴۰
۴۳۵	تصوّر گوالیاری	۲۴۱
۴۳۶	راجہ مہدی علی خاں	۲۴۲
۴۳۸	کاشف ہاشمی اجینی۔ سُلطان احمد اُجّینی	۲۴۳
۴۳۹	ضمیر القادری	۲۴۴
۴۴۰	عنایت احمد اسلم	۲۴۵
۴۴۱	عبداللہ عرف گھسو خاں	۲۴۶
۴۴۳	سیّد جمیل الدین عالی	۲۴۷
۴۴۵	تاج سعید	۲۴۸
۴۴۶	نیاز جاوید	۲۴۹
۴۴۷	امیر اجینی	۲۵۰
۴۴۸	منزل لوہاٹھیری	۲۵۱
۴۴۹	دلکش لوہاٹھیری	۲۵۲
۴۵۰	حضور سہسوانی۔ خورشید اجے	۲۵۳
۴۵۲	اکرام ساگری	۲۵۴
۴۵۳	فرمان گگرالوی	۲۵۵
۴۵۴	چمن اٹاوی	۲۵۶
۴۵۵	سلطان بھاما	۲۵۷
۴۵۶	تاج قائم خانی۔ ماہر القادری	۲۵۸
۴۵۸	سب ڈھنگ شاہ	۲۵۹

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر میخواست
آخر آمد ز پسِ پردۂ تقدیر پدید

ہندی زبان کی ابتدا پر نظرِ غائر ڈالی جائے تو آج سے ہزاروں سال پہلے ویدوں کے زمانے میں اس کا سُراغ ملتا ہے۔ اُس وقت سے اُنیسویں صدی کے آغاز تک کوئی ایسا باقاعدہ یا مستند تذکرہ نظر نہیں آتا، جس میں زبان کی ابتدا و ارتقا کا ذکر مسلسل و مربوط صورت میں مرقوم ہو۔ مختلف کتابوں میں زبان و ادب کی مختلف صورتیں اور شاخیں بکھری پڑی ہیں۔ یورپین محققین ان پریشان و پراگندہ ادبی و لسانی جواہر پاروں کو اکٹھا کرنے کی طرف سب سے پہلے متوجہ ہوئے۔ انھوں نے ہمہ تن جستجو بن کر راہِ تحقیق میں قدم رکھا۔ چناں چہ اُنیسویں صدی کے آخر میں سب سے پہلی کتاب مسٹر "جان بیمس" نے بھارتی آریہ بھاشاؤں کا ویاکرن "کمپیریٹو گریمر آف دی ماڈرن ایرین لینگویجز آف انڈیا" کے نام سے لکھی۔ اس کے مختلف حصے ۱۸۷۲ء۔ ۱۸۷۵ء اور ۱۸۷۹ء میں شائع ہوئے۔ اِس کتاب میں بیمس نے ہندی۔ پنجابی۔ سندھی۔ گجراتی۔ مراٹھی، اُڑیا اور بنگالی بھاشاؤں کی گرامر پر روشنی ڈالی ہے۔

۱۸۷۶ء میں "ڈاکٹر کیلاگ" نے گریمر آف ہندی لینگویج لکھی اس میں

کھڑی بولی کے ساتھ ساتھ برج بھاشا۔ اودھی۔ راجستھانی۔ بہاری اور پہاڑی سے متعلق بھی واقفیت بہم پہنچائی گئی ہے۔

۱۸۷۷ء میں "رام کرشن گوپال بھنڈارکر" نے سات تقاریر آریہ بھاشاؤں سے متعلق مرتب کیں جو ۱۹۱۴ء میں "ولسن فلالوجیکل لیکچرز" کے نام سے کتابی صورت میں جلوہ گر ہوئیں۔ ان لیکچروں میں ہندی زبان کی ابتدائی اور درمیانی شکل و صورت پر مبسوط و مشرح خامہ فرسائی کے علاوہ موجودہ ہیئت پر بھی بحث کی ہے۔ "مسٹر بھنڈارکر" پہلے شخص ہیں جنھوں نے ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے اپنی مُلکی زبان کی ادبی تاریخ کا خاکہ نہایت روشن خط میں کھینچا ہے۔ ان کا یہ اقدام اس لئے بھی قابلِ صد ہزار تحسین ہے کہ انھوں نے آئندہ ادبی مورخین و لسانی محققین کے لیے راہ کھول دی۔

۱۸۸۰ء میں "مسٹر روڈلف ہارنلی" نے "گرامر آف دی ایسٹرن ہندی" لکھی اس طرح یورپین محققین کی متحدہ متجسسانہ کوششوں سے دس سال کے قلیل عرصہ میں کئی ایک مفید کتابیں ادب و زبان سے متعلق شائع ہوئیں۔

۱۸۸۳ء میں "ٹھاکر شو سنگھ سینگر" نے "شو سنگھ سروج" کے نام سے ہندی شعرا کا ایک تذکرہ مرتب کیا۔

"جارج ابراہیم گریرسن" نے بہاری زبان سے متعلق ۱۸۸۳ء سے ۱۸۸۷ء تک کئی ایک مسلسل مضامین شائع کرائے اور ۱۸۸۹ء میں "ماڈرن ورنیکولر لٹریچر آف نارورن ہندوستان" کے نام سے ایک ضخیم تذکرۂ شعراء لکھا۔ لیکن اُن کا سب سے بڑا کارنامہ "لنگوسٹک سروے آف انڈیا" (ہندوستانی زبانوں کی کھوج) ہے جو ۱۸۹۴ء میں شروع ہو کر ۱۹۲۷ء میں ختم ہوئی۔ یہ ضخیم ترین کتاب بڑی بڑی گیارہ جلدوں میں ہے۔ اس میں شمالی ہندوستان کی جملہ موجودہ زبانوں کا مفصل ذکر ہے۔ ساتھ ہی پوربی اور پچھمی ہندی کی تمام بولیوں، ان کی مختلف شاخوں کا بیان شرح و بسط سے لکھا گیا ہے۔ کتاب مذکور کی جلدوں کی

طویل تمہید نہایت اہم اور قابلِ قدر ہے۔ ہندی ادب کی ولادت بتدریج ترقی اور موجودہ صورت پر مستند، مسلسل، مفید اور مفصل واقفیت بہم پہنچانے کے لیے یہی تمہید کافی ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ بولیوں کے لحاظ سے مختلف علاقوں کے نقشے بھی دیے گئے ہیں۔

ان کتب کے علاوہ ''مسٹر یو۔ ایل۔ بلاک'' ایک فرانسیسی عالم کی کتاب ''مراٹھی بھاشا'' ۱۹۱۹ء اور سنیت کمار چیٹرجی'' کی کتاب ''ایمرجن اینڈ ڈیولپمنٹ آف دی بنگال لنگویج ۱۹۲۶ء'' قابلِ ذکر ادبی کتابیں ہیں۔

یورپین محققین کی مساعیِ جمیلہ نے اہلِ ہند کی آنکھیں بھی کھول دیں۔ کاشی کی ''ناگری پرچارنی سبھا'' بھی خوابِ خرگوش سے چونکی۔ انگڑائی لے کر اٹھی تو پہلی ہی نظر میں اس کا دھیان اس طرف گیا کہ ہندی کتابوں کے ہزاروں قلمی نسخے مُلک کے مختلف حصوں، شاہی کتب خانوں، بڑی بڑی لائبریریوں، نیز لوگوں کے گھروں میں گُم نام اور روپوشیدہ پڑے مٹی یا دیمک کی نذر ہو رہے ہیں۔ یہ خیال پیدا ہوتے ہی سبھا نے ۱۹۰۰ء سے نایاب کتب کی دریافت کا بیڑہ اُٹھایا اور گیارہ سال کی شبانہ روز محنت و تلاش کی آٹھ رپورٹیں شائع کیں جن میں سینکڑوں گم نام ہندی شاعروں کے نایاب و نامعلوم شاہکاروں کا پتہ چلا۔

۱۹۱۳ء میں یہ سارا مواد اکٹھا کر کے ''پنڈت شیام بہاری مصر'' نے ایک ضخیم تذکرہ ''مصر بندھو ونود'' کے نام سے شائع کیا جو تین حصوں میں منقسم تھا۔ جس میں دورِ حاضرہ کے شاعروں کا ذکرِ خیر بھی کیا گیا۔ علاوہ ازیں ''بابو شیام سُندر داس بی۔ اے'' کا ''ہندی کووِد مالا'' اور ''پنڈت رام نریش'' کا ''کویتا کومدی''! ''ویوگی ہری جی'' کا ''برج مادھوری سار'' تذکرے شائع ہوئے۔ لیکن یہ تذکرے مختصر، مجمل اور نامکمل تھے۔ یہ دیکھ کر ''پنڈت رام چندر شکل'' نے ۱۹۲۹ء میں ایک ضخیم اور جامع تذکرہ ''ہندی ساہتیہ کا اتہاس'' کے نام سے شائع کیا۔ ''بابو رام سکسینہ'' نے ۱۹۳۱ء میں اودھی زبان سے متعلق ایک کتاب انگریزی میں لکھی۔ ۱۹۳۵ء میں آپ کی کتاب ''برج بھاشا''

شائع ہوئی۔ اس میں برج بھاشا کی تولید، تدریجی ترقی اور موجودہ صورت کا حال مفصل لکھا ہے۔ ۱۹۳۴ء میں فرانسیسی عالم "مسٹر بلاک" نے بھارتی آریہ بھاشاؤں سے متعلق ایک کتاب "لا اینڈو ایرین" فرانسیسی زبان میں لکھی۔ اس کتاب میں ہندی لٹریچر سے متعلق آج تک کی تحقیق و تلاش کا ماحصل جمع کر دیا گیا ہے۔

علاوہ ازیں "بھارتیہ اندو ہرلش چندر"۔ بال مکند گپت۔ مہاویر پرساد دویدی۔ بدری ناتھ بھٹ نے بھی ہندی ادب اور ہندی زبان سے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ ان لوگوں کی دیکھا دیکھی "ادھونک ہندی ساہتیہ کا اتہاس"۔ "کھڑی بولی اور ہندی ساہتیہ کا اتہاس"۔ ناتھ سمپردائے، از ڈاکٹر ہزاری پرساد"۔ "بھاشا کی شکھشا"، از شری سیتا رام چترویدی"۔ "ہندی کا سمیک اتہاس" از پروفیسر وشوا ناتھ"۔ "ہندی ساہتیہ کا سولو دھا اتہاس، از شری گلاب رائے"۔ "ہندی ساہتیہ کا سنکھشپت اتہاس"۔ "ہندی ساہتیہ کی روپ ریکھا"۔ "ہمارا ہندی ساہتیہ اور بھاشا پریوار" از پنڈت بھوانی شنکر۔ وغیرہ تذکرے نکلے اور نکل رہے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر دھریندر ورما کا تذکرہ "ہندی ساہتیہ کا اتہاس"۔ اور ڈاکٹر سرجو پرساد اگروال کا تذکرہ "اکبری دربار کے ہندی کوی" دورِ حاضر کی نہایت قابلِ قدر اور قابلِ داد چیزیں ہیں۔ ان کتب کے علاوہ انگریزی فرانسیسی اور جرمن رسائل و جرائد میں ہندی سے متعلق مفید مطلب مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اگرچہ مغربی و مشرقی علماء و محققین نے کمال تحقیق و تجسس سے کام لے کر آریہ بھاشاؤں سے متعلق بال کی کھال نکالی ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تذکرہ نویسوں کی توجہ مسلمان شعراء اور مسلمانوں کی بے نظیر اور عظیم الشان ہندی خدمات کی طرف کماحقہٗ مبذول نہیں ہوئی۔

مقامِ مسرت ہے کہ اردو تذکرہ نویسوں کی چشمِ التفات اس طرف اٹھی ہے، اور ڈاکٹر جعفر حسن خاں کا تذکرہ "منتخبات ہندی کلام"، ڈاکٹر اعظم کریوی کا تذکرہ "ہندی شاعری"۔ سید ظہیر الدین علوی کا تذکرہ "تاریخ ہندی ادب"، ڈاکٹر محمد حسن کا تذکرہ "ہندی ادب کی تاریخ" اور ڈاکٹر محمود حسین خاں کا تذکرہ "جدید ہندی شاعری"، "زیور الطباع

سے مزیّن ہو چکے ہیں۔ لیکن ہندی کے مسلمان شعرا والا پہلو ان ہیں بھی تشنۂ تکمیل رہا ہے
اگرچہ سید امیر حسن نورانی نے لکھنؤ سے اور رٹ صاحب نے لاہور سے اس نام کی دو کتابیں
شائع کی ہیں لیکن وہ انتہائی مختصر اور اجمالی کیفیت کی حامل ہیں، محض چھپن صفحات سے
کتابچے ہیں۔

حیرت ہے کہ مسلمان بھائی ہندی ادب کی ترویج و ترقی میں ہندی شعرا کے دوش
بدوش، بلکہ بعض مقامات پر اپنے ہندو بھائیوں سے بھی آگے نکل گئے ہیں۔
اور اپنی زندگی کا منتہائے مقصد محض ہندی بھاشا کی خدمت کو سمجھا ہے، لیکن ان
کا کوئی باقاعدہ جامع تذکرہ نہیں ملتا۔ اس کمی کو انتہائی شدت کے ساتھ محسوس کرتے
ہوئے مجھ ایسے ہیچمدان نے زاویہ نشین ہونے کے باوجود اس امر کی تکمیل کا تہیہ کیا۔
لیکن راستہ سخت ٹیڑھا تھا۔ پُرخار وادیاں، دشوار گزار گھاٹیاں، لق و دق صحرا۔ موجیں
مارتے ہوئے دریا۔ درندوں سے بھرے ہوئے جنگل۔ برف سے اٹے ہوئے سر بفلک
پہاڑ۔ اُٹھتے ہوئے بگولے، اور بیٹھتی ہوئی گرد، نظر کے سامنے تھے، اور راہ نما ناپید۔ خدا
کا نام تھا اور بس! اپنی دیہاتی اور ویران جھونپڑی ہی میں بیٹھ کر ہندوستان کے کونے
کونے میں نظر دوڑائی۔ وطن کے علماء و ادباء کے قدوم میمنت لزوم میں کاغذی پیرہن
میں حاضر ہوا۔ واہ رے ذرہ نوازی اور وسیع النظری علامہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور
پرنسپل چادرگھاٹ، حیدر آباد دکن۔ جناب مولانا محمد حامد صدیقی لیکچرار چادرگھاٹ کالج
حیدر آباد دکن۔ جناب مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی۔ جناب مولانا نثار احمد فاروقی، اور
جناب مولانا امتیاز علی عرشی ایسے ادب پرور بزرگوں نے سر پر ہاتھ رکھا۔ علامہ نیاز
فتح پوری۔ علامہ منوّر لکھنوی۔ علامہ محوی صدیقی۔ اثر رام پوری۔ شوق اثری۔ شاکر اور نگ آبادی
پروفیسر آلِ احمد سرور علی گڑھ نے ہاتھ پکڑا۔ اُٹھایا۔ گردِ کلفت جھاڑی۔ گلے لگایا۔ پیٹھ ٹھونکی۔
کمرِ ہمت بندھائی اور ایک ایسی راہِ مستقیم دکھائی جو ان تمام نکیلے کانٹوں، شر بار سنگریزوں،
مسموم ہواؤں، اُمنڈتے ہوئے طوفانوں اور جوش زن سمندروں سے بچتی ہوئی عین منزلِ
مقصود پر پہنچتی تھی! ان مہربان بزرگوں نے ہندوستان کے ادبی علمی خزانوں کا پتہ دیا۔ زور صاحب

نے حیدر آباد دکن کی سرزمین چھان ماری۔ اثر صاحب نے کلکتہ اور لکھنؤ کی راجدھانیوں کی کھوج کی۔ قبلہ فاروقی صاحب نے تو دہلی سے رام پور تک کے تہ خانے کھول دیے۔ رام پور میں عرشی صاحب کی دریادلی اور بندہ نوازی کا یہ عالم کہ رضا لائبریری سے قدیم فارسی و اردو تذکرے جن سے ہندی زبان سے متعلق کچھ سُراغ مل سکے نقل کروا کر مرحمت فرمائے۔ علاوہ ازیں ماہرِ لسانیات "حضرت نادم سیتاپوری" اور اُن کے برادرِ بزرگ قبلہ سیّد محمد اکبر صاحب رضوی عادل سیتاپوری، قلعہ معلی محمود آباد" نیز اعتبار الملک علامہ حضرت مہر جائسی کے لاتمناہی احسانات اور بے نہایت عنایات ہیں جنھوں نے از راہِ کرم گستری و ادب نوازی محض مجھ ناچیز گوشہ نشین کی کامیابی کے لئے مختلف بالشتوں اور ادبی مراکز کے سفر کئے۔ تاریخی کتب خانوں کو کھنگالا۔ اور ان میں سے گوہرہائے آبدار تلاش کر کے بے دریغ اس خاک نشین کو عطا فرمائے اور سینکڑوں گم نام ہندی گو مسلمان شعرائے سے روشناس کرایا۔

ان محسنوں اور کرم فرماؤں کے بڑھاوے نے مجھ شکستہ پا و شکستہ دل کو یہاں تک بڑھایا کہ آج منتہائے مقصد بر لا بٹھایا۔ فی الحقیقت یہ ادبی صحیفہ محض ان ہی کی سعیِ بلیغ کا نتیجہ ہے۔ ان کے اس احسان کی گرانباری گردنِ تسلیم کو تا ابد خم رکھے گی۔

اب میں سرِ منزل پہنچ کر بھی منزل رسی کی کامیابی ناظرین ہی کی ادب پروری اور قدر دانی پر چھوڑتا ہوں، اور ان بزرگوں۔ رہنماؤں۔ بہی خواہوں۔ ہندی گو مسلمان شاعروں اور غم گساروں کے احسانِ بے پایاں کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جھنوں نے اس سکڑے رستے میں میری دست گیری فرماتے ہوئے مجھے پستی سے اس بلندی تک اٹھایا کہ آج میں مدعائے زندگی کو شرمندۂ تکمیل اور اپنی سعی کو مشکور دیکھ رہا ہوں۔

اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ کتاب کو دلچسپ اور پُر منفعت بنانے کے لیے محض شاعروں کے تذکرے ہی کو کافی نہیں سمجھا گیا بلکہ اس کے ساتھ ہندی زبان کی مختصر تاریخ۔ ہندی زبان کی خصوصیات۔ ہندی اور اردو۔ ہندی اور مسلمان ابواب کا بھی اضافہ کر دیا گیا ہے اور ہر عنوان کے ماتحت حتی الامکان مفصل و مدلل بحث کرنے کی سعی

کی گئی ہے۔ ان ابواب کو مکمل و مفید بنانے کے لیے بیسیوں کتب کی ورق گردانی کرنی پڑی۔
تذکرہ کی تکمیل کے لئے کمال تجسّس و تحقیق کے بعد اُن مشہور موسیقاروں، اور
مغنّیوں کا ذکر بھی کر دیا گیا ہے جو اپنے ہندی گانے خود بنا کر گاتے تھے یا گاتے ہیں۔
اس کے ساتھ ہی ایسے حضرات کو بھی جگہ دی گئی ہے جو اُردو رسم الخط میں ہندی نغمات
پیش کرتے ہیں، محض اس خیال سے کہ خدمتِ زبان میں وہ بھی برابر کے حصہ دار ہیں۔
لیکن بخوفِ طوالت فقط ان کے نام ہی پر اکتفا کی گئی ہے۔

آخر کار بالغ نظر اربابِ ادب و ناقدینِ فن کی خدمتِ اقدس میں بہ صد عجز و
انکسار عرض ہے کہ اس گوشہ گیر فقیر کے ویرانہ نما دہاتی ماحول کی مجبوریوں پر نظر رکھتے
ہوئے اور ایک سراپا تقصیر انسان کی حیثیت سے جہاں کوئی کجی یا کوتاہی نظر آئے بندۂ ناچیز کو
اپنا ادنیٰ ترین خادم سمجھ کر مطلع فرمائیں، اور ساتھ ہی اپنی صائب رائے سے نوازیں
تاکہ آئندہ ایڈیشن میں تصحیح ہو سکے۔

دیدہ ور بود حبابے کہ با پیمانۂ وفا
ہر چہ در کیسۂ خود داشت بہ دریا بسپرد

ہندی زبان کی

مختصر تاریخ

محققینِ السنہ انتہائی کاوشِ تجسس کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دُنیا بھر کی زبانوں کی اصل ایک ہے، اور اسی ایک اصل سے بے شمار تنے، شاخیں، پتّے اور کونپلیں پھوٹی ہیں اور پھوٹ رہی ہیں۔ اِس اصل کو ماہرینِ لسانیات نے "آریہ کُل بھاشا" کا نام دیا ہے۔ فی زمانناً اس کی حسب ذیل شاخیں دُنیا کے مختلف حصوں میں پائی جاتی ہیں۔

۱۔ ہند یورپی (انیگلو انڈین) شاخ

جدید تحقیق کے مطابق یہ شاخ سب شاخوں پر سبقت رکھنے کے علاوہ زیادہ اہم، زیادہ وسیع اور زیادہ وقیع ہے۔ اس شاخ سے نکلی ہوئی زبانیں شمالی ہند، افغانستان اور ایران کے علاوہ سارے یورپ میں بولی جاتی ہیں۔ سنسکرت۔ پالی۔ یونانی۔ لاطینی اور پُرانی فارسی کے علاوہ انگریزی۔ فرانسیسی۔ جرمن۔ نئی فارسی۔ پشتو۔ ہندی۔ مراٹھی، بنگالی اور گجراتی زبانیں اسی زمرہ میں شامل ہیں۔

۲۔ سیمٹک شاخ

زمانۂ قدیم میں فونیشیا۔ آرمینیا اور اسیریا کی زبانیں اسی شاخ سے تھیں۔

ان کے نمونے اب صرف سکوں اور کتبوں پر ہی ملتے ہیں۔ یہودیوں کی قدیم زبان "ہبرو" جس میں پہلے پہل بائبل لکھی گئی تھی اور قدیم عربی جس میں "قرآن مجید" لکھا گیا تھا، اسی شاخ میں شامل تھیں۔ دورِ حاضرہ میں جدید عربی اور حبشہ زبانیں اس کی یادگار ہیں۔

۳۔ ہیمٹک شاخ

اس شاخ میں شمالی افریقہ کی زبانیں شامل ہیں جن میں مصر کی پرانی کاٹشک زبان قابلِ ذکر ہے۔ اس کے نمونے محض عمارتوں اور کتبوں پر کھدے ہوئے ملتے ہیں۔ آج کل شمالی افریقہ کے ساحلی علاقوں میں بولی جانے والی زبانیں اسی سے علاقہ رکھتی ہیں۔

۴۔ بودھی شاخ

چین، تبت، برہما، سیام، ہمالیہ کی تلہٹی میں بسنے والے لوگوں کی زبانیں اسی شاخ میں شامل ہیں جنوب مشرقی ایشیا میں ان ہی زبانوں کا جال پھیلا ہوا ہے جن میں چینی زبان ممتاز درجہ رکھتی ہے۔

۵۔ تورانی شاخ

اس شاخ کی زبانیں منگولیا، منچوریا اور سائبیریا میں بولی جاتی ہیں۔ ترکی یا تاتاری زبان بھی اسی شاخ سے ہے۔ اس کی ایک شاخ یورپ میں بھی گئی ہے جو مختلف بولیوں میں تقسیم ہو کر روس میں بولی جاتی ہے۔ بعض علماء زبان کوریا اور جاپان کی زبانوں کو بھی اسی زمرہ میں شامل کرتے ہیں۔

۶۔ دراوڑ شاخ

جنوبی ہند میں بولی جانے والی زبانیں مثلاً تامل ۔ تلگو ۔ ملیالم اور کنہڑ اسی شاخ میں شامل ہیں ۔ یہ زبانیں شمالی ہند کی زبانوں سے بالکل مختلف ہیں ۔

۷۔ ملیے پالی نیشین شاخ

جزیرہ نمائے ملایا ۔ جزائر شرق الہند (جاوا ۔ سماٹرا ۔ بورینو ۔ فلپائن) کے علاوہ جزیرہ مدغاسکر ۔ نیوزی لینڈ میں بولی جانے والی زبانیں اسی شاخ کی تحویل میں آتی ہیں ۔ ہندوستان میں کولی اور سنتھالی قوم میں مستعمل زبانیں بھی اسی میں شامل ہیں ۔

۸۔ بنٹو شاخ

اس شاخ کی زبانیں جنوبی افریقہ میں بولی جاتی ہیں ۔ زنجبار کی سہیلی اسی شاخ کی ایک ممتاز زبان ہے ۔

۹۔ وسط افریقہ کی شاخ

شمالی افریقہ کی ہیمیٹک اور جنوبی افریقہ کی بنٹو شاخ کے درمیان جو زبانیں بولی جاتی ہیں وہ وسط افریقہ کی شاخ میں شامل ہیں ۔ بالخصوص برٹش سوڈان کی زبانیں ۔

۱۰۔ امریکا کی شاخ

امریکا میں تھوڑی تھوڑی دوری پر بولیوں میں خاص فرق اور اختلاف پایا جاتا ہے ۔ شمالی اور جنوبی امریکا کے اصلی باشندوں کی بولیاں اس شاخ میں آتی ہیں ۔

۱۱۔ آسٹریلیا کی شاخ

آسٹریلیا اور تسمانیہ کے اصلی باشندوں کی زبانیں ایک ہی گروہ میں شامل کرکے اُن کو آسٹریلیا کی شاخ کا نام دیا گیا ہے۔

۱۲۔ پرشانت مہاساگر کی شاخ

اس سمندر کے چھوٹے چھوٹے جزیروں میں بولی جانے والی زبانیں اسی شاخ کے زیر اثر ہیں۔

۱۳۔ دیگر زبانیں

بعض زبانوں کا صحیح تعلق ابھی معلوم نہیں ہو سکا۔ مثلاً کاکیشیا میں بولی جانے والی زبانوں کو ابھی کسی شاخ میں شامل نہیں کیا گیا۔ ان زبانوں میں جارجئین کی اشاعت بہت زیادہ ہے۔ اور یوٹسکن نام کی زبانیں عجیب وغریب ہیں۔ دُنیا کی لسانی تقسیم کرتے ہوئے محققین نے ابھی ان کو کسی گروہ میں شامل نہیں کیا۔

مندرجہ بالا تیرہ شاخوں میں ہمارے لئے سب سے زیادہ قابلِ ذکر ہندیورپی شاخ ہی ہے کیوں کہ ہمارے موضوع کا سُراغ اسی شاخ میں ملتا ہے۔

"انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا"، "ایرانئین لنگوئجز اینڈ پرشئین"، "لینگوسٹک سروے آف انڈیا" ایسی مستند کتب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ماہرینِ السنہ نے اس بڑی شاخ کو پھر چھوٹی آٹھ شاخوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

(۱) ہند آریائی۔ (۲) آرمینین۔ (۳) بالٹوسلے وِنک۔ (۴) البانک یا البینین۔ (۵) یونانی۔ (۶) اطالوی۔ (۷) کیلٹک۔ (۸) جرمن یا ٹیوٹانک۔

ان میں پہلی شاخ (ہند آریائی) ایک ممتاز درجہ پر فائز اور اپنے اندر ایک خاص فوقیت رکھتی ہے۔ اس کو تین گروہوں میں بانٹ دیا گیا ہے (۱) ایرانی (۲) دردو (۳) آریہ ورتی۔

ایرانی - تاریخ میں اس کی تین مختلف صورتیں ہیں :-
الف - قدیم ایرانی - ب - ایرانی کا دورِ وسطیٰ - ج - جدید ایرانی -

(ا) قدیم ایرانی

قدیم ایرانی کے نمونے مسیح سے بھی ڈیڑھ ہزار سال پہلے پارسیوں کی مقدس کتاب "اوستا" میں ملتے ہیں۔ "اوستا" کی زبان رِگ ویدکی زبان سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے جس سے ایرانیوں کا آریہ نسل سے ہونا ثابت ہوتا ہے۔ "اوستا" کے علاوہ پرانی ایرانی کے نمونے کتبوں، پتھر کی لاٹھوں، اور ریتکوں پر کھدے ہوئے ملتے ہیں۔ ان میں سب سے مشہور کتبے شہنشاہ دارا (۵۲۲ ق م سے ۴۸۹ ق م کے عہد کے ہیں :-

گریرسن کی رائے ہے کہ :-

"ڈھائی ہزار سال قبل مسیح آریہ لوگ ایران کے شمال مشرقی علاقہ "میدیا" میں آباد ہوئے۔ کئی صدیوں کے بعد کچھ تو وہاں سے نکل کر ہند میں چلے آئے، اور ان کی زبان قدیم آریائی زبان سے الگ ہو کر ہند آریائی بن گئی - اور جو ایران ہی میں رہ گئے اُن کی زبان بدلتے بدلتے ایرانی بن گئی"

بعض ماہرینِ لسانیات کا خیال ہے کہ مفقود شدہ آریائی زبان کی ایک چھوٹی سی دستاویز بھی دستیاب ہو گئی ہے۔ یہ ایک عہد نامہ تھا جس میں ہتیوں کے بادشاہ نے متنّی کے دیوتا (متر۔ اندر اور ورن) کا ذکر کیا تھا۔ یہ زبان نہ تو ہند آریائی ہے اور نہ ایرانی۔ بلکہ ان دونوں کا ماخذ آریائی زبان ہے۔ یہ دستاویز قبل مسیح پندرھویں صدی میں لکھی گئی تھی۔ (دیکھئے گریرسن مقدمہ لسانیاتی سروے ہند صفحہ ۹۷-۹۸-۹۹

(ب) ایرانی کا دورِ وسطیٰ

سنہ ۲۲۶ء سے سنہ [illegible] تک ایران میں ساسانیوں کا دور دورہ رہا ہے۔ اس

دَور میں پہلوی زبان نے خوب ترقی کی۔ اس کو وسطی فارسی یا کتابی پہلوی بھی کہتے ہیں۔

ج۔ جدید ایرانی

اس کا ابتدائی نمونہ دیکھنا ہو تو فردوسی کا شاہنامہ دیکھئے۔ دورِ حاضر میں عربی الفاظ کی بہتات نے صورت تبدیل کر دی ہے۔ روسی ترکستان کی تازیکی۔ افغانستان کی پشتو۔ اور بلوچستان کی بلوچی اسی نئی ایرانی کی بیٹیاں ہیں، علاوہ ازیں بحیرہ کیسپین کے گرد و نواح کی زبانیں کُردی۔ بختیاری۔ بدخشانی۔ مدگلشتی۔ یغنوبی اور غلچا زبانیں اس زمرہ میں شامل ہیں۔

۲۔ درد

"تاریخ شاہد ہے کہ وسط ایشیا سے آریہ لوگ دو راستوں سے ہندوستان میں داخل ہوئے۔ کچھ تو کوہِ ہندوکش کے مغربی دروں سے گزر کر کابل کی راہ پنجاب میں داخل ہوئے۔ اور کچھ گلگت اور چترال کی گھاٹی سے شمالی ہند میں آ کر گنگا اور جمنا کے میدانوں بس گئے۔ ضروری ہے کہ ان دشوار گذار گھاٹیوں سے گزرتے وقت کچھ آریہ لوگ کوہستانی علاقہ میں بس گئے ہوں گے۔ یہی قومیں آج کل کشمیر یا دوسرے پہاڑی علاقوں میں پائی جاتی ہیں۔ ان کی زبان کا نام درد یا پشاچی ہے۔ کشمیری بولی اسی زبان کی ایک شاخ ہے۔

۳۔ آریہ ورتی

اس شاخ کے بھی تین دور کئے جا سکتے ہیں۔ دَورِ قدیم۔ دَور وسطی۔ دَورِ جدید
دورِ قدیم کی زبان کا نمونہ یا نشان رِگ وید میں ملتا ہے۔ ملاحظہ ہو (جو لز بلاک ہند آریائی صفحہ ۱، اور ڈاکٹر سکمارسین کی کتاب "قدیم فارسی کے کتبے" صفحہ ۹۸، ۹۹)

آریہ زبانیں ہند یورپی خاندان کی زبانوں میں شامل ہیں۔ کسی زمانے میں

آریائی زبان ایک تھی۔ یہ ان لوگوں کی زبان تھی جو اپنے آپ کو آریہ کہتے تھے۔ چناں چہ
(رگ وید منڈل ۸۔ سوکت ۲۴۔ منتر ۷) سات دریاؤں کے ملک کے باشندوں کو
آریہ کے نام سے پکارا گیا ہے۔ قدیم ایران کے مشہور بادشاہ دارا چھٹی صدی قبل مسیح نے
اپنے ایک کتبہ میں جو "نقشِ رستم" کا کتبہ کہلاتا ہے اپنے آپ کو ایرانی کا بیٹا۔ آریہ۔
آریہ کی اولاد کے اوصاف سے متصف کیا ہے۔ اس کتبہ میں آریہ کا تلفظ (آری) ہے۔

دورِ وسطیٰ

اس دور کی زبان کے نمونے بکثرت ملتے ہیں۔ مثلاً پالی یا اشوک کے کتبوں
اور سکوں پر کندہ حروف کی زبان نیز پراکرت اور اپ بھرنش بھاشائیں اس دور
سے متعلق ہیں۔ مثلاً ماگدھی۔ اردھ ماگدھی۔ شورسینی۔ مہاراشٹری۔

دورِ جدید

عہد حاضر کی ہند آریائی کا آغاز ساتویں صدی سے ہوتا ہے۔ ساتویں صدی
عیسوی میں بنگالی گیت "چریا" کی تصنیف ہوئی تھی۔ اور اسی زمانے میں پرانی ہندی کی
تصنیفات بھی نیپال میں "راہل سنکرتیاین" کی تحقیقات سے برآمد ہوئی ہیں۔ مراٹھی
اور گجراتی بہت بعد کی ہیں۔ مراٹھی گیا نیشوری کی تصنیف سنہ ۱۲۹۰ء میں ہوئی اور گجراتی زبان میں ایک
سنسکرت صرف و نحو سنہ ۱۳۹۴ء میں لکھی گئی۔ گویا عہد حاضر میں ہندوستان کی موجودہ زبانوں کو شامل کیا جاسکتا ہے۔
مندرجہ بالا تفصیلات و تشریحات سے یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ دُنیا کے لسانی اجتماع میں ہند
یورپی خاندان کی ہند آریائی شاخ کے دورِ حاضرہ کی زبانوں میں ایک برگزیدہ زبان ہندی بھی ہے۔
اس گورکھ دھندے کو سادہ الفاظ میں اس طرح ادا کر سکتے ہیں کہ آریایوں کی دیگر موجودہ زبانوں
کی طرح ہندی کا جنم بھی قدیم آریہ زبانوں سے ہوا ہے۔
قدیم آریہ لوگوں کے اصلی وطن اور ہندوستان میں داخلہ سے متعلق مختلف
خیالات پائے جاتے ہیں۔ پرانے خیال کے لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ تبت میں آفرینش کی ابتدا ہوئی وہاں ہی سے

لوگ دُنیا میں پھیلے اور ہندستان میں بھی آریہ لوگ وہیں سے آئے۔

لوکمانیہ پنڈت بال گنگا دھر تلک نے رگ وید کے کچھ منتروں کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ آریوں کا اصلی وطن ہندوستان ہی میں دریائے سرسوتی اور ہمالیہ کے درمیانی علاقہ میں تھا۔ اُس وقت پنجاب کا نام سپت سندھو (سات دریاؤں کا مدیٰ) تھا یہیں سے وہ لوگ ایران اور یورپی ممالک میں پھیلے۔

عُلمار کا ایک گروہ یہ رائے دیتا ہے کہ مغربی ایران اور ترکی میں آریوں کے دیوتاؤں کے نام (متر۔ ورن۔ اندر۔ ناستیہ) ایک تحریر میں ملے ہیں۔ یہ تحریر ۱۴۰۰ قبل مسیح کی تسلیم کی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آریہ لوگوں کی ایک شاخ یہاں رہی، اور ۴۰۰ قبل مسیح کے بعد ہندوستان گئی۔

قدیم مقدس اور تاریخی کتابوں پر غور کریں تو علمار کا یہ خیال باطل ہو کر رد جاتا ہے کیوں کہ مہابھارت کی جنگ آج سے ۵۶۰۰ سال پہلے ہوئی تھی اور رامائن کا زمانہ اس سے بھی ہزاروں سال پہلے کا ہے۔ اُس وقت بھی ہندوستان کی تہذیب دُنیا کے ہر کونے میں پھیلی ہوئی تھی، پانڈو نو دیگیہ کے سلسلہ میں امریکا گئے ہیں۔ امریکا کا راجہ ببر باہن مہابھارت کی لڑائی میں آیا۔ عراق اور عرب کے ممالک بھگوان کرشن کے لڑکے نے آباد کئے ہیں۔ بیاس رشی افغانستان اور ترکستان میں گھومتے رہے ہیں۔ مہاراجہ دھرت راشٹر کی بیوی گاندھاری قندھار کی لڑکی تھی۔ ان حالات میں ۱۴۰۰ قبل مسیح میں ایران سے آریوں کا ہندوستان میں آنا وہم و گمان کے سوا اور کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔

اصل یہ ہے کہ اس باب میں ماہرین ہنوز کسی ناطق فیصلے پر نہیں پہنچ سکے۔ فی الحال ہمیں یورپی عُلمار ہی کی تحقیق پر صاد کرنا پڑتا ہے، کیونکہ اس میدان میں وہ گوئے سبقت لے گئے ہیں۔

مغربی علمار میں دو قسم کے خیالات ملتے ہیں۔ ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ آریہ لوگ جنوب مشرقی یورپ میں رہتے تھے، وہاں سے تین حصوں میں بٹ کر کچھ لوگ یورپ کے ممالک میں بس گئے اور باقی ایران میں آ گئے۔ وہاں کافی عرصہ رہنے کے بعد کچھ لوگ ہندوستان چلے آئے۔ یہی

وجہ ہے کہ دونوں کی متبرک کتابوں اوستا اور رگ وید کی زبان میں یگانگی اور قرابت پائی جاتی ہے۔

محققین و ماہرین کی ایک بہت بڑی تعداد اس خیال پر متفق ہے کہ آریہ لوگوں کا اصلی وطن وسط ایشیا میں بحیرہ کیسپین کالا ساگر اور کوہ قاف کا نزدیکی علاقہ تھا، اور وہیں سے اٹھ کر آج سے دس ہزار سال پہلے دو حصوں میں بٹ کر دو ہی رستوں سے ہندوستان میں وارد ہوئے۔ ایک حصہ کابل کی راہ اور بعد میں دوسرا گلگت اور چترال کی راہ۔ چوں کہ پہلے آنے والے لوگ پنجاب اور دامنِ کوہ میں بس چکے تھے، اس لیے بعد میں آنے والے آریہ ہمالیہ اور بندھیاچل کے درمیانی علاقہ میں آباد ہوگئے۔ اس علاقہ کا نام سنسکرت گرنتھوں میں "مدھیہ دیش" لکھا ہے۔ مدھیہ دیش کی موجودہ زبان ہندی اپنے اردگرد کی دوسری زبانوں میں نمایاں شان رکھتی ہے اور اسی حصہ کی شورسینی پراکرت دوسری پراکرتوں کی بہ نسبت سنسکرت کے زیادہ نزدیک ہے۔

ہندی آریوں کی قدیم زبان کا نمونہ رگ وید ہی میں ملتا ہے اور اس کی بدلی ہوئی صورت برہمن گرنتھوں اور شوتر گرنتھوں میں ملتی ہے۔ اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ سنسکرت کی ادبی شکل کے علاوہ لوگوں کی کچھ عام بول چال بھی تھی کیوں کہ قدرتی طور پر تعلیم یافتہ و جاہل۔ مہذب غیر مہذب۔ شہری و دیہاتی طبقہ کی زبان میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور رہتا ہے غیر مہذب لوگ اصلی الفاظ کو مکمل طور پر ادا کرنے کی بجائے سیدھے سادے اور ٹوٹے پھوٹے انداز میں ادا کر دیتے ہیں چناں چہ سنسکرت الفاظ کھشیر اور دُگدھ کو غیر مہذب لوگ کھیر اور دودھ کہہ کر ہی کام چلا لیتے ہیں۔ جیسا کہ پاتنجلی کے زمانے میں صرف عالم فاضل برہمن ہی صحیح سنسکرت بولتے تھے اور دوسرے عام لوگ سنسکرت کی بگڑی ہوئی صورت، یعنی پراکرت استعمال کرتے تھے

بعض علماء پراکرت کا آغاز ایک ہزار قبل مسیح، اور بعض ۵۰۰ قبل مسیح مانتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ویدک زمانہ ہی سے پراکرت زبانیں اصل زبان کے ساتھ ساتھ رہی ہیں، کیوں کہ ہر زمانے میں مہذب و غیر مہذب کا فرق برابر رہا ہے۔

۵۰۰ قبل مسیح میں پانتنی نے زبان کو قواعد کے شکنجے میں جکڑ دیا۔ جس کے سبب با ضابطہ اور ادبی زبان تو سنسکرت رہ گئی اور باقی ہر جگہ پراکرت بولی جانے لگی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سنسکرت کا ایک ہی لفظ مختلف مقامات کے لب و لہجہ کے مطابق کئی قسم کی سادہ صورتوں میں بولا جانے لگا۔ مثلاً سنسکرت کا لفظ "اُپادھیائے" راجستھان میں "اُپادھا" بن گیا اور پنجاب میں صرف "پادھا" یا "پاندھا" رہ گیا۔ دوسری طرف بہار اڑیسہ وغیرہ میں یہی لفظ بگڑ کر پہلے "اُپ جھجا" اور پھر "اوجھا" بن گیا اور آخر کار سب طرف سے آزادی حاصل کر کے صرف "جھا" رہ گیا۔ اب کوئی آدمی اسے پہچانتا تک نہیں کہ یہی "جھا" کسی وقت "اُپادھیائے" تھا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پراکرت مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہو کر پیشاچی، شورسینی۔ ماگدھی۔ اردھ ماگدھی اور مہاراشٹری ناموں سے پکاری جانے لگی۔

ہیم چندر اور مارکنڈے کی سنسکرت گرامروں اور "وراڑچی" کی تصنیف "پراکرت پرکاش" سے پتہ چلتا ہے کہ صرف ونحو کے علماء نے پراکرت کی ان مختلف صورتوں کو بھی صرف ونحو کے ضوابط میں منضبط کر دیا۔ اور یہی منضبط پراکرت لٹریری زبان بن گئی۔ لیکن عوام الناس کی بولی میں پراکرت کی بگڑی ہوئی صورت مستعمل ہونے لگی۔ لٹریچر یعنی تصنیف و تالیف کی زبان قواعد میں جکڑی جا کر منجمد ہو گئی اور عامتہ الخلائق کی زبان زندہ زبان رہی۔ اس جکڑ بند اور تنظیم نے جغرافیائی اور مقامی اختلافات اور راہ آمد و رفت کی دشواریوں سے مل کر ہر ایک پراکرت میں کئی کئی رنگ پیدا کر دیئے۔ بولی کے ان مختلف رنگوں کو "اُپ بھرنش" کا نام دیا گیا۔ مثلاً۔

دردیا پشاچی (جو کشمیر اور شمال مغربی سرحدی صوبہ سے تعلق رکھتی تھی) کی اُپ بھرنش بولیاں کشمیری اور پشتو کہلائیں۔

شورسینی (جو بہار سے سندھ تک اور پنجاب سے مالوے تک پھیلی ہوئی تھی) سے کھڑی بولی (ہندی)۔ بانگرو، برج بھاشا، پنجابی۔ لہندا، پہاڑی۔ راجستھانی اور گجراتی بولیاں پیدا ہو گئیں

ماگدھی۔ اس سے بہاری۔ بنگالی۔ آسامی۔ اُڑیا زبانیں پیدا ہوگئیں۔
اردھ ماگدھی (جو اودھ میں بولی جاتی تھی) سے پُوربی ہندی پیدا ہوئی۔
مہاراشٹری سے مراٹھی وجود میں آئی۔
بعض محققین نے ناگر۔ براچڑ اور اُپ ناگر آپ بھرنشوں کا بھی ذکر کیا ہے۔
ناگر گجرات کے اس حصے میں بولی جاتی تھی جہاں آج کل ناگر برامن بستے ہیں،
ناگری اکھشری کا نام ان ہی کے نام پر پڑا۔ ناگر کا مدار شور سینی پراکرت تھا اس کی
پہلی گرامر ہیم چند گجراتی نے بارھویں صدی میں لکھی۔
براچڑ، یہ اپ بھرنش سندھ میں بولی جاتی تھی۔
اُپ ناگر، یہ اپ بھرنش ناگر اور براچڑ کے ملاپ کا نتیجہ تھی۔ یہ بھی راجستھان
اور دکھنی پنجاب کی بولی تھی۔
"لنگوسٹک سروے آف انڈیا" میں ان زبانوں کی تشریح یوں بیان کی گئی ہے۔

۱۔ سندھی

سندھو ندی کے دونوں کناروں پر صوبہ سندھ میں بولی جاتی ہے۔ اس
بھاشا کے بولنے والے زیادہ تر مسلمان ہیں۔ اس میں فارسی الفاظ کی کثرت ہے
اور فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ گھریلو حساب کتاب دیوناگری میں رکھا جاتا
ہے۔ اس بھاشا کی پانچ اہم بولیاں ہیں۔ جن میں بچولی اور کچھی زیادہ اہم ہیں۔
قدیم زمانے میں براچڑ بولی اسی علاقے کی تھی، سندھی میں لٹریچر بہت کم ہے۔

۲۔ لہندا

یہ مغربی پنجاب کی زبان ہے۔ لہندا اور پنجابی کی حدیں باہم اس طرح ملی
ہوئی ہیں کہ ان میں تمیز کرنی مشکل ہے۔ لہندا پر دردیا پیشاچی کا بہت گہرا اثر
پڑا ہے۔ لہندا کو دیگر نام بھی ... پنجابی ... جٹکی ... اُچی ... ہندکی وغیرہ ہیں۔ اس

کا لٹریچر کوئی نہیں۔ اس کی اپنی اصلی لپیؔ "لنڈا" ہے۔ لیکن آج کل یہ فارسی لپیؔ میں لکھی جاتی ہے۔

۳۔ پنجابی

اس زبان کا علاقہ ہندی کے علاقے کے ٹھیک شمال مغرب میں ہے یہ بھارتی پنجاب میں اور پاکستانی پنجاب کے پوربی حصہ میں بولی جاتی ہے۔ صحیح شکل میں اس کا استعمال امرت سر کے گرد و نواح میں ہوتا ہے۔ لہندا کی طرح پنجابی پر بھی درد اور پشاچی بھاشاؤں کا اثر زیادہ ہے۔ یہ لہندا سے اس طرح مخلوط ہے کہ دونوں کا الگ کرنا مشکل ہے۔ اس کی اپنی لپیؔ لنڈا ہی ہے۔ یہ راجپوتانے کی مہاجنی اور کشمیر کی شاردا لپیؔ سے ملتی جلتی ہے۔ گورو انگد دیو جی نے دیوناگری مدد سے اس لپیؔ میں اصلاح کی اور لنڈا کے اس نئے روپ کو گورمکھی کے نام سے موسوم کیا آج کل پنجابی زبان کی کتابیں اسی زبان میں ہیں۔ اس بھاشا میں اب کافی لٹریچر پیدا کیا جا رہا ہے شری گورو گرنتھ صاحب کی بھاشا دور متوسط کی ہندی یعنی برج بھاشا ہے نہ کہ پنجابی۔ ڈوگری اور ٹاکری بولیاں اس زبان کی صورتیں ہیں۔

۴۔ گجراتی

یہ بھاشا گجرات بڑودہ اور ان کے نزدیکی علاقوں میں بولی جاتی ہے بھیلی اور خاندیشی بولیاں اس سے بہت تعلق رکھتی ہیں۔ گجراتی زبان کا پہلا شاعر نرسنگھ مہتہ تھا جو ۱۴۱۳ء میں پیدا ہوا۔ پراکرت کی گرامر لکھنے والے بھی ہیم چند گجراتی تھے۔ یہ بارہویں صدی میں ہوئے ہیں۔ انھوں نے گجرات کی ناگر اپ بھرنش کی کھوج کی ہے۔ قدیم آریوں کا مسلسل تغیر و تبدل گجراتی ہی سے مکمل طور پر ملتا ہے۔ یہ پہلے دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی تھی۔ اب گجراتی رسم خط رائج ہو گیا ہے۔

۵ راجستھانی

یہ زبان راجستھان کی ہے جو تمام راجپوتانہ، ممالکِ متوسط کے مغربی حصہ اور پنجاب کے جنوبی حصہ میں بولی جاتی ہے۔ "سر جارج گریرسن" کی تحقیق کے مطابق بارھویں صدی میں راجگان جے پور قنوج سے مارواڑ میں جا بسے۔ جے پور کے کچھواہے اور پنجاب کے چھوٹے راجے راجپوتانہ منتقل ہو گئے۔ متھرا سے یادو فرقہ کے لوگ بھی گجرات چلے گئے۔ یہ سب راجستھانی بولتے تھے۔ راجستھانی بھاشا گجراتی سے بہت متاثر نظر آتی ہے۔ اس کی چار بولیاں ہیں۔

ا۔ میواتی یا آہیرواٹی — یہ ریاست الور۔ دہلی کے جنوب میں اور گوڑگانواں کے اِرد گرد بولی جاتی ہے۔

ب۔ مالوی — اس کا مرکز ریاست اندور ہے۔ میواتی اور مالوی میں کسی قسم کا ادبی کارنامہ موجود نہیں ہے۔

ج۔ جے پوری یا ہاڑوتی — یہ جے پور۔ کوٹہ اور بوندی میں بولی جاتی ہے، اس زبان میں ادبی ذخیرہ موجود ہے۔ دادو دیال اور اُس کے شاگردوں کی بانی اسی زبان میں ہے۔

د۔ مارواڑی یا میواڑی — یہ جودھ پور، بیکانیر، جیسلمیر اور اُودے پور میں بولی جاتی ہے۔ اس بھاشا کا قدیم ادب ڈنگل یا پنگل کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں کے رہنے والوں میں سے جو شعرا برج بھاشا میں شاعری کرتے تھے اُن کی بھاشا پنگل کہلاتی تھی۔

ان بولیوں کی بناوٹ کو بغور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جے پوری، مارواڑی سے۔ میواتی برج بھاشا سے۔ مالوی بُندیل کھنڈی سے بہت ملتی جلتی ہے۔

۶- دکھنی ہندی

ہندی زبان کے مصنفین و تذکرہ نگاروں نے شمالی ہند کی ہندی پر تو بہت کچھ لکھا ہے لیکن دکھنی ہندی سے متعلق پہلو تہی عمل میں آتی رہی۔ حالاں کہ ہندی زبان کے دورِ متوسط میں جب سور۔ تلسی۔ کیشو اور میراں کا کلام سب کو والا و شیدا بنا رہا تھا تو اس زمانہ میں دکھن میں بھی ہندی زبان کے سحر کار اپنے جادو اثر کلام سے لوگوں کو بے خود بنا رہے تھے۔ جہاں برج اودھی اور راجستھانی میں تصنیف و تالیف کا کام جاری تھا، وہاں دکھنی ہندی میں بھی ادبی ذخیرہ جمع ہو رہا تھا۔

جس دکھنی ہندی کو اردو تذکرہ نگاروں نے اردو کا نام دیا ہے وہ فی التحقیقت ہندی ہی ہے۔ خود شاہ برہان الدین جانم ۱۵۶۰ء میں اپنی بھاشا کو ہندی ہی کا نام دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

یہ سب بولوں ہندی بول	پن تو انوبھو سیتی کھول
ایو نر اکھے ہندی بول	مانی تو چکھ دیکھیں کھول
ہندی بولو کیا وکھان	جس کے پرساد تھا منج گیان

(ہندی کے ساہتیہ کار صفحہ ۴۵-۴۶)

محمد تغلق نے ۱۳۲۷ء میں جب دولت آباد میں اپنی راجدھانی بنائی تو وہاں فوجی سپاہیوں مصنفوں۔ شاعروں اور دیگر لوگوں کا اجتماع ضروری تھا۔ اس وقت دکھنی ہندی ادب میں ایک نیا موڑ آیا۔ دولت آباد اورنگ آباد۔ بیجاپور اور گولکنڈہ اس کے خاص مرکز بن گئے۔ بہمنی بادشاہوں کے عہدِ حکومت میں اس کو بہت ترقی ہوئی اس کے بعد عادل شاہی قطب شاہی۔ نظام شاہی بادشاہوں نے اس کو اپنایا اور اسے خاص مقام عطا کیا۔

دکھنی ہندی کے شعرا زیادہ تر صوفی مت رکھتے تھے۔ اس زمانے کی تصانیف میں شاہ میراں جی کا "خوش نامہ" (۱۵۴۲ء) اشرف بیابانی کا "نوسرہار"

(سنہ ۱۵۲۴ء)۔ شاہ جانم کا "ارشاد نامہ" (سنہ ۱۵۲۶ء) ابراہیم عادل شاہ ثانی کا "نورس"، سنہ ہجری۔ وجہی کا "سب رس" (۱۱۰۰ ہجری)۔ قاضی محمد بحری کا "من لگن" اور "بھنگ نامہ" غیر مطبوعہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں اور اس بات کا ثبوت ہیں کہ دکھنی کا لفظ ہندی کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

فی الحقیقت قدیم زمانے میں ہندی کو دکن میں دکنی اور گجرات میں گجراتی کہا جاتا تھا۔ گجراتی کے علاوہ گجری کا لفظ بھی ملتا ہے، چنانچہ شاہ برہان الدین جانم جو بیجاپور کے ایک قدیم مصنف ہیں۔ اپنے رسالہ حجت البقا میں کہتے ہیں ؎

جے ہوویں گیان بچاری تا دیکھیں بھاکا گجری

اہلِ گجرات نے نویں صدی کے وسط میں اسی زبان میں تصنیف و تالیف کا کام شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ اس زمانے میں گجرات میں شیخ باجن۔ سید گاؤں دھنی۔ دولت۔ شیخ خوب محمد چشتی گجراتی ہندی میں شعر کہتے تھے۔ اسی طرح شعرائے گولکنڈہ میں ملا وجہی۔ ملا غواصی۔ شاہ محمد جامی دکنی زبان میں شعر گوئی کرتے تھے شاہ محمد جامی سلطان قلی قطب شاہ کے دربار میں رہتا تھا اس نے کوک شاستر کی کتاب سنسکرت سے اخذ کر کے فارسی نظم میں لکھی۔ (اردوئے قدیم صفحہ ۶۶)

"تاریخی حالات نے کھڑی بولی کو جو شمالی ہند میں سترھویں صدی کے شروع تک محض بول چال کی زبان تھی، دکن اور گجرات میں کوئی دو سو سال پہلے ادبی زبان کی حیثیت دے دی تھی۔ ان علاقوں میں یہ زبان علاء الدین خلجی اور دوسرے شاہانِ دہلی کے لشکروں، ہندو سادھوؤں اور مسلمان صوفیوں کے ذریعے سے پہنچی۔ دکن میں بہمنی سلطنت اور اُس کی جانشین ریاستوں کے زیرِ سایہ، اور گجرات میں مقامی مسلمان بادشاہوں کے دربار میں اسے وہ قدر و ہمت افزائی نصیب ہوئی جو دہلی کے شہنشاہی دربار میں نہیں ہوئی تھی۔"

(ماہنامہ آجکل دہلی مطبوعہ ۱۹۵۷ء صفحہ ۵ از مضمون ڈاکٹر سید عابد حسین)

۷۔ پچھمی ہندی

شمالی ہند کی ادبی زبان یہی ہے۔ اسی زبان کو ہندی۔ ہندوی۔ ہندوستانی ریختہ اور اُردو کے نام سے پکارا گیا ہے۔ جس کی تفصیل یوں ہے کہ باہر سے آنے والے مسلمان ترکی یا فارسی بولتے تھے اُن کے الفاظ کھڑی بولی میں ملنے شروع ہوئے۔ کیوں کہ دہلی کے آس پاس پچھمی ہندی کی ایک شاخ کھڑی بولی مروج تھی مسلمانوں کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ لیکن زندگی اور حکومت کی ضرورتیں لوگوں کی زبان کے استعمال پر مجبور کرتی تھیں اسی طرح عام لوگوں کے لئے بھی ضروری تھا کہ وہ اپنی بات نو واردوں کو سمجھا سکیں۔ اس میل جول اور ہندو مسلم اتحاد سے اُردو کی ابتدا ہوئی جسے ہندی یا ہندوی کہا گیا ہے۔

ادبی اور فنی کتب میں دیکھا گیا ہے کہ "سنسکرت" کا "سا" فارسی میں "ہا" سے بدل جاتا ہے۔ اس لئے سنسکرت کے الفاظ "سندھو" اور "سندھی" فارسی کی شکل میں آ کر ہند اور ہندی ہو جاتے ہیں۔ گویا ہندوی یا ہندی لفظ فارسی زبان ہی کا ہے، کیوں کہ سنسکرت پراکرت کے قدیم گرنتھوں میں یہ لفظ نہیں ملتا۔ فارسی میں ہندی کے متعارف معنی "ہند کا رہنے والا" یا "ہند کی زبان" ہیں اس لحاظ سے ہندی لفظ کا اطلاق ہندی یا ہندوستان میں بولی جانے والی کسی بھی آریہ بھاشا پر ہو سکتا ہے۔ فی زمانناً اس کا استعمال شمالی ہند کی ادبی زبان کے معنوں میں ہوتا ہے۔ اس علاقہ کی حدود مغرب میں جیسلمیر، شمال مغرب میں انبالہ، شمال میں شملہ سے لے کر نینیتال کا مشرقی حصہ اور پہاڑی علاقوں کا جنوبی حصہ، مشرق میں بھاگل پور، جنوب مشرق میں رائے پور، اور جنوب مغرب میں کھنڈوہ تک پہنچتی ہیں۔ اس زبان کی چار شاخیں ہیں، برج بھاشا۔ قنوجی۔ بانگرو۔ بندیلی۔

برج بھاشا: مغربی ہندی کی وہ شاخ جو اٹاوہ۔ متھرا۔ آگرہ اور خاص برج میں رائج تھی برج بھاشا کہلاتی تھی۔ اس زبان کے ادبی کارنامے اودھی سے بھی زیادہ

مفید اور جاذبِ نظر ہیں۔ شمالی ہند کے مشہور شعرا نے چار، پانچ صدی تک اس
میں شاعری کی ہے۔
قنوجی = اسے برج بھاشا کی بگڑی ہوئی شکل کہنا چاہیے۔ یہ زبان اٹاوہ
اور پریاگ کے درمیانی حصے میں رائج ہے۔ اس کے علاوہ ضلع ہردوئی اور اُناؤ
کے کچھ حصے میں بولی جاتی ہے۔ اس میں ادبی کارنامے شاذ و نادر ہیں۔
بانگرو = اس کو جاٹو یا ہریانی بھی کہتے ہیں۔ یہ دہلی۔ کرنال۔ رہتک۔ حصار
کے ضلعوں اور ریاست پٹیالہ۔ جنید۔ نابھہ کے دیہات میں بولی جاتی ہے سرسوتی
ندی اس بولی کے علاقے کی مغربی حد سمجھنی چاہیے۔ یہ بولی پنجابی اور راجستھانی کا
معجونِ مرکب ہے۔
بندیلی = بندیل کھنڈ کی بولی ہے۔ جھانسی۔ جالون۔ ہمیرپور، گوالیار۔
بھوپال۔ اور بہار، نرسنگھ پور، سیونی اور ہوشنگ آباد میں بولی جاتی ہے۔
ریاست پنّا کے مہاراجہ چھترسال کے زمانے ہی سے اس میں ادبی کارنامے پائے جاتے
ہیں۔ آلہا کھنڈ یا آلہا اُودل اس زبان کے روپ کا بہترین نمونہ ہے۔

۸۔ پوربی ہندی

اس کا علاقہ مغربی ہندی کے مشرق میں اور بہاری کے مغرب میں ہے۔ یہ کچھ باتوں
میں مغربی ہندی سے اور کچھ باتوں میں بہاری سے ملتی ہے۔ اودھی۔ بگھیلی۔
اور چھتیس گڑھی اس کی دیسی بھاشائیں ہیں۔ اس زبان میں لٹریچر بہت ہے۔
دیوناگری لپی میں لکھی جاتی ہے۔
اودھی = جمنا کے کنارے ضلع فتح پور اور الہ آباد کے جنوب میں بولی جاتی ہے۔
تلسی داس جی کا "رام چرت مانس" اسی زبان میں ہے۔
بگھیلی = یہ مدھیہ پردیش کے مشرق بگھیل کھنڈ۔ جبل پور، مانڈلے اور باندہ میں
رائج ہے۔ اودھی سے بہت کچھ مماثلت رکھتی ہے۔

چھتیس گڑھی = اس کو لریا یا خلتا بھی کہتے ہیں۔ یہ رائے پور۔ بلاس پور۔ کانکیر۔ نندگاؤں۔ خیر گڑھ۔ رائے گڑھ۔ کوریا۔ سرگجا۔ اڈے پور اور پٹنہ میں بولی جاتی ہے۔ اس میں قدیم ادب بالکل نہیں ہے۔ البتہ کچھ بازاری کتابیں ضرور چھپی ہیں۔

۹۔ بہاری

یہ زبان بنگالی کی بہن ہے کیونکہ بنگالی۔ بہاری۔ آسامی۔ اڑیا، چاروں بہاگدھی کا اپ بھرنش ہیں۔ ہندی بھاشا بہاری کی چچیری بہن کہی جا سکتی ہے۔ اس بھاشا میں مندرجہ ذیل تین بولیاں قابلِ ذکر ہیں:۔

۱۔ میتھلی = جو دربھنگہ کے آس پاس بولی جاتی ہے۔

۲۔ مگھی = مرکز پٹنہ اور گیا سمجھنا چاہیے۔

۳۔ بھوج پوری = یہ گورکھ پور اور بنارس کے اضلاع کے علاوہ شاہ آباد چنپارن اور ضلع سارن میں بولی جاتی ہے۔

۴۔ "چٹرجی" = بھوج پوری کو میتھلی اور مگھی سے اتنا مختلف مانتے ہیں کہ وہ گریرسن صاحب کی طرح ان تینوں کو ایک ساتھ رکھ کر بہاری بھاشا کا نام دینے کو تیار نہیں ہیں۔ (دیکھئے چٹرجی بنگال لینگویج صفحہ ۵۲۔ مطبوعہ ۱۹۲۶ء)

۱۰۔ اڑیا

قدیم نام اتکل، حال اڑیا۔ اڑیسہ میں بولی جاتی ہے۔ اس کو اتکلی یا اوڈھی بھی کہتے ہیں۔ سب سے پہلے اڑیا لفظ تیرھویں صدی میں ایک پتھر کی لاٹھ پر ملا ہے۔ اس میں تلنگو اور مراٹھی الفاظ کثرت سے پائے جاتے۔ انگریزی اور فارسی الفاظ بھی ہیں۔

۱۱۔ بنگالی

گنگا کے دہانے اور اس کے شمال مغرب کے میدانوں میں بولی جاتی ہے۔

شہری اور دہاتی بنگال میں بہت فرق ہے۔ اس میں سنسکرت الفاظ کی بھرمار ہے۔ اس کی تین بولیاں ہیں —— پوربی ۔ شمالی مغربی۔ ڈھاکہ کے اردگرد پوربی بنگالی۔ ہگلی کے نزدیک پچھمی بنگالی اور باقی جگہ شمالی بنگالی بولی جاتی ہے ۔ اس کا رسم الخط پرانی دیوناگری ہے۔

۱۲۔ آسامی

آسام میں بولی جاتی ہے، اس بھاشا میں تاریخی لٹریچر بہت کم ہے۔ یہ بنگالی لپی میں لکھی جاتی ہے۔

۱۳۔ مراٹھی

یہ مہاراشٹری اپ بھرنش کی بیٹی ہے ۔ یہ صوبہ بمبئی میں پونہ کے چاروں طرف صوبہ برار۔ صوبجات متوسط کے جنوب میں اور ناگپور وغیرہ میں بولی جاتی ہے اس کے جنوب میں دراوڑ بھاشائیں ہیں۔ اس کی تیس بولیاں ہیں جن میں سے پونہ کے نزدیک بولی جانے والی دیسی مراٹھی ادبی زبان ہے۔
مراٹھی اکثر دیوناگری لپی ہی میں لکھی اور چھاپی جاتی ہے۔ روزانہ کاروبار میں "میٹری" لپی کا رواج ہے۔ مراٹھی کے ادبی کارنامے اور ادبی شاہ کار ہر دل عزیز اور قابلِ توجہ ہیں۔

۱۴۔ پہاڑی بھاشائیں

ہمالیہ کے جنوبی دامن نیپال وغیرہ میں پوربی پہاڑی بولی جاتی ہے۔ اس کو نیپالی۔ پربتیا۔ گورکھالی اور خس کُرا بھی کہتے ہیں۔ اس کا درست استعمال کھٹمنڈو کی گھاٹی میں ہوتا ہے۔ اس میں کچھ جدید ادب بھی موجود ہے نیپال کے عوام کی بولیاں چینی اور تبتی سے بہت کچھ ملتی جلتی ہیں۔ ان بولیوں میں نیوا قوم

کی زبان نیواری زیادہ اہم ہے۔ شاہی دربار میں ہندی بھاشا ہی معزز و ممتاز ہے۔

جرمن اور روسی ماہرین نے نیپالی زبان کا بڑا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ یہ دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ کوہستانی علاقے کے وسطی حصے کی بولیاں دو حصوں میں بانٹی جا سکتی ہیں۔

(ا) **کماؤنی** ۔ یہ الموڑہ اور نینی تال کے علاقے میں بولی جاتی ہے۔

(ب) **گڑھوالی** ۔ جو ریاست گڑھوال اور مسوری کے نزدیک پہاڑی علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ ان دونوں بولیوں میں کوئی قابلِ ذکر ادبی ذخیرہ نہیں ہے۔ کاروبار کے لئے ہندی بھاشا ہی کو اپنا لیا گیا ہے۔ ان بولیوں کی لپی دیوناگری ہے۔

مغربی پہاڑی زبان کی بولیاں مختلف ہیں۔ یہ سرہند کے اوپر شملے کے آس پاس کے علاقے میں بولی جاتی ہیں۔ ادبی لحاظ سے ان کی کوئی اہمیت نہیں۔ محققین نے اس علاقہ میں تیس سے زیادہ بولیوں کا سراغ لگایا ہے جن میں "جون سار باور" کی بولی "جون ساری" "شملہ پہاڑ کی بولی کیونتھلی" "کلو ریاست کی "کلوی"۔۔۔ اور ریاست چنبہ کی چنبالی قابل ذکر ہیں۔

موجودہ پہاڑی زبانیں راجستھانی ... سے بہت ملتی جلتی ہیں۔ درمیانی پہاڑی بولی کا تعلق جے پوری سے اور مغربی پہاڑی کا تعلق "مارواڑی" سے معلوم ہوتا ہے۔

مغربی اور وسطی کوہستانی علاقے کا قدیم نام "سپادلکھش" تھا۔ پہلے یہاں گوجر آکر بسے۔ پھر اسلامی حملوں کے وقت بہت سے اچھوت بھی "سپادلکھش" میں آ بسے۔ جس زمانے میں "سپادلکھش" کی خس قوم نے نیپال کو فتح کیا تو ان خس فتح مندوں کے ساتھ وہاں کے راجپوت اور

گوجر بھی شامل تھے۔ یہی تعلقات اِن زبانوں کی مماثلت کا موجب ہیں۔

(دیکھئے "ہندی بھاشا کا اتہاس" از دھریندر ورما۔ صفحہ ۵۹)

مندرجہ بالا بیان سے صاف ظاہر ہے کہ پراکرت کی اَپ بھرنش صورت ہی سے ہندی کا جسم ہوا۔ چنانچہ اَپ بھرنش ہندی کے پدوں کا سب سے پرانا سراغ بودھی سادھوؤں کی رُوحانی کتب میں بکرم کی ساتویں صدی کے آخر تک ملتا ہے۔

"شوسنگھ سروج" کے حوالے کے مطابق پرمار خاندان کے راجپوت راجہ "مان" کے وزیر "پشپہ" نے ایک النکار گرنتھ (صنائع بدائع) سمت ۷۷۰ بکرم میں لکھا ہے، جس کی زبان اَپ بھرنش یا پُرانی ہندی ہے۔

اس سے صاف طور پر عیاں ہے کہ ہندی کا بیج ساتویں صدی بکرم کے آخر اور آٹھویں صدی بکرم کے شروع میں بویا جا چکا تھا۔ مورخین ادب ہندی کے لئے یہ بات حیرت ناک ہے کہ راجہ مان کے بعد راجہ منج اور بھوج کے زمانے میں تصنیفات کا سلسلہ باقاعدہ شروع ہوتا ہے اور درمیان کی دو صدیاں کسی ادبی تصنیف کا پتہ بتانے کے لئے خاموش ہیں۔

بہرکیف ہندی کی ولادت سے آج تک بتدریج و مسلسل تغیر و تبدل پر نظر ڈالیں تو اسے حسب ذیل پانچ ادوار میں منقسم کر سکتے ہیں:۔

(۱) اَپ بھرنش کال (قدیم ہندی کا دور) سمت ۷۰۰ بکرم سے سمت ۱۰۵۰ بکرم تک۔

(۲) ویر گاتھا کال (رزمیہ شاعری کا دور) سمت ۱۰۵۰ بکرم سے سمت ۱۳۷۵ بکرم تک۔

(۳) بھگتی کال (عبادت و تصوف کا دور) سمت ۱۳۷۵ بکرم سے سمت ۱۷۰۰ بکرم تک۔

(۴) ریتی کال (فنی دور) سمت ۱۷۰۰ بکرم سے سمت ۱۹۰۰ بکرم تک۔

(۵) ادھونک کال (دَور حاضر) سمت ۱۹۰۰ بکرم سے اب تک

زبانِ ہندی کی تاریخ کو مکمل کرنے کے لئے اگر ان جملہ ادوار کا حال بالتفصیل بیان کیا جائے تو ایسا بے پایاں دفتر تیار ہو سکتا ہے جس میں اصل موضوع کی تلاش ناممکن نہیں تو دشوار ترین ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس لئے اصلی موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر یہاں صرف اُن کے نام ہی لکھ دینے پر اکتفا کی گئی ہے۔ آگے چل کر ہر دَور کے ماتحت مسلمان شعرا کا ذکر کیا جائے گا۔

▲

ہندی زبان کی خصُوصِیات

فنِ انشا و شعر کا ممتاز درجہ یہ ہے کہ جو کچھ کہا جائے، اُسے نہ صرف عقل تسلیم کرے بلکہ قلب بھی قبول کرے۔ اِس ناقدانہ نظریہ کے پیشِ نظر جب ہم ہندی ادب پر متجسسانہ و تنقیدی نگاہ ڈالتے ہیں تو پہلی ہی نظر میں اس کی شیرینی و لطافت اور خفیف طرازی ہماری دل کشی کا موجب ہوتی ہے۔ اس کے الفاظ کی موسیقیت اور نغمائی تجلّیات دیکھ کر بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندی زبان سراسر ترنّم اور سراپا لوچ ہے اس کے حسنِ سادہ کی دل پذیری دیکھ کر ہی ڈاکٹر جعفر حسن نے لکھا ہے کہ:

"جو خصوصیت اُردو میں میرؔ کو اور جرمن میں ہائنے کو حاصل ہے۔ وہ ہندی کے تقریباً ہر با کمال شاعر میں موجود ہے"

مولانا آزادؔ دہلوی مرحوم کا قول ہے کہ:

"فارسی اور اُردو کی انشا پردازی میں جو دشواری ہے، وہ ہندی کی انشا میں آسانی ہے۔ اس میں ایک باریک نقطہ غور کے لائق ہے، وہ یہ ہے کہ بھاشا، زبان جس شے کا بیان کرتی ہے، اُس کی کیفیت ہیں ان خط و خال سے سمجھاتی ہے جو خاص اُس شے کے دیکھنے، سننے، سونگھنے

چکھنے یا چھونے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس بیان میں اگرچہ مبالغہ
کے زور یا جوش و خروش کی دھوم دھام نہیں ہوتی، مگر سننے والے کو
جو اصل شے کے دیکھنے سے مزہ آتا ہے، وہ سننے سے آجاتا ہے۔"

(آب حیات صفحہ ۹۳)

ہندی ادب کے اساتذہ کا متفقہ طور پر یہی فیصلہ ہے کہ ہندی شاعری کی جانچ
پڑتال کے لئے تین اہم اصول مدِ نظر رکھنے چاہئیں۔ وہ یہ ہیں:۔

ستیم ۔ شِوم ۔ سُندرم   सत्यं-शिवं-सुन्दरम्

یعنی حقائق کی صحیح مصوری۔ اخلاقیات اور حسنِ بیان و زبان۔
یہ اصول ہی ہندی زبان کی دل کشی و دل نشینی کی بیّن دلیل ہیں۔ "ڈکٹر کرزن" لکھتا ہے کہ
"جب ہم مشرقی خصوصاً ہندی شاعری اور فلسفہ پر نظر ڈالتے ہیں تو
اس پاک اور اعلیٰ تخیل کے مقابلہ میں یورپین فلسفہ کی بلند ترین پرواز
(جہاں بسا اوقات صرف ہماری اعلیٰ ترین ہستیاں پہنچ چکی ہیں) اس قدر
پست و ذلیل معلوم ہوتی ہے کہ ہم آن اُستادانِ مشرق کے سامنے زانوئے
ادب تہہ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ یہ گہوارۂ تمدن
درحقیقت اعلیٰ ترین فلسفۂ عالم کا سرچشمہ ہے۔"

(ماہنامہ نگار لکھنؤ کا ہندی شاعری نمبر جنوری ۱۹۳۶ء)

گوسائیں تلسی داس کی تصنیف منیف "رام چرت مانس" پڑھیے۔ انھوں نے
مذہبی معتقدات۔ تزکیہ نفس۔ درستیٔ اخلاق۔ بے ثباتیٔ دنیا۔ مناظرِ قدرت، اور جذبات
رنج و راحت کا بیان جہاں بھی کیا ہے، من و عن تصویر کھینچ دی ہے۔ ہر موقع پر تکلف و
تصنع کو بالائے طاق رکھ کر دل کش تمثیلات اور قدرتی تشبیہات سے ایسا سماں باندھا
ہے گویا ہر منظر کو شاعر نے خود مشاہدہ کیا ہے۔ رقت خیز مضامین کا بیان بے ساختہ
انسان کو رُلا دیتا ہے۔ اس دل کش انداز اور ہر دل عزیزی سے متاثر ہو کر "مسٹر گروس"

نے لکھا ہے کہ :۔

"ہندی بولنے والوں میں جو وقعت اور اہمیت راماین کو دی جاتی ہے وہ یورپ کے عیسائی شاید انجیل کو بھی نہیں دیتے۔"

(راماین از مہر دھلوی صفحہ ۶)

سیتا سوئمبر میں جب شری رام چندر جی دھنش توڑنے کے لئے اُٹھتے ہیں تو سیتا جی کی دلی تمناؤں کا آخری منظر تلسی داس جی کے الفاظ میں سُنیئے :۔

دیکھ دیکھ رگھوبیر تن سُر مناے دھری دھیر
بھرے بلوچن پریم جل پُل کا بلی شریر

देख देख रघुवीन तन् सुर मनाय धीर धीर ।
भरे बलोचन प्रेम का पुलका बली शरीर ॥

مطلب :۔ رام چندر جی کے چہرے پر نگاہیں جمی ہوئی ہیں۔ دل ہی دل میں دیوتاؤں سے دعائیں مانگ رہی ہیں۔ جذباتِ محبت آنکھوں میں آنسو بن کر اتر آئے ہیں اور (خوشی سے) تمام بدن کے روئیں کھڑے ہو گئے ہیں۔

بھُوشن کوی میدانِ جنگ کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ دیکھئے ایک ہی شعر ایک دیوان پر بھاری نظر آتا ہے ۔

بھُوشن یوں گھمسان بھو بھوتل گھیرت لوتھن مانو مسانو
اُونچے سُو چھج چھٹا اُچھٹی پرگٹ پربھا پربھات کی مانو

भूषन यों घमसान भो भूतल घेरत लोथन मानो मसानो ।
ऊँचे सूछज्ज छटा उचटी प्रगट प्रभा प्रभात कि मानो ॥

مطلب :۔ اے بھوشن، ایسی زبردست جنگ ہوئی کہ گویا لاشوں

نے قبرستان کا محاصرہ کر لیا ہے اور بلندی پر تلواریں اس طرح چمک رہی ہیں گویا اُفق سے صبح طلوع ہو رہی ہے۔

ان امثلہ سے صاف عیاں ہے کہ ہندی زبان مختلف اسالیبِ بیان سے مالامال ہے اور ہندی شاعر معمولی سے معمولی بات کو اس رنگ سے بیان کرتا ہے کہ اس میں ایک خاص بات پیدا ہو کر فوراً اثر انداز ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندی شاعری موثر ہے، اور اس کا ہر شعر تاثرات و وجدان کی زندہ تصویر ہے۔ اس موقع پر اساتذۂ اُردو کے تین شعر یاد آگئے جو واقعات کی کماحقہٗ تصویر آنکھوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں ؎

رہتا ہے اپنا عشق میں دل سے مشورہ — جس طرح آشنا سے کرے آشنا صلاح (ذوقؔ)

ظاہر ہے کہ عشق میں اور ہر ایک مشکل کے وقت انسان اپنے دل سے اسی طرح مشورہ کیا کرتا ہے۔ ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا!
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا — مومنؔ

جس سے رابطۂ اتحاد بڑھ جاتا ہے، اُس کا تصور تنہائی میں ہمیشہ پیشِ نظر رہتا ہے شاعر نے ایک حقیقی بات کا نقشہ کامیاب طرز پر کھینچا ہے ؎

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں — غالبؔ

دیکھئے اس شعر میں فطرتِ انساں کی کس قدر گہری اور پوشیدہ خاصیت کا پتہ دیا گیا ہے، جس کی اصلیت سے انکار ممکن نہیں۔ پھر لطف یہ کہ نزاکت و لطافتِ زبان کے ساتھ ساتھ ارفع و اعلیٰ تخیلات بھی موجود ہیں اور باوجود ملائم الفاظ ہونے کے جوش و اصلیت ہر جگہ نمایاں ہے۔

اہلِ نظر جانتے ہیں کہ جس کو محاکات میں جس قدر قدرت حاصل ہے اُس کا کلام اسی قدر ارفع و اعلیٰ اور موثر و مقبول ہے۔ اس قول کے پیشِ نظر ہندی اُدبا و شعراء کا منثور و منظوم کلام دیکھیں تو وہ محاکاتِ دل پذیر کا مجموعہ نظر آتا ہے۔ حیاتِ قلب

انسانی و تاثرات وواردات حسن و عشق اور مناظر و کیفیات فطرت کی صحیح مصوّری ہندی زبان میں بدرجۂ اتم موجود ہے، اس کی تصدیق کے لئے ذیل کی مثال ملاحظہ ہو۔ عورت میں کس قدر ضد اور ہٹ ہوتی ہے، اس کی صحیح ترجمانی ہندی کے حسن نواز شاعر بہاری کے یہاں دیکھئے ؂

वरजें दूनी हठ चढ़ें, ना सुकुचै न सकाई।
टूटत कटि दुमची मचक, लचकि लचकि बच जाई॥

برجیں دونی ہٹھ چڑھیں نہ سکچے نہ سکائی
ٹوٹت کٹی دُمچی مچک لچک لچک بچ جائی

مطلب :۔ (اس مستِ شبابِ حسینہ کا) بے کھٹکے جھولا جھولنے کا عالم قابلِ دید ہے۔ اس کو پینگ بڑھاتے وقت نہ تو بدن کھل جانے کی پروا ہے اور نہ اس بات کا ڈر ہے کہ جھٹکے سے کہیں اس کی نازک کمر نہ ٹوٹ جائے، سکھیاں اس کو منع کرتی ہیں تو اس سے اس کی ضد اور بھی بڑھ جاتی ہے (وہ نڈر ہوکر اور ضد میں آکر اور بھی خوب زور زور سے ہُمک ہُمک کر پینگ بڑھاتی ہے) اس سے اس کی شاخِ گل کی طرح نازک اور پتلی کمر ٹوٹتی ہوئی سی معلوم ہوتی ہے، لیکن لچک لچک کر رہ جاتی ہے (جس طرح لچکیلی چھڑی موڑنے پر بھی ٹوٹنے سے بچ جاتی ہے)۔

جن اصحاب نے بیر گھاٹ میں کسی کو جھولا جھولتے اور پینگ بڑھاتے دیکھا ہوگا وہ اس دوہے کا خاص لطف اٹھا سکتے ہیں۔ بہاری نے تو مصوّری کا حق ادا کر دیا ہے۔ (ماہنامہ نگار لکھنؤ کا ہندی شاعری نمبر جنوری ۱۹۳۶ء)

ڈاکٹر جعفر حسن ہندی زبان کی شیرینی و لطافت سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں :۔
"سچ پوچھئے تو جس طرح یورپ میں فرانسیسی اور اسلامی ممالک

ہیں فارسی شیریں زبانیں تسلیم کی جاتی ہیں اُسی طرح ہندوستان کی بیسیوں زبانوں اور بولیوں میں غالباً ہندی سب سے زیادہ دلنشین اور شوخ بھاشا ہے۔ ہندی نثر چاہے کیسی ہی ہو، مگر ہندی شاعری کے متعلق تو بلاخوف تردید یہ حکم لگایا جا سکتا ہے کہ وہ بہت دل گداز، پُر اثر اور لطیف ہے۔ الفاظ ہیں کچھ قدرتاً اس طرح کا لوچ ہے کہ معمولی کلام بھی مزیدار معلوم ہوتا ہے۔"

عبدالرحیم خان خاناں کی زبان سے محبوب کی آنکھوں کی تعریف سُنیے۔ آپ یقیناً جوشِ مسرت اور انداز دردسے پکار اُٹھیں گے کہ سبحان اللہ اس سے اچھی تعریف کسی اور زبان میں ملنی مشکل ہے۔

अमी हलाहल मद भरे स्वेत श्याम रतनार ।
जियत मरत झुक झुक परत जिह चितवत इक बार ॥

امی ہلاہل مدھ بھرے۔ سویت۔ شیام۔ رتنار
جیئت مرت جھک جھک پرت جیہ چتوت اک بار

(امی آبِ حیات۔ (ہلاہل) زہر۔ (مدھ) شراب۔ (سویت) سفید (رتنار) لال۔ (چتو) دیکھتی ہے۔

مطلب: "محبوب کی آنکھوں میں آبِ حیات۔ زہرِ قاتل اور بادۂ گلرنگ تینوں موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کا رنگ سفید بھی ہے، سیاہ بھی ہے اور اُس کے ساتھ لال ڈوروں کی جھلک بھی ہے۔ اُنھیں ایک نظر دیکھ کر ہی دیکھنے والا کبھی جی اُٹھتا ہے کبھی داعیٔ اجل کو لبیک کہتا ہے اور کبھی مستانہ وار گرتا پڑتا انداز مستی کو ظاہر کرتا ہے۔"

ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ تاثیرِ حسن اور لطف و تشریح مرتب کی پاکیزہ مثال اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے۔ نیز حسنِ خیال کا حسین و جمیل نمونہ اس سے بہتر اور کیا پیش کیا جا سکتا ہے۔

۲- دوسری بڑی خصوصیت: اس زبان میں یہ ہے کہ اردو، فارسی کی طرح امرد پرستی کا بازار گرم نہیں ہے، بلکہ اس کی عاشقانہ شاعری اقتضائے فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہے۔ اس میں مرد کا تخاطب عورت سے اور عورت کا مرد سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندی شاعری کے جذباتِ محبت میں بناوٹ یا تصنّع کو ذرہ برابر دخل نہیں، بلکہ ہر کام پر صداقت و حقیقت کی رعنائیاں جلوہ گر نظر آتی ہیں۔ کیوں کہ پاکیزہ جذبات کا وجود اسی صورت میں ممکن ہے، جب کہ اُن کی تخلیق میں اقتضائے فطرت سے جنگ نہ کی جائے۔ ہندی ادب کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زبان کے شعرا نے فطرتِ نسوانی کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اور کوئی دقیق سے دقیق نسوانی جذبہ بھی ایسا نہیں جس کو انھوں نے الفاظ میں ضبط نہ کر لیا ہو۔ دیکھیے ایک ہندی شاعر نے عورت کے جذباتِ محبت کی کس طرح صحیح ترجمانی کی ہے۔ ؎

साई सकारे जांयगे सो नैन मरेंगे रोय।
बिधना ऐसी रैन कर कि भोर कभू ना होय॥

سائیں سکارے جائینگے، سو نین مریں گے روئے
بدھنا ایسی رین کر، کہ بھور کبھو نہ ہوئے

(بدھنا) اے خدا۔ (بھور) صبح (رین) رات۔ (سائیں) خاوند۔ (سکارے) سویرے

عورت کہتی ہے کہ وہ صبح کو میرے پی جانے والے ہیں، اس لئے فرقت میں میری آنکھیں رو رو کر جس بدحالی کا نقشہ پیش کریں گی وہ ظاہر ہے اے خدا اس رات کو اس قدر لمبا کر دے کہ کبھی صبح ہی نہ ہو۔

سادگیِ تمنا کے علاوہ "اس بھور نہ ہوئے" کے ٹکڑے سے جس قدر محبت ٹپک رہی ہے اُس کے اظہار کے لیے ایک دفتر بھی ناکافی ہے۔ صرف اہلِ درد ہی اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اس پیڑ شیدا جی کی سادگی سونے پر سہاگہ ہو گئی ہے

ہندوستان کی تہذیب و تمدن کا تقاضا ہی یہ ہے کہ قدرتی طور پر عورت کے دل میں وہ تمام جذبات پیدا ہونے چاہئیں جو دوسرے ممالک میں مرد کے دل میں پیدا ہو سکتے ہیں اور اس قسم کے گرد و پیش میں بالکل فطری طریقہ پر مرد کی حیثیت ایک محبوب کی ہونی چاہئے، اور رشک و رقابت اور طلب و سجود کا جذبہ عورت میں پرورش پانا چاہئے۔ ہر عورت کو یہ کوشش کرنی چاہئے کہ جہاں تک ہو سکے وہ اپنے پیا کی نظروں میں زیادہ عزیز ہو یہی وجہ ہے کہ معشوقہ و محبوب کی بجائے ہندوستان کی تمرین میں پیا، پیتم، پریتم، رسیاں جیسے الفاظ مرد سے متعلق ہو کر عشقیہ شاعری کا مرکز بن گئے ہیں۔ شوہر کو دیوتا سمجھا گیا ہے۔ اور ہر بیوی کا یہ فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ ہر روز صبح اپنے سوامی کے قدم چھوئے۔ اس کے ماتھے پر سیندور کا ٹیکہ لگائے اور ایک بت کی طرح اس کے سامنے سجدے کرے۔ شوہر کی موت پر خود ستی ہو جائے، یا عمر بھر اس کے نام کی جپتی رہے۔ ایسے عالم میں اگر ہندی کا شاعر عشق و محبت کے تمام جذبات عورت کی جانب سے پیش کرتا ہے تو یہ عین فطرت ہے۔ اسی فطری جذبہ کے زیرِ اثر اردو کے پرستار شاہ حاتم نے شوقِ دیدار کا نقشہ یوں کھینچا ہے ؎

زندگی دردِ سر ہوئی حاتمؔ　　کب ملے گا مجھے پیا میرا

دیکھئے زندگیٔ ہجر کو دردِ سر سے تعبیر کر کے اشتیاقِ ملاقات کا اظہار کس لطیف انداز سے کیا ہے۔

جب کوئی شخص وارداتِ قلب کو بلا تصنع یا صنائع بدائع کی قید سے آزاد ہو کر بیان کرتا ہے تو ہم کہتے ہیں اس نے فطرت کی زبان اختیار کی۔ چوں کہ فطری بات دل سے نکلی ہوئی ہوتی ہے اس لئے اثر ہونا لازمات سے ہے چناں چہ ایک عورت اپنے شوہر کو پیغام بھیجتی ہوئی کہتی ہے

कर कांपत पत्तियां लिखत, जल भर आवत नैन।
कोरो कागज हाथ दे, मुख ही कहियो बैन॥

کر کانپت پتّیاں لکھت جل بھر آوت نین
کورو کاگج ہاتھ دے، مکھ ہی کہیو بین

(پتّیاں) خط۔ (جل) پانی۔ (نین) آنکھ۔ (کر) ہاتھ

عورت کہتی ہے کہ اگر خط لکھتی ہوں ہاتھ کانپتے ہیں اور آنکھوں سے آنسو نکلے پڑتے ہیں۔ اس لئے وہ سادہ کاغذ ہی قاصد کو دے کر کہتی ہے کہ اے قاصد! لے یہ کورا کاغذ ہی ہاتھ میں دے دینا اور میرا حالِ زار زبانی کہہ دینا۔

یہ دوہا اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ ہندی شعرا نفسیاتی جذبات کو خوب سمجھتے تھے۔ یہاں دو پہلو نکلتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایک سنگ دل اور خود غرض انسان کی محبوبہ اشتیاقِ ملاقات کے زیر اثر اپنے محبوب کو بلانے کے لئے اپنا حالِ زار بذریعہ تحریر قاصد کے ہاتھ روانہ کرنا چاہتی ہے لیکن جب لکھنے بیٹھتی ہے تو اس دل ایّامِ فراق کی ناقابلِ بیان مصائب و شدائد کو ضبطِ تحریر میں لاتے وقت اُمڈ آتا ہے۔ ہاتھ تھر تھرانے لگتے ہیں۔ آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔ اس عالم میں یاس و حرماں میں وہ سادہ کاغذ ہی نامہ بر کے حوالے کر کے کہتی ہے "مکھ ہی کہا بین"، میرا حالِ زار زبانی ہی بیان کر دینا۔

دوسرا پہلو جذبۂ عشق اور قوتِ خودداری کا ہے۔ ایک شریف اور خوددار عورت اپنے مصائب تحریری طور پر بیان کرنا خودداری کے منافی سمجھتی ہے جس کے باعث لکھتے وقت ہاتھ تھر تھراتے ہیں اور آنسو ٹپک پڑتے ہیں اور وہ سادہ کاغذ ہی پیامبر کے سپرد کر کے کہتی ہے زبانی طور پر میری زبوں حالی بیان کر دینا۔

دردِ فرقت کے اظہار کا اس سے زیادہ مؤثر طریقہ ممکن نہیں۔ یہ درد و اثر محض اس لیے پیدا ہوا کہ اس میں سب باتیں فطری ہیں۔ ایک نازنین جس کا شوہر پردیس میں ہے، بناؤ سنگار کر کے کوٹھے پر چاند دیکھنے چڑھی تو اس کی سہیلیوں نے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی کہ یہ بچپن کس کے لئے ہے۔ وہ جواب میں کہتی ہے

आज चन्द्रमा दूज है जग चितवत चहुं ओर।
हमरे ओर वामित्र के नैन भए इक ठोर॥

آج چندرما دُوج ہے جگ چِتوَت چہوں اور
ہمرے اَور وامتر کے نین بھئے اک ٹھور

(چِت وَت) دیکھ رہا ہے۔ (چہوں اور) چاروں طرف۔ (وامِتّر) میرا پیارا۔

مطلب۔ آج دُوج تھی ہے۔ آسمان پر چاند نکلنے والا ہے اور سب لوگ کوٹھوں پہ چاروں طرف چڑھے اُسے دیکھ رہے ہیں۔ گویا سارا عالم اُسے دیکھ رہا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ میرا پیارا بھی اُسے دیکھ رہا ہوگا، اسی واسطے میں چاند دیکھنے کے لئے بناؤ سنگار کر کے آئی ہوں کہ ممکن ہے میری اور میرے پیارے کی نگاہیں اس طرح آپس میں مل جائیں۔

شاعر کی نفسیاتی واقفیت۔ محبت کی انتہائی کیفیت، دردِ جُدائی اور وفورِ شوق کو کس خوبی سے شیر و شکر کر دیا گیا ہے۔ کتنی نزاکت اور کتنی ژرف نگاہی ہے کہ اِدھر سے محبوبہ کی نگاہیں چاند پر پڑتی ہیں اُدھر سے پیارے شوہر کی۔ اور دونوں نگاہوں میں اس طرح ملاقات کا لطف اُٹھایا جا رہا ہے گویا حقیقی طور پر طالب و مطلوب بالمشافہ کھڑے ہیں۔ یہی نفسیاتی آگاہی اور فطری آشنائی ہندی کو دوسری زبانوں پر ممتاز درجہ پر فائز کر رہی ہے۔ اور اس قسم کے جذبات سے پاک رکھتی ہے جہاں ترکِ تعلیم بچوں اور برہمن زادوں کی جناب میں داستانِ عشق دہرائی جاتی ہے۔ جہاں سبزۂ خط کی یاد میں ہجر کی راتیں کاٹی جاتی ہیں اور جہاں شاعری کا مدار محض ان خیالات پر ہے ؎

ہونے دیتے ہی نہیں ہیں آنکھ سے اوجھل اُسے
غصّہ آتا ہے مجھے صاحب کے باواجان پر

سیّد مسعود حسن رضوی اپنی تصنیف ”ہماری شاعری“ کے صفحہ پر لکھتے ہیں کہ:

"مثلاً اُردو، فارسی کے ہندی ادب نے ایشیائی حیا کے تقاضے سے معشوق کے چہرے پر رازداری کا نقاب ڈال کر کلام کو مقید نہیں کیا ہے، بلکہ اُسے اپنے حال پر چھوڑ دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ فطری جذبات بالکل نیچرل طور پر بیان ہوئے ہیں"۔

ہندی شاعری کے فطری طور پر دل کش و دل آویز ہونے کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ اس میں عموماً تخاطب حسنِ لطیف کی طرف سے ہوتا ہے اور یہ ایسی خصوصیت ہے کہ اگر اس کی تمام خوبیوں کو نظر انداز بھی کر دیا جائے، تو بھی دنیا کی تمام زبانوں کی شاعری پر اس کو امتیازی درجہ نصیب ہو جائے۔ ہندی کے ماہرین اس بات سے بہ حسنِ وجوہ شناسا ہیں کہ نفسیاتی مشاہدات میں ہندی شعرا کو کمال حاصل تھا۔ مرد اور عورت کا تو کیا ذکر ہے، بے زبان درندوں اور پرندوں کے احساسات کو اس خوبی سے بیان کرتے تھے کہ اگر اُن بے زبانوں میں طاقتِ گویائی ہوتی تو بھی وہ اس سے بہتر طریق پر بیان نہ کر سکتے۔ اسی قول کے پیشِ نظر کالی داس کی نسبت مشہور ہے کہ وہ جانوروں کی بولی جانتا تھا۔

۳۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ ہندی زبان بذاتِ خود بہت نرم واقع ہوئی ہے اور اس لحاظ سے تغزل کے لئے انتہائی موزوں اور مناسب ہے۔ کیوں کہ حسنِ تغزل کا تقاضا یہی ہے کہ زبان سادہ اور نرم ہو۔ "تاریخِ ہندی ادب" کے مصنف سیّد ظہیر الدین احمد علوی صفحہ ۱۳ پر فرماتے ہیں:

"ہندی زبان کی سب سے ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ طبقۂ عام و طبقۂ خاص کی ایک زبان ہے۔ لکھنے والوں نے اس میں گلکاریاں کی ہیں۔ رئیس المتغزلین سورداس کی غزلوں کی یہی زبان ہے۔ بعض جگہ جو سنسکرت کے ثقیل الفاظ آ گئے ہیں، وہ بالقصد کسی خاص اہتمام اور خاص ضرورت کے تحت میں لائے گئے ہیں"۔

ذیل کا دوہا پڑھئے اور بلند خیالی، شیرینیٔ الفاظ، سلاستِ زبان، ندرتِ تخیل

کے ساتھ ساتھ محبوبہ کی بے غرضانہ محبّت اور صادقانہ اخلاص کی داد دیجئے ۵

अपनी गरजन बोलियत कहा निहोरे तोये ।
तू प्यारा मुय जीव का मो जियु प्यारा मोये ।।

اپنی گرجن بولیت کہا نہورے توئے
تو پیارا مو یہ جیو کا مو جیئو پیارا موئے

(گرجن) غرض - (نہورے) احسان - (جیو) زندگی -

محبوبہ اپنے محب سے کہہ رہی ہے کہ میں جو تجھ سے بات چیت کرتی ہوں، یہ کوئی تجھ پر احسان نہیں ہے، بلکہ یہ سب کچھ میں اپنی ہی خاطر کرتی ہوں کیوں کہ تو میری زندگی کا پیارا ہے اور میری زندگی مجھے پیاری ہے -

کتنے میٹھے - کتنے پیارے - کتنے لطیف اور کتنے نرم الفاظ میں محبت کی صداقت کا اظہار مدلّل طور پر کیا گیا ہے -

۴ - چوتھی خصوصیت : اسلوبِ بیان ہے جسے شاعری کی روح سمجھنا چاہیے - ہندی کا شاعر معمولی سے معمولی بات کو اس نادر اسلوب سے بیان کرتا ہے کہ اس میں ایک خاص اور نمایاں وصف پیدا ہو کر طبیعت پر فوراً اثر انداز ہوتا ہے - اس فضیلت و خصوصیت کا بڑا راز ہندوستان کی تمدنی اور معاشرتی زندگی میں مضمر ہے - کیوں کہ جس زبان میں بھی عورت اپنے جذبات کا اظہار کرے گی، وہ بہت لطیف ہوگی - اول تو عورت کا عورت ہونا ہی اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ وہ معمولی سے معمولی گفتگو سے بھی عالم کو بے قرار بنا سکتی ہے - پھر ہندوستان کی عورت جس کی فطرت میں سچی وفا شعاری اور محبت پرستی ودیعت کی گئی ہے، جو اپنے شوہر کو ایک نعمتِ غیر مترقبہ سمجھتی ہے، جو شوہر کی موت پر اپنی جان کو قربان کرنا دھرم کی جان جانتی ہے ظاہر ہے کہ ایسی عورت جب اپنے دکھ کی کہانی اپنے فطری نرم و نازک لب

لہجہ میں سنائے گی تو وہ کتنی پُر اثر، عبرت خیز اور درد انگیز ہوگی۔ اس اثر کی ہمہ گیری دیکھیے کہ ہاشمی جو عادل شاہی زمانے کا ایک پُرانا شاعر ہے نے ہندی شاعری کے تتبّع میں عورت کو مرد کا عاشق قرار دے کر اظہارِ عشق کیا ہے۔ مثلاً ؎

رضا گر مجھ کوں دیتے ہو کروں گی گھر میں جا وارد
اگر چھ ہووے گی فرصت صبح پھر آوں گی چھوڑ و

(تاریخ ریختی صفحہ ۳)

ہاشمی کے دیوان میں جس قدر غزلیات ہیں اُن کا بیشتر حصہ ریختی میں ہے، اور اس میں عورت کا عشق مرد کے ساتھ ظاہر کیا گیا ہے۔ (اردوئے قدیم صفحہ ۹۱)

۵۔ **پانچویں خصوصیت** یہ ہے کہ ہندی زبان کی تشبیہات میں ایک خاص قسم کی نُدرت ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ مشبہ بہ ایسا تلاش کیا جاتا ہے جس میں وجہِ شَبہ ایک سے زیادہ موجود ہوں اور تشبیہات بھی ہمارے روزمرّہ مشاہدہ میں آنے والی چیزوں سے متعلق ہونے کے سبب نہایت سریع التاثیر اور دلچسپ ہوتی ہیں۔ اسی جادو نگاری کا نتیجہ ہے کہ ہندی شعرا معمولی سے معمولی بات کو تشبیہ کے پیرایہ میں لاجواب طریق سے اثر خیز بنا کر پیش کرتے ہیں۔ دوسری زبانوں کے بلند خیال شعرا اکثر ایسی دور از کار تشبیہات و نادر استعارات کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں جن کو فی الحقیقت محسوسات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور ... یہ بعید الانتقال الی الذہن ہوتے ہیں۔ حالاں کہ لُطفِ کلام اور فطرتِ انسانی کا تقاضا یہ ہے کہ تشبیہات و استعارات ایسے ہوں جن کو سُنتے ہی انسانی ذہن فوراً مشبہ بہ کی طرف منتقل ہو جائے۔ ہندی شاعری میں زیادہ تر انھیں تشبیہات و استعارات سے کام لیا جاتا ہے کہ جو ہمارے روزمرّہ کے محسوسات ہیں۔ مثلاً ؎

छपु छबेली मुख लसे नीले आंचल चीर।
मनु कलांध झिलमले कालिन्दी के नीर॥

چھپو چھبیلی مکھ لسے نیلے آنچل چیر
منو کلا ندھ جھلملے کالندی کے نیر

(کلاندھ) چاند۔ (کالندی) جمنا ندی۔

مطلب:- "نیلی ساڑھی کے آنچل کی اوٹ میں اُس کا مُنہ ایسا نظر آتا ہے جیسے جمنا ندی کے پانی میں چاند جھلملاتا ہو۔"

اس میں جھلملاتا ایک ایسا لفظ ہے جس سے شاعر کی قادرالکلامی اور رسائی ذہن نمایاں طور پر ظاہر ہو رہی ہے۔ جس طرح گھونگھٹ کی اوٹ میں چہرہ صاف نظر نہیں آتا بلکہ کپڑے کی بناوٹ سے کہیں کہیں اُس کی ضو نظر پڑتی ہے اسی طرح جمنا ندی میں بھی لہروں کی وجہ سے چاند کا عکس ایک جگہ قائم نظر نہیں آتا۔

(جذباتِ بھاشا از نیاز فتح پوری)

ذیل کے دوہے میں تشبیہ کی پُرکیف رعنائی دیکھئے ؎

उठ ठिक ठिक एतो कहा पादस के अभिसार ।
जान परेगी देखीयो दामिनी घन अंधियार ।।

اُٹھ ٹھک ٹھک ایتو کہا پاوس کے ابھسار
جان پرے گی دیکھیو دامنی گھن اندھیار

(ٹھک ٹھک) رُکاوٹ۔ (پاوس) برسات۔ (دامنی) بجلی۔ (ابھسار) اپنے پیا سے کو ملنے کے لئے جانا۔ (اندھیار) اندھیرا (گھن) بادل کا گہرا ہونا۔

اس دوہے میں ایک طویل داستان بیان کر کے تشبیہ کے جوہر دکھائے ہیں۔ ایک محبوبہ اپنے پی سے ملاقات کے لئے ترستی تھی۔ آخر برسات کے موسم میں اندھیری رات کے وقت اُس کی سہیلی نے ملاقات کا موقع نکالا اور اُسے ساتھ لے جانے کے لئے اُس کو بلانے آئی کہ چل اب ملنے کا موقع ہے۔ جب اُس نے یہ سُن کر چلنے کی تیاری کے لیے اس قسم کا لباس زیب بدن کرنے لگی جس سے اُسے کوئی

پہچان نہ سکے، اس پر دیر ہوتے دیکھ کر سہیلی بولی کہ بس اب اٹھو چلو بھی۔ برسات کے موسم میں اس قدر احتیاط کی ضرورت نہیں ہے، کیوں کہ اتفاق سے اگر تمھیں کوئی دیکھ بھی لے گا تو اس بارش اور گہرے اندھیرے میں یہی سمجھے گا کہ بجلی چمک گئی ہے، تمھاری موجودگی کا کسی کو شبہ بھی نہ ہوگا۔

ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ کتنی نادر اور اچھوتی اور دلچسپ تشبیہ ہے اور کتنے دیکھ شے اس ایک تشبیہ میں ہیں۔ بدن کی خوب صورتی، رنگت اور تڑپ (رفتار، اضطراب، نزاکت، نازک اندامی وغیرہ کے لحاظ سے جسم کو بجلی سے تشبیہ دی گئی ہے۔

٦۔ **چھٹی خصوصیت**: بعض حضرات اعتراض کرتے ہیں کہ ہندی شعرا کی لطافت و شیرینی سب رنگِ تغزل میں ختم ہو گئی اور عشق و عاشقی کے علاوہ ہندی میں کچھ نہیں، یہ اعتراض محض غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اگر ہندی ادب کا مطالعہ بہ نظر تعمق کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ ہندی زبان کی یہ خاص قابلِ ذکر اور اہم ترین خصوصیت ہے کہ ہندی شعراء نے عشقیہ مضامین کے علاوہ پند و موعظت، عرفان و تصوف، رفق و اخلاق اور منطق و فلسفہ کے دریا بہا دیے ہیں۔ ان کی تصانیف روایات کا ذخیرہ ہیں۔ یا تاریخی واقعات کا دفینہ۔ شاعری کے دل کش مذاق کے ساتھ ساتھ مذہبیات و سیاسیات اور طریق معاشرت سے بحث کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ دھرم۔ گیان۔ بھگتی یوگ۔ کرم یوگ۔ اُپاسنا یوگ۔ غرض کہ دُنیا و عقبیٰ دونوں کی بہتری کے سامان موجود ہیں۔

ورِند۔ تلسی داس۔ کبیر۔ رس کھان۔ رحیم۔ نانک وغیرہ کا کلام اخلاقی نکات اور جذباتِ عالیہ سے مالا مال نظر آتا ہے۔ ایک ایک مصرع میں وہ معیارِ کردار، اصولِ حیات اور دقیق اخلاقی مسائل حل کیے گئے ہیں کہ انسانی عقل حیران رہ جاتی ہے۔ ایک ایک لفظ آدمیت کی میزان اور فضائلِ اربعہ کی جان ہے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر صوفی شعرا نے حیات و موت۔ بیم و رجا، جسم و روح۔ وصالِ خدا، اور

حقیقتِ انسان کے فلسفیانہ مسائل کو بالتشریح حل کر کے دکھایا ہے۔ تلاش کیجئے تو آپ کو ہندی شعرا کے کلام میں نَو کے نَو رس ہی ملیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک ہر محفل میں ہندی شعرا کے اخلاقی و فلسفیانہ دوہے سُننے میں آتے ہیں۔
مثلاً تلسی داس ؎

सात स्वर्ग अपवर्ग सुख धरिय तुला इक अंग ।
तुलै न ताहि सकल मिल जो सुत्त लव सत संग ॥

سات سورگ آپ ورگ سکھ دھریئے تُلا اِک انگ
تُلے نہ تاہی سکل مل جو سُکھ لو ست سنگ

(سورگ) بہشت۔ (اَپ ورگ) بہت زیادہ غیر معمولی۔ اہم ترین۔ (تُلا) ترازو (لو) فائدہ۔ (انگ) مراد پلڑا ترازو کا۔ (ست سنگ) اچھی صحبت۔ عمدہ معاشرت نیک سوسائٹی۔

مطلب۔ اگر ساتوں بہشت کی اہم ترین خوشی کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھ کر تولا جائے تو اُس کا وزن اُس نفع کے برابر نہ ہوگا جو ہمیں نیک صحبت سے حاصل ہوتا ہے۔

عمرانیات کا یہ بنیادی اصول ہے کہ معاشرت ہی ہر قسم کی ترقی و تنزل کا ماخذ ہے۔ جب سماج میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے تو سلطنت کا نظام برہم ہو کر رہ جاتا ہے اور افراد میں افراتفری پھیل جاتی ہے۔ جوں جوں معاشرت سُدھرتی جاتی ہے۔ سیاسی و ملکی مشکلات خود بخود حل ہوتی جاتی ہیں۔ تلسی داس نے اس اصول کی تشریح کی ہے اور بتایا ہے کہ عمدہ معاشرت کثیر مال و زر اور اعلیٰ قانون سے کہیں بہتر ہے۔ کبیر جی ؎

तिनका कबहुं न निंदिये जो पायन तर होय ।
कबहूं उड़ि आंखिन परै पीर घनेरी होय ॥

تنکا کب ہُوں نہ نِندئے جو پاپَن تر ہوئے
کب ہُوں اُڑی آنکھن پڑے پیر گھنیرے ہوئے

(پائن، پاؤں - (گھنیری) زیادہ -

کبیر جی نے اس دوہے میں واضح کیا ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی اور نکمّی سے نکمّی چیز کو بھی حقیر نہیں جاننا چاہئے جیسا کہ اُس تنکے کو بھی حقیر نہ سمجھئے جو پاؤں کے نیچے دبا پڑا ہے۔ اتفاق سے کبھی اُڑ کر اگر وہ آنکھ میں پڑ جائے تو سخت تکلیف کا موجب بن جاتا ہے۔ ؎

समय समय सुन्दर सबै रूप करूप न कोय।
मन की रुची जित्ता जितै तित तित्ती रुचि होए॥

سمے سمے سُندر سبئے رُوپ کرُوپ نہ کوئے
من کی رُچی جتّا جتے تت تِتّی رُچّی ہوئے

یہاں ذوقِ نظر کی اہمیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ ہر ایک چیز اپنے اپنے وقت پر پیاری معلوم ہوتی ہے۔ خوب روئی یا زشت روئی فی الحقیقت کوئی چیز نہیں۔ دل کو جو کوئی جس قدر کشش کرتا ہے وہ اُسی قدر پیارا معلوم ہوتا ہے۔ غور کی جائے تو حسن و قبح، شیرینی و تلخی، شائستگی و ناملائمت سب اضافی اصطلاحیں معلوم ہوتی ہیں۔ قطعی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کی حقیقت کیا ہے۔ اخلاقیات کی طرح جمالیات کی جملہ اصطلاحیں سراسر اضافیت پر مبنی ہیں۔ قطعیت کا جمالیات میں نام تک نہیں۔ دراصل خوب صورتی یا بدصورتی۔ اچھی یا بُری کا فیصلہ مذاق پر موقوف ہے۔ رحیم فرماتے ہیں ؎

रहिमन पानी राखियो, बिन पानी सब सून।
पानी गये न ऊबरे, मोती मानस चून॥

رحمن پانی راکھیو۔ بن پانی سب سون
پانی گئے نہ اُوبرے موتی۔ مانس۔ چون

(پانی) = عزت۔ (مانس) = انسان۔ (چون) = چونا
رحیم نے یہاں پانی کا لفظ تین معنوں میں استعمال کر کے اپنی قادرالکلامی کا ثبوت دیا ہے۔ پانی بمعنی پانی۔ عزت۔ حمیت۔ یا غیرت۔
شاعر کہتا ہے کہ اے رحمن دنیا میں عزت سے گذر کر آنکھ کا پانی نہ مرنے دے۔ کیونکہ پانی کے بغیر موتی۔ انسان اور چونا اُبھرتا ہی نہیں یعنی موتی کے لئے رونق یا چمک یا تاب۔ انسان کے لیے غیرت اور چونے کے لئے آب کی ضرورت ہے۔

फ़रज़ीं शाह न हो सके, गत टेढ़ी तासीर।
रहिमन सीधी चाल सें, प्यादा होत वज़ीर॥

فرزیں شاہ نہ ہو سکے گت ٹیڑھی تاثیر
رحمن سیدھی چال سے پیادا ہوت وزیر

(فرزیں) = شطرنج کے ایک مہرے کا نام ہے جو بمنزلہ وزیر کے ہوتا ہے اور چال اس کی ٹیڑھی ہوتی ہے۔ (پیادہ) = شطرنج کا ایک مہرہ۔ (شاہ) = شطرنج کا ایک مہرہ۔ (وزیر) = شطرنج کا ایک مہرہ۔

اس دوہے میں شاعر نے راست بازی اور نیک چلنی کی تلقین ایک نادر اسلوب سے کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی ٹیڑھی چال کے اثر سے فرزیں شاہ نہیں ہو سکتا لیکن سیدھی چال چلنے سے پیادہ وزیر ہو جاتا ہے۔ شطرنج کے ماہرین اس دوہے پر فریفتہ ہو جائیں گے۔ گورونانک دیو جی ۵

नानक नन्हा हो रहो, जैसी नन्हीं दूब ।
सबै घास चर जांयगी दूब खूब की खूब ॥

نانک ننھا ہو رہو جیسی ننھی دُوب
سبے گھاس چر جائیں گی دُوب خُوب کی خُوب

(دُوب) گھاس

اس دوہے میں کبر و نخوت کی تذلیل اور فروتنی کی تلقین کی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے نانک دُنیا میں گھاس کی طرح زندگی بسر کر۔ مویشی ہر روز اگر اُسے کھاتے ہیں لیکن پھر بھی اُس کی جڑیں سلامت رہتی ہیں۔ واقعی دُنیا میں مغرور متکبر انسان کے مقابلے میں سیدھے سادے آدمی کو زیادہ سکون حاصل ہوتا ہے۔

دیکھئے عبدالرحیم خان خاناں ذیل کے دوہے میں کس عجیب انداز سے صبر و قناعت اور توکل و غنا کی تعلیم دے رہے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی ثابت کر رہے ہیں کہ دُنیا کتنی قدر خود غرض نا قابلِ اعتبار ہے سوائے ذاتِ باری تعالیٰ کے کسی پر تکیہ نہیں کرنا چاہئے۔

मांगे मुकुरि न को गयो, केहि न छाड़ियो साथ ।
मांगत मागे सुख लहो, ते रहीम रघुनाथ ॥

مانگے مُکر نہ کو گیو۔ کے ہی نہ چھاڑیو ساتھ
مانگت آگے سُکھ لہوتے رحیم رگھوناتھ

شاعر نے استفہامیہ انداز میں خود ہی سوال و جواب کے کرشمے دکھائے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مانگنے پر کون شخص انکار نہیں کرتا؟ بُرے وقت میں کون ساتھ نہیں چھوڑ دیتا؟ (یعنی مانگنے پر ہر کوئی انکار کر دیتا ہے اور مصیبت میں ہر کوئی ساتھ چھوڑ دیتا ہے) گویا دُنیا میں کوئی شخص کسی کے کام نہیں آتا لیکن وہ خدا ہی کی ذات ہے جو طلب کرنے سے خوش ہوتی ہے۔ سبحان اللہ! کس قدر

دل کش، دل آویز، دلچسپ اور دل نشین انداز ہے۔ مختصر مگر جامع الفاظ میں اہلِ دُنیا کی طوطا چشمی اور رازقِ حقیقی کی ذرّہ نوازی کا نقشہ قابلِ صد ہزار تحسین ہے۔

ذیل کے دوہے میں کبیر جی نے زندگی کا عمیق و دقیق مسئلہ محض دو عام ساد لفظوں (جایا اور آیا) میں سمجھا دیا ہے۔ ے

"जाया" "जाया" सब कहैं, "आया" कहै न कोय।
जाया नाम जन्म का, रहन कहां से होय॥

"جایا جایا" سب کہیں "آیا" کہے نہ کوئے
جایا نام جنم کا رہن کہاں سے ہوئے

مطلب۔ سنسکرت میں "جاتک" اور ہندی میں "جایا" بچّہ کے معنوں میں مستعمل ہے۔ کبیر جی اس "جایا" لفظ کو لے کر اپنی نکتہ پروری دکھاتے ہیں کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو سب لوگ جایا، جایا کہتے ہیں، مگر آیا کوئی نہیں کہتا، جب پیدائشی نام ہی جایا ٹھہرا، تو پھر اس دُنیا میں قیام کس طرح ہو سکتا ہے؟

قربان جائیے، اس معنی آفرینی اور نکتہ خیزی کے، کہ جس فلسفہ کو بڑے بڑے علماء و مشائخ ضخیم کتابوں کے ذریعے بھی نہ سمجھا سکے، کبیر جی نے روزمرّہ کے سیدھے سادے عام فہم جایا، اور آیا دو لفظوں میں حل کر دیا۔

۷۔ ساتویں خصوصیت۔ مندرجہ بالا خصوصیات کے علاوہ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ ہندی شعراء نے اپنے وطن کی چیزوں اور روزمرّہ کے محسوسات سے مضامین پیدا کئے ہیں۔ ایران۔ عرب۔ ترکستان وغیرہ کے مناظر سے کوئی واسطہ نہیں رکھا۔ ان کو اپنے وطن کی ہر شئے، ہر جانور۔ ہر شجر اور ہر حجر عزیز ہے۔ تشبیہات و استعارات میں ہندی شعراء نے کسی کی تقلید نہیں کی، نہ ان کے

اشعار میں نظر سے او جھل آسمان کی پیداوار کا ذکر ہے اور نہ اُن مہمل تعلقات کا ذکر جن سے فطرت مضطرب ہوتی ہے۔

مولانا ابوالمعانی خلیقی دہلوی "جذباتِ بھاشا" کی تقریب میں فرماتے ہیں۔ کہ "بھاشا کا شاعر ایرانی شعراء کی طرح کشمیر کے محسوسات و پیداوار کا دیوانہ نہیں اور نہ شعرائے عرب کی طرح ناقہ و ساربان کے پیچھے مارا مارا پھرنا اپنا شعار جانتا ہے۔ وہ بلبل و قمری سے مطلب نہیں رکھتا۔ وہ کوئل اور پپیہے سے کام رکھتا ہے، جن کی صدائیں جذبات کو برانگیختہ کرتی ہیں . . . ہندوستان والوں کے لیے وہی مرتبہ رکھتی ہیں جو ایرانیوں کے لئے بلبل کی نغمہ سرائیاں۔ پھر اردو شعراء کا محض تقلیداً ایک ایسی چیز کا ذکر کرنا جس کو انھوں نے کبھی دیکھا بھی نہیں کیسی ناموزوں بات ہے"

۸ - آٹھویں خصوصیت - ہندی شاعری کا بہت سا حصہ مذہبی ہے۔ بھگتی تحریک کی وجہ سے ہندی شاعری کو بہت تقویت ملی اور وہ بامِ عروج پر پہنچ گئی۔ گو اس میں رزمیہ شاعری کا بھی کافی حصہ ہے، لیکن وہ بھی کسی نہ کسی طرح مذہبی رنگ اختیار کر گیا ہے۔ دینیات کے علاوہ توہمات سے بھی ہندی زبان مالا مال ہے

۹ - نویں خصوصیت :- یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندی میں وہ شوخی اور رنگینی نہیں جو فارسی میں ہے۔ مگر سادگی ۔ لوچ ۔ الفاظ کی نزاکت اور طرزِ ادا جو ہندی میں ہے، دوسری زبانوں میں بہت کم ملتی ہے جبھی تو مولانا آزاد آبِ حیات میں کہہ گئے ہیں کہ :-

"سادگی، اظہار اور اصلیت کو اردو دان بھاشا سے سیکھیں"

ہندی کی نسبت یہ مقولہ مشہور ہے کہ :-

"ہندی زبان ایک ایسی شراب ہے جس کا رنگ اگرچہ تیز نہیں مگر نشہ دیرپا ہے" جیسے ؎

بِنتیم ہو مَیں جانتی پریت کیئے دُکھ ہوئے
نگر ڈھنڈورا پیٹتی پریت کرے نہ کوئے

میں جو اسلوبِ بیان ہے وہ ؎

اگر داغ از دردِ ازل داغِ جدائی را
نمی کردم بدل روشن چراغِ آشنائی را

میں شوکتِ الفاظ کے باوجود موجود نہیں۔ یا مثلاً ؎

نیناں ری تم ہی بُری تم سا بُرا نہ کوئے
آپ ہی پریت لگائے کے آپ ہی بیٹھی روئے

میں طالب کا جذبۂ بے قراری۔ اضطراب اور مجبوری جس قدر واضح ہے وہ ؎

از جگر آہ بر آمد جگر از دید چکید
این فسانۂ نگہِ ماست کہ بہ بام افتاد

میں نہیں ؎

آجا پیارے نین میں پلک ڈھانپ توہے لوں
نا میں دیکھوں اور کو نا توہے دیکھن دوں

سبحان اللہ! رشک و محبت کا نقشہ کس نادر انداز سے کھینچا گیا ہے فارسی میں بھی
اس قسم کا ایک شعر ہے ؎

غیرت از چشم برم رُوئے تو دیدن ندہم
گوش را نیز حدیثِ تو شنیدن ندہم

غرض کہ اس قسم کے کئی اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں۔ مگر یہ چیز موضوع سے
خارج ہے۔ یہاں فارسی اور ہندی کا مقابلہ مقصود نہیں اس لیے اس شعر پر یہ
بحث ختم کی جاتی ہے ؎

تُرا چناں کہ توئی ہر کسے کجا داند　　بقدرِ طاقت خود می کنند ادراک

ہندی اور اُردو

یہ غلط فہمی روز بروز زور پکڑتی جا رہی ہے کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے اور ہندی ہندوؤں کی۔ لیکن ماہرینِ ادبیات کی تحقیق و تلاش اس کے برعکس ہے اُردو کو فروغ دینے میں بڑا حصّہ ہندو جماعت کا ہے اور ہندی کو ترقی پذیر کرنے میں مسلمان حضرات پیش پیش نظر آتے ہیں۔ چنانچہ مندرجہ ذیل اقتباس اس قول کا بیّن ثبوت ہے۔

"اب اس سلسلہ میں یہ حیرت انگیز بات ڈاکٹر گلکرائسٹ کی وساطت سے ظہور پذیر ہوئی کہ پہلا ہیڈ منشی جو اُردو فارسی شعبے کا صدر مدرس تھا، وہ ایک بنگالی ہندو "ترنی چرن متر" تھا، جسے کالج کے قائم ہونے کے ایک ماہ بعد یعنی مئی ۱۸۰۰ء میں مقرر کیا گیا تھا، اور اسی طرح ہندی کی آسامی کے لیے میر بہادر علی ایک مسلمان کو ستمبر ۱۸۰۰ء میں تعینات کیا گیا۔"

(ہماری زبان علی گڑھ یکم فروری سنہ ۱۹۵۷ء صفحہ ۱)

فی الحقیقت یہ غلط فہمی ہماری تنگ نظری اور کم علمی پر مبنی ہے۔ غور کیجئے تو دونوں زبانوں کی اصل ایک ہے اور ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں۔ ہاں اگر دونوں میں فرق ہے تو نشو و نما اور طرز ارتقا میں ہے۔ اُردو میں عربی فارسی کے ثقیل الفاظ شامل ہو گئے ہیں اور ہندی سنسکرت کی طرف عود کر گئی ہے۔

ورنہ اُردو کی صرف و نحو۔ محاورات۔ ضرب الامثال اور کثرت سے ہندی الفاظ کا اُس میں استعمال ہونا اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ اس کی ابتدا ہندی سے ہوئی۔ چناں چہ مولانا آزاد فرماتے ہیں :۔

"اُردو کا درخت اگرچہ سنسکرت اور بھاشا کی زمین میں اُگا، مگر فارسی کی ہوا میں سرسبز ہوا ہے۔ البتہ مشکل یہ ہوئی کہ بیدل اور ناصر علی کا زمانہ قریب گزر چکا تھا اور اُن کے معتقد باقی تھے، وہ استعارہ اور تشبیہ کے لطف سے مست تھے، اس واسطے گو اُردو بھاشا میں استعارہ و تشبیہ کا رنگ بھی آیا اور بہت تیزی سے آیا، یہ رنگ اگر اس قدر ہوتا جتنا بھرے پر اُبٹنے کا رنگ، یا آنکھوں میں سرمہ! تو خوشنمائی اور بینائی دونوں کو مفید تھا، مگر افسوس کہ اس کی شدت نے ہماری قوتِ بیان کی آنکھوں کو سخت نقصان پہنچایا اور زبان کو خیالی باتوں سے فقط تو ہمات کا سوانگ بنا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بھاشا اور اردو میں زمین و آسمان کا فرق ہو گیا۔"

(آبِ حیات صفحہ ۵۲ - ۵۳)

اُردو کی ولادت، نیز اُردو اور ہندی کے باہمی تعلقات کے متعلق مندرجہ ذیل آرائے گرامی خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ سر سید احمد خاں صاحب "آثار الصنادید" کے خاتمہ میں لکھتے ہیں :۔

"اگرچہ بابر اور جہانگیر کے عہد تک ہندی بھاشا میں کچھ تغیر و تبدل نہیں ہوئی تھی۔ مسلمان اپنی گفتگو فارسی زبان میں اور ہنود اپنی گفتگو بھاشا میں کیا کرتے تھے۔ پھر جب بھی امیر خسرو نے خلجی بادشاہوں کے زمانے سے یعنی حضرت مسیح کی تیرھویں صدی میں فارسی زبان میں بھاشا کے لفظ ملانے شروع کیے تھے اور کچھ پہیلیاں اور مکرنیاں اور نسبتیں اس زبان میں کہی تھیں جن میں اکثر الفاظ بھاشا کے تھے۔

اغالب ہے کہ رفتہ رفتہ بھاشا میں جب ہی سے ملاپ شروع ہوا ہو، مگر ایسا نہ تھا جس کو جدا زبان کہا جائے"۔

اِسی کتاب میں سر سید احمد خاں دوسری جگہ فرماتے ہیں:

"جب شاہ جہاں بادشاہ نے ۵۸ سنہ ہجری مطابق ۱۶۴۸ سنہ عیسوی میں شہر "شاہ جہاں آباد" آباد کیا اور ہر ملک کے لوگوں کا مجمع ہوا، اُس زمانہ میں فارسی زبان اور ہندی بھاشا بہت مل گئی، اور بعضے فارسی لفظوں اور اکثر بھاشا کے لفظوں میں بسبب کثرتِ استعمال کے تغیّر و تبدّل ہو گئی۔ غرضیکہ لشکر بادشاہی اور اُردوئے معلّٰی میں ان دونوں زبانوں کی ترکیب سے نئی زبان پیدا ہو گئی، اور اسی سبب سے زبان کا اُردو نام ہوا، پھر کثرتِ استعمال سے لفظ زبان کا محذوف ہو کر اسی زبان کو اُردو کہنے لگے۔ رفتہ رفتہ اس زبان کی تہذیب اور آراستگی ہوتی گئی یہاں تک کہ تخمیناً سنہ ۱۱ ہجری مطابق ۱۶۸۸ سنہ عیسوی کے یعنی اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں شعر کہنا شروع ہوا۔"

(آثار الصنادید حصہ سوم صفحہ ۱۰۴-۱۰۵)

مولوی عبد الغفور نسّاخ نے رسالہ تحقیقِ زبانِ ریختہ تالیف ۱۲۷۵ سنہ ہجری میں لکھا ہے کہ:

"زبانِ اُردو روزمرہ شہرِ دہلی کو کہتے ہیں۔ اس شہر میں قدیم الایّام سے ہندی مروّج تھی، ہر شخص اسی زبان میں کلام کرتا تھا۔ جب ۵۸۸ سنہ ہجری میں سلطان معزّ الدین مشہور بہ شہاب الدین محمد غوری نے مُلکِ ہند پر چڑھائی کی۔ اہلِ ہند کو شکست دی۔ رائے پتھورا کا کام تمام کیا۔ تمام مُلک ہند سلاطینِ غور کے قبضۂ اختیار میں آیا رفتہ رفتہ زبانِ قدیم میں لفظ فارسی عربی و ترکی ملتا گیا۔ جب محمد شاہ بن تغلق شاہ سریر آرائے سلطنت ہوئے تو باشندگانِ دہلی

پھر بہ ایک تازہ ظلم کیا کہ اُن کو شہر میں رہنے نہ دیا۔ بلکہ گیہ معروف بہ دولت آباد بھیج دیا اور پھر قبل اپنی سلطنت کے زوال کے ان لوگوں کو دہلی میں بلا لیا گیا۔ اس نقل و حرکت کے سبب بہت سے الفاظ دکنی بھی زبانِ دہلی میں مل گئے۔ یہی اندازِ گفتگو آخر عہد جہانگیر بادشاہ تک رہا لیکن جب شاہ جہاں بادشاہ ہوئے تو انھوں نے ۱۰۵۸ھ ہجری میں شاہ جہاں آباد کو آباد کیا تو شاہ جہاں آباد میں اطراف و جوانب عالم سے ہر قسم کے ذی علم اور صاحب استعداد اور قابل لوگ جمع ہو گئے۔ قدیم ہندی متروک ہونے لگی، محاورے میں فرق ہونے لگا، اور زبانِ اُردو کی ترقی شروع ہوئی۔"

(رسالہ تحقیق زبانِ ریختہ صفحہ ۲۱۳)

میر امن دہلوی نے "باغ و بہار" تالیف ۱۲۱۵ھ ہجری کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ "جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے مُلکوں سے سب قوم قدر دانی اور فیض رسانی اس خاندانِ لاثانی کی سن کر حضور میں آکر جمع ہوئے۔ لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جُدی جُدی تھی، اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین، سودا سلف، سوال و جواب کرتے ایک زبان اُردو کی مقرر ہوئی۔"

(باغ و بہار، طبع لندن ۱۸۸۹ء)

مسٹر بیمس نے اپنی گریمر "کوم پیرے ٹو گرامر آف دی موڈرن آرین لنگویج آف انڈیا کے صفحہ ۱۵ پر لکھا ہے کہ:-

"فتح ہندوستان کے بعد عرصہ دراز تک مسلمانوں نے فارسی کو، اور ہندوؤں نے ہندی کو محفوظ رکھا۔ مسلمان مدت تک فصیح ہندی بولنے کے عادی تھے اور انھوں نے ہندی میں فارسی الفاظ کو نہیں ملایا تھا۔ اکبر (۹۶۳ تا ۱۰۱۴ ہجری) کے زمانہ میں جب راجہ ٹوڈر مل نے طریقِ مال گزاری

کو رواج دیا تو ہندو فارسی زبان سیکھنے پر مجبور ہوئے۔ اُس زمانہ
سے ہندی میں فارسی الفاظ کی آمیزش شروع ہوئی اور اس طرح
پر ایک جدید زبان اُردو کی بنیاد پڑی۔"

اُردو کے مشہور سرپرست ڈاکٹر جان گلکرائسٹ نے ہندوستانی فلالوجی
میں ایک مسلمان مورخ کی سند پر لکھا ہے کہ:

"جب تیمور (۷۷۱ ہجری تا ۸۰۷ ہجری) نے ہندوستان پر حملہ
کیا تو اُس وقت اُردو کی بنیاد قائم ہوئی۔"

مشہور مستشرق کولبروک کی رائے ہے کہ پندرھویں صدی عیسوی (نویں صدی
ہجری) کے اخیر ایام سے برج بھاشا میں تغیر شروع ہوا اور اُس نے ترقی پاکر ایک
جدید زبان کی صورت اختیار کرلی۔ (ایشیاٹک ریسرچز جلد اول صفحہ ۲۲۰)

ڈاکٹر ونیرنٹز (جس نے جرمن میں ادبیاتِ ہندوستان کی ایک ضخیم تاریخ لکھی
ہے) کا بیان ہے کہ:

"بارھویں صدی عیسوی یا چھٹی صدی ہجری میں جب مسلمانوں نے
ہندوستان پر تسلط حاصل کرلیا تو عربی۔ فارسی الفاظ برج بھاشا
میں ملنے لگے اور اس تغیر کے باعث سولھویں صدی عیسوی (گیارھویں
صدی ہجری) تک ایک نئی زبان پیدا ہوگئی۔"

(ماخوذ از اُردوئے قدیم)

حکیم سید شمس اللہ قادری ماہرِ علومِ آثارِ قدیمہ تحریر فرماتے ہیں:
"فاتحینِ اسلام بالعموم فارسی زبان بولتے تھے لیکن اُن کی فارسی
خالص فارسی نہ تھی بلکہ اُس میں عربی کے ہزاروں الفاظ شامل ہوگئے
تھے۔ ہندوستان کی زبانوں میں برج بھاشا (سوراسنی)، اگرچہ
دوآبہ (گنگا اور جمنا کے مابین کا علاقہ) کی زبان تھی لیکن پانچویں
صدی ہجری تک اس کو بے حد وسعت ہوگئی تھی۔ بہار سے نیلاب

اور بنیلاب سے مالیوہ تک بولی جاتی تھی اور اس اعتبار سے ملک کے اُس خطہ کی عام زبان تھی جہاں سب سے پہلے اسلامی حکومت قائم ہوئی مسلمان آباد ہوئے اور اسلامی تمدن نے نشو ونما پائی۔ مسلمانوں کے اثر سے برج بھاشا میں عربی فارسی الفاظ داخل ہونے لگے جس کے باعث اس میں تغیر شروع ہوا جو روز بروز بڑھتا گیا اور ایک عرصہ کے بعد اُردو زبان کی صورت اختیار کر لی۔"

(اُردوئے قدیم۔ صفحہ ۱۶-۱۷)

مولانا حکیم سید عبدالحئی صاحب مرحوم لکھتے ہیں کہ:۔

جہاں تک پہچان ہو سکی گئی ہے سب سے پہلے امیر خسرو نے جن کی طبیعت اختراع میں اعلیٰ درجہ صنعت و ایجاد کا رکھتی تھی ملکِ سخن میں برج بھاشا کی ترکیب سے انشا پردازی کا ایک طلسم خانہ کھولا۔ مدنی، انمل، دوسخنے، قسم قسم کے کبت اور پہیلیاں خاص اُن کے آئینہ کمال کا جوہر ہیں۔"

(گلِ رعنا۔ صفحہ ۶)

مولانا محمد حسین آزاد فرماتے ہیں کہ:

"اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اُردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے، اور برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے لیکن وہ ایسی زبان نہیں کہ دُنیا کے پردہ پر ہندوستان کے ساتھ ہی آئی ہو۔ اس کی عمر آٹھ سو برس سے زیادہ نہیں ہے، اور برج کا سبزہ زار اس کا وطن ہے۔"

(آبِ حیات صفحہ ۶)

"ظہیر الانشا" کے مصنف کا قول ہے کہ

"ہرگاہ سریر سلطنت از جہانگیر متجاوز شدہ نوبت بہ شاہ جہاں بادشاہ رسید۔ این جا کہ بسبب مصاحبت و معاشرت علمائے دین فی الجملہ خودداری و تشرع غالب بود۔ این زبانِ ریختہ معجونِ مرکب

بسبب آمد و رفتِ تاجرانِ سر دیار در بازار بضرورتِ خرید و فروخت معاملات داد و ستد ضروری الاستعمال شد تا زبانِ یکے بفہمِ دیگرے در آید۔" (منقول از جلوۂ خضر)

امام بخش صہبائی رسالہ قواعدِ اردو میں فرماتے ہیں کہ:۔

"شاہ جہاں آباد تیموریہ خاندان کے شاہجہاں نے آباد کیا۔ اس وقت فارسی کے بعض الفاظ اور ہندی کے اکثر لفظوں میں کثرتِ استعمال کے سبب تبدل و تغیر واقع ہوا، اور اس خلا ملا سے جو بولی مروج ہوئی اس کا نام اردو ٹھہرا۔" (ماخوذ از خزینۃ العلوم)

مندرجہ بالا آراءِ گرامی سے متفقہ طور پر دو باتیں اخذ ہوتی ہیں۔ پہلی یہ کہ اردو برج بھاشا سے نکلی۔ دوسری یہ کہ شاہ جہانی عہد میں اس کی ابتدا ہوئی۔ لیکن تحقیقاتِ حاضرہ ان امور کو قابلِ قبول نہیں سمجھتیں، کیوں کہ برج بھاشا اور اردو کی صرف و نحو، دوسرے خط و خال اور خصائص و اسالیب مختلف ہیں ۔ اردو جہاں اپنے اسماء و افعال کو الف پر ختم کرتی ہے۔ برج بھاشا واؤ پر۔ برج بھاشا میں جمع کا طریقہ بہت سادہ اور سہل ہے، لیکن اردو میں پیچیدہ ہے۔ اردو میں افعالِ مرکبہ اور اُن کے توابع کا بہت رواج ہے۔ برج بھاشا میں یہ بات موجود نہیں ہے۔

گریرسن نے اردو کو لسانی اعتبار سے مغربی ہندی کے علاقے میں شامل کیا ہے۔ مغربی ہندی پانچ شاخوں میں منقسم کی جا سکتی ہے۔ بانگرو۔ کھڑی بولی۔ برج بھاشا۔ قنوجی اور بندیلی۔

دہلی، میرٹھ اور اس کے گرد و نواح میں کھڑی بولی بولی جاتی تھی۔ مسلمان ترکی یا فارسی بولتے تھے۔ اس طرح کھڑی بولی میں باہمی تعلقات و ضروریات کی بنا پر ترکی اور فارسی الفاظ ملنے شروع ہوئے اور اس میل ملاپ سے اردو زبان یا ہندی ہندوی کے نام سے نمودار ہوئی۔ برج بھاشا ادبی زبان ہونے کے باعث صرف علما کی خاص

.... بولی تھی، اور عوام کھڑی بولی بولتے تھے، اس لئے مسلمانوں کی دلکشی کا موجب صرف کھڑی بولی رہی کیوں کہ یہ شورسینی پراکرت کی ایک اپ بھرنش بھاشا تھی۔

پروفیسر ڈاکٹر سدھیشور ورما کھڑی بولی کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ:

"ادبی اُردو اور ہندی کے اُس معیاری جزو جسے سب لوگ سمجھ سکیں کو کھڑی بولی کہتے ہیں۔" (آریائی زبانیں صفحہ ۳۷)

کھڑی بولی میں فارسی الفاظ کی آمیزش کے ساتھ سب سے ابتدائی فقرے اور چند اشعار مشہور درویش اور صوفی بابا فرید گنج شکر سے منسوب ہیں۔ جن کی ولادت ۱۱۷۳ء اور وفات ۱۲۶۵ء ہے۔ سیر الاولیا میں صوفی صاحب سے متعلق ایک واقعہ درج ہے جس میں شیخ جمال الدین ہانسوی کی بیوی "مادرِ مومناں" اپنے خورد سال بچے مولانا برہان الدین صوفی کو حضرت گنج شکر کی خدمت میں پیش کر کے کہتی ہیں کہ "خوجہ برہان الدین بالا ہے۔" یعنی کم عمر ہے۔

شیخ فریدالدین نے ہندوی زبان میں جواب دیتے ہوئے کہا کہ:

"مادرِ مومناں پونوں کا چاند بالا ہوتا ہے۔"

"جواہر فریدی" کے صفحہ ۲۷۵ پر ایک اور واقعہ درج ہے کہ:

"ایک دن شیخ فریدالدین اپنے پیر خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کو وضو کرا رہے تھے۔ شیخ صاحب کی آنکھ پر پٹی بندھی دیکھ کر خواجہ صاحب نے دریافت کیا کہ "بابا آنکھ پر پٹی کیوں باندھ رکھی ہے؟"

بابا فرید نے ہندی زبان میں جواب دیا کہ "آنکھ آئی ہے"۔

خواجہ صاحب نے جواب دیا کہ "اگر آئی ہے ایں راچرا بستہ اید؟"

اِن فقرات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوی زبان نویں صدی عیسوی ہی میں اپنے امتیازی خط و خال نمایاں کر چکی تھی۔ "ہوتا ہے" اور "آئی ہے"۔ برج زبان نہیں ہے بلکہ کھڑی بولی کہی جا سکتی ہے۔ اس اقتباس سے یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پنجاب سے

دہلی کی طرف آنے والے مسلمان ہندی زبان کے بہت سے الفاظ ساتھ لے آئے تھے۔

ڈاکٹر سدھیشور ورما" لکھتے ہیں کہ:

"پہلا مسلم جس نے ہندی میں کچھ لکھا مسعود ابنِ سعد تھا، جس کا انتقال ۱۱۲۳ء کے قریب ہوا۔ لیکن یہ ہندی مغربی اُپ بھرنش کی ایک شاخ تھی۔"

(آریائی زبانیں صفحہ ۱۲)

حافظ محمود شیرانی لکھتے ہیں کہ:

"جب ہم اُردو کے ڈول، اُس کی ساخت اور وضع قطع کو دیکھتے ہیں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا ڈھنگ اور ہے اور برج بھاشا کا رنگ اور ہے۔ دونوں کے قواعد و ضوابط اور اصول مختلف ہیں"۔

(پنجاب میں اُردو صفحہ ۲۷)

یہاں یہ امر بھی محتاجِ بیان ہے کہ اُردو کی ابتدائی صورت مختلف ناموں سے پکاری جاتی تھی۔ مثلاً ریختہ۔ زبانِ دہلوی۔ دکنی۔ گوجری۔ گجراتی۔ زبانِ ہندوستان ہندی یا ہندوی۔ ساتھ ہی ہندی زبان کی شاخوں میں بھی دکنی۔ گوجری اور گجراتی نام ملتے ہیں۔

"تذکرہ ریختہ گویان" از سید فتح علی حسینی الرضوی ۱۱۶۶ھ ہجری کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ریختہ کا اطلاق فی الحقیقت ایسے سرود پر ہوتا تھا جس میں ہندی اور فارسی اشعار یا مصرعے یا فقرے ہم مضمون۔ تال اور راگ کے اعتبار سے متحد ہوتے تھے ترتیب دے دیئے جاتے تھے۔ اس کی مثال امیر خسرو کی وہ غزل بتائی جا سکتی ہے جس کا مطلع ہے ؎

زحالِ مسکیں مکن تغافل دُرائے نیناں بنائے بتیاں
چو تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

شیخ سعدی دورِ اکبری میں ایک بزرگ ہوئے ہیں جن کو غلطی سے عوام نے شیخ سعدی شیرازی مان لیا ہے۔ ان کا ریختہ اکثر تذکرہ نویسوں نے نقل کیا ہے۔ ان کی ایک

غزل کا مقطع ملاحظہ ہو ؎

سعدی کہ گفتہ ریختہ در ریختہ در ریختہ
شیر و شکر آمیختہ ہم ریختہ ہم گیت ہے

یہ ریختہ ہندی موسیقی میں بھی موجود ہے۔ ہندی لغات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندی شعرائے فارسی بحور پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ مثلاً تلسی داس کا "شواشتک" اور "کمل نیتر" وغیرہ بحر رمل مثمن محذوف میں ہے۔ اِسی طرح مندرجہ ذیل ہندی نظم بھی بحرِ مضارع مثمن اخرب میں ہے ؎

سُن رے لیشو دھارانی نُولال کی بڈائی
سب لوک لاج وانے بہنا ہیں دھو بھائی

عربی۔ فارسی اور ہندی کی بعض بحریں متفق ہیں مثلاً بحرِ تقارب۔ بحرِ متدارک۔ اور بحرِ سریع تینوں زبانوں میں مستعمل ہیں بحرِ تقارب کو ہندی زبان میں "بھجنگ پریاتا" بحرِ متدارک "ستر بھنگہ" اور بحرِ سریع کو "چوپائی" کہتے ہیں۔

مولوی غلام علی آزاد بلگرامی نے ہندی کے علمِ بدیع وتشبیہات وغیرہ کو عربی و فارسی کا جامہ پہنایا ہے۔ اُن کی کتاب "غزالان الہند" فارسی زبان میں ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندی اور عربی فارسی میں بعض صنائع مشترک ہیں، جیسے ابہام، حُسن التعلیل، تجاہل العارفانہ، مراجعت۔ استعارہ، تشبیہہ، جناس، سجع۔

شیخ باجن جو ۹۱۲ھ میں فوت ہوئے، اپنی ایک نظم کے عنوان میں لکھتے ہیں۔ "صفتِ دُنیا بزبانِ دہلوی گفتہ"۔

اہالیٔ دکن نے اُردو کا نام "دکنی" رکھا۔ مثلاً شاہ ملک بیجاپوری احکام الصلوٰۃ "تالیف ۱۰۸۸ھ کے خاتمہ میں کہتے ہیں ؎

یو مسلیاں کو دکھنی کیا اس سبب
فہم کر کے دل میں کریں یاد سب

(پنجاب میں اُردو صفحہ ۲۳)

شاہ علی محمد جیو گاؤں دھنی کی تصنیف "جواہر اسرار اللہ" کی زبان کو اس کا مرتب شیخ حبیب اللہ قریشی الاحمدی "گوجری" کہتا ہے۔ چناں چہ دیباچہ میں لکھتا ہے:

"در بیانِ توحید و اسرار بالفاظ گوجری بطریقِ نظم فرمودہ دریں مختصر آوردہ وجمع کردہ"

محمد امین نے اپنی مثنوی "یوسف زلیخا" بعہد عالمگیر ۱۱۰۹ھ میں نظم کی ہے وہ اسکو گوجری زبان سے یاد کرتا ہے ؎

سنو مطلب اہے اب یو ایتیں کا
لکھی گوجری منے یوسف زلیخا

(پنجاب میں اُردو صفحہ ۲۳)

شیخ محمد خوب نے مثنوی "خوب ترنگ" ۹۸۶ھ میں لکھی ہے اور اپنی زبان کو گجراتی بولی سے پکارتا ہے ؎

جیوں دل عرب عجم کی بات
سن بول بولی گجرات

ملا وجہی اپنی کتاب "سب رس" تصنیف ۱۰۴۵ھ میں لکھتے ہیں:-

"در آغاز داستان زبانِ ہندوستان نقل ایک شہر تھا اس کا ناؤں سیستان"

اُردو کا سب سے قدیم نام ہندی یا ہندوی ہے۔ اس کی ایک پرانی مثال حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق متوفی ۹۰۲ھ ہجری کے رسالہ "خوش نغز" میں ملتی ہے۔ میراں جی فرماتے ہیں ؎

یہ ہندی بولوں سب	اس ارتوں کے سبب
یوں دیکھتا ہندی بول	پر معنے ہیں تپ تول

(پنجاب میں اُردو ۲۳)

حضرت بندہ گیسو دراز متوفی ۸۲۵ ہجری کے کلام کو "معراج العاشقین" میں دکنی

کا نام دیا گیا ہے اُن کا ایک قطعہ دیکھئے ؎

پانی میں نمک ڈال لیساں دیکھنا اسے	جب گُھل گیا نمک تو نمک بولنا کسے
یوں کھوئے خودی اپنی خدا ساتھ مصطفٰے	جب گُھل گئی خودی تو خدا بولنا کسے

غلام ہمدانی مصحفی نے جو اُردو شعرا کا تذکرہ لکھا ہے اُس کا نام ہی "تذکرۂ ہندی" رکھا ہے اس تذکرے کا مقدمہ لکھتے ہوئے مولوی عبدالحق صاحب لکھتے ہیں کہ:

"جہاں تک تحقیق ہوا ہے۔ اُردو شعرائیں مصحفی پہلے شخص ہیں جنھوں نے اُردو کا لفظ زبان کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔"

دوسری بات جو ہمیں اپنے تذکرہ نگاروں سے ملتی ہے یہ ہے کہ شاہ جہاں کے عہد میں اُردو کی بنیاد رکھی گئی، اس سے متعلق حافظ محمود شیرانی فرماتے ہیں:-

"یہ بیانات جو ہمارے تذکرہ نگار ایک دوسرے سے نقل کرتے آئے ہیں حقیقت سے بہت دُور ہیں۔ ہمیں ان کو صرف بزرگوں کے تبرک کے طور پر تسلیم کرنا چاہیئے ورنہ کیا اکبر اور شاہجہاں سے پیشتر دلّی نہ تھی؟ یا ہندو اور مسلمان نہ تھے؟ یا لوگ سودا سلف نہیں لیتے تھے؟ یا مختلف قومیں ایک جا رہ سہہ کر کاروبار کرنا نہیں جانتی تھیں؟ پھر اکبر یا شاہ جہاں کے عہد کے ساتھ کیا خصوصیت ہے کہ اُردو کی بنیاد رکھی جائے۔" (پنجاب میں اُردو)

حافظ صاحب کا ارشاد قابلِ داد اور لائقِ صاد ہے۔ کیوں کہ شاہجہاں آباد کی تیاری ۱۰۵۰ھ میں بتائی جاتی ہے، لیکن اس کے آباد ہونے سے بہت پہلے محمد افضل پانی پتی متوفی ۱۰۳۵ھ اپنا بارہ ماسہ اُردو میں تصنیف کرتے ہیں اور دکن میں ادبیاتِ اُردو کا سلسلہ اکبر کی تخت نشینی سے پچاس سال قبل شروع ہو جاتا ہے۔ اس سے بھی آگے بڑھئے تو اکبر بادشاہ کے دادا جان ظہیرالدین بابر اپنے ترکی دیوان میں مندرجہ ذیل ایک شعر ایسا لکھ جاتے ہیں جس کا ڈیڑھ مصرع اُردو ہے ؎

مجھ کا نہ ہُوا کچھ ہوس مانک و موتی	فقرا ہلیغہ بس بولغوسیدور پانی روٹی

اس موقع پر ماننا پڑے گا کہ اُردو کی داغ بیل اُسی دن سے پڑنی شروع ہو گئی ہے جس دن سے مسلمانوں نے ہندوستان میں آکر توطّن اختیار کر لیا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہند و مسلم تعلقات پرتھوی راج اور محمد غوری کی لڑائی سے کئی صدی پیشتر ابتدا پاتے ہیں۔

محمد بن قاسم ۱۲؁ھ میں سندھ پر چڑھائی کر کے راجہ داہر کو شکست دیتا ہے اور اسی سال ملتان بھی اسلامی قبضہ میں آجاتا ہے۔ گویا سندھ اور پنجاب میں ہندو مسلم اقوام سب سے پہلے ملتی جلتی ہیں۔ اس لئے انھیں ایک عام اور مشترک زبان کی ضرورت پیش آئی ہوگی۔ اس ضرورت کے ماتحت اُردو کو وجود میں آنا چاہیئے، اور یہی بین الاقوامی ضرورت کی بنا پر وجود میں آئی ہوئی زبان بعد میں ہندوستان کے مسلمانوں کی عام زبان بن گئی۔ چناں چہ چوتھی صدی ہجری کے سیاح "اصطخری" کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ملتان اور منصورہ کے باشندے فارسی اور سندھی دونوں زبانیں بولتے تھے۔ اُس دَور کے فارسی شعراء کا کلام پڑھیئے تو اس سے بھی ہندی اثرات کی شہادت ملتی ہے۔ مثلاً لفظ "بُت" جو بدھ کی بگڑی ہوئی شکل ہے یا کوتوال" جو ٹھیٹ ہندی یعنی "کوٹ والا" بمعنی مالکِ قلعہ تھا۔ شاہ نامہ فردوسی میں موجود ہے ؎

چو آگاہ شد کوتوالِ حصار　　بر آورد بجنت بارستم نامدار

کوتوال کی نسبت صاحب شرف نامہ فرماتے ہیں کہ:

"و از شیخ واحدی محقق است کہ لفظ ہندی است کہ بخراسان و فارس مشہور شدہ"

"ہیلاج" کی نسبت بھی صاحب شرف نامہ یوں رقم طراز ہیں:۔

"ایں لغتِ ہندی است کہ مستعمل در فارسی شدہ"

یہی صاحب لفظ "بیلک" کی تشریح یوں کرتے ہیں:۔

"بیلک"۔ تیر شکاری دو شاخہ این لغتِ ہندی است کہ مستعمل در فارسی است"

منوچہری کے یہاں لکھن یعنی لنگھن (روزۂ ہندواں) اور چندن (صندل) کا لفظ ملتا ہے۔ اسی طرح لفظ "شل" یعنی "سیس" یہی ہندی ہے اور فرخی کے یہاں ملتا ہے ؎

"بگونہ شل افغانیاں دو پرہ و تیز | چو دستہ دستہ بہم تیرہائے سوفار

"برشکال" ہندی کے لفظ "ورشا" یعنی "برسات کا موسم" سے ماخوذ ہے۔ اور یہ لفظ مسعود سعد سلمان کے یہاں موجود ہے ؎

برشکال اے بہارِ ہندوستان | اے نجات از بلائے تابستان

اِن امثلہ سے واضح ہوتا ہے کہ ہندی اور ایرانی تمدن کا سنگم سندھ اور ملتان میں غزنوی عہد سے بیشتر ہو چکا تھا۔ اس لئے یہ خیال کرنا کہ جب مسلمان پنجاب میں آباد ہے اُنھوں نے کسی ہندی زبان سے سروکار نہ رکھا اور جب پنجاب سے دلی گئے، تب برج بھاشا اختیار کی' ایک ناقابلِ قبول خیال ہے۔ خود غزنویوں نے اس سروکار کے زیرِ اثر ہندی زبان کی طرف خاص توجہ دی۔

محمود غزنوی کے دربار کا محقق "ابوریحان محمد البیرونی" عربی فارسی کے علاوہ ہندی اور سنسکرت کا بھی فاضل تھا۔ اس زمانے کا فارسی شاعر حکیم سنائی اپنے ایک شعر میں پانی کا لفظ باندھ گیا ہے۔ ؎

نہ در آں معدہ خدائے میدہ | نہ در آں دیدہ قطرۂ پانی

عثمان مختاری غزنوی اپنے شعر میں ہندی کے دو لفظ استعمال کر رہے ہیں ؎

زمیں بد بیدے بادے بجستہ گفتے چوں
مگس بد بیدے برمن نشستہ گفتے مار

اس شعر میں "چوں" اور "مار" دونوں ہندی لفظ ہیں۔

تاج الدین سنگ ریزہ (جو التمش ۶۳۳ھ کا مداح ہے) نے اپنے ایک شعر میں ہندی کے دو لفظ باندھے ہیں۔ ؎

خیز از پئے قدیم مرا سیر کن بر طل
بگذر ازیں حدیث کہ یک سیر و یک من است

"سیر" اور "من" دونوں لفظ ہندی ہیں۔

پنجاب اور سندھ کے علاوہ دکن کی طرف رجوع کریں تو پتہ چلتا ہے کہ وہاں چوتھی صدی ہجری سے مسلمان وارد ہونے شروع ہوئے اور انھوں نے عربی کے علاوہ ہندی اور گجراتی زبان میں شعر کہے۔ کتاب "عیون الاخبار" (جو سیدنا ادریس بن حسن متوفی ۸۷۲ھ کی تصنیف ہے) کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ شیعہ اسماعیلی مبلغین ۳۸۱ھ ہی سے تبلیغ اسلام کے لئے ہند میں آنے شروع ہوئے۔ علاوہ ازیں "مجالس المومنین" "راس مالا" کے گجراتی ترجمے "مرات احمدی"۔ "پریچنگ آف اسلام" ایسی کتابیں ہیں جن سے صاف طور پر عیاں ہے کہ خلیفۂ مصر امام "مستنصر باللہ" دکن میں اپنے مبلغ بھیجا کرتے تھے۔

اس کے علاوہ "داعی ادریس" اپنی تصنیف میں لکھتے ہیں کہ بنی فاطمہ کے خلیفہ" امام معزالدین اللہ" اپنے مبلغین ہسنا پور اور دہلی کی طرف بھیجا کرتے تھے ان کو "بوہرے" کہا جاتا تھا اور یہ اسماعیلی عقائد کی تبلیغ کرتے تھے۔ ان میں شیخ احمد۔ عبداللہ۔ نورالدین۔ شیخ آدم صفی الدین۔ اسماعیل بن عبدالرسول یوسف بن سلیمان۔ جلال۔ ہیبتہ اللہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کا کلام علمائے بوہرہ کی بیاضوں میں پوشیدہ ہے جس کے شائع ہونے پر قدیم ہندی بھاشا پر اچھی طرح روشنی پڑ سکتی ہے۔

ان امور سے واضح ہوتا ہے کہ ہندی اور اردو کا تعلق بہت پرانا ہے، اور دونوں کی اصل ایک ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اردو، ہندی کا مسئلہ طبقۂ متوسط کے ذوقِ تفنن اور رجعت پسندوں کی نوازشوں سے نہایت پیچیدہ بن گیا ہے۔ غور کی جائے تو اردو اور ہندی کے اس تنازعے کے دو پہلو کہے جا سکتے ہیں جن میں ایک پہلو تو خالص تعصباتِ سیاسی سے منوّر ہے، اور دوسرا پہلو قطعی علمی و ادبی ہے۔ بصورت اول اس مسئلے کا حل جہاں تک اس کا تعلق فرقہ پرستانہ تعصبات سے ہے جبھی ممکن ہے کہ عوام تعلیم یافتہ ہو کر اصلی واقعات کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ ان کو سمجھانے کے لئے صلح پسند۔ رواداد اور بالغ نظر

ادیبوں کو ادھر نظرِ کرم مبذول کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

اب رہا دوسرا پہلو۔ اگر ہمیں حقیقت میں اپنی مُلکی زبان (اُردو، ہندی، ہندوستانی) جو چاہو اس کو کہو، کو علمی زبان بنانا ہے تو ہمیں وہ تمام خامیاں دُور کرنی پڑیں گی جو محض ضد بلکہ جہالت سے آج تک ہم سے ظہور پذیر ہوئی ہیں۔ ادیبوں کو اس زبان کے متعلق (جس کے قواعد صرف و نحو ایک، جس کے پروان چڑھنے کے لئے مُلک ایک) اپنی طرزِ عمل بدلنی پڑے گی، اور ہمیں لازماً ایک مُلک کی زبان کا طالبِ علم بننا پڑے گا۔ ہمیں وہ تمام الفاظ جو مروّج پاکیزہ الفاظ کی جگہ جان بوجھ کر عربی اور سنسکرت سے ضدًا یا جہالت و تعصب کی بنا پر لئے گئے ہیں چھوڑنے ہوں گے۔

ہندی اور مسلمان

یہ ایک بے نقاب حقیقت ہے کہ اُردو ادب کی ترویج و ترقی میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کا بھی بہت بڑا حصہ ہے۔ لیکن ماہرینِ لسانیات اس بات پر متفق ہیں کہ ہندی ادب کی ابتدا و ارتقا میں مسلمانوں کی لسانی خدمات ہندوؤں سے بھی بازی لے گئی ہیں اور ہر گام پر رواداری۔ بلند نظری، فراخ دلی اور انسانی ہمدردی کا بیّن ثبوت پیش کر رہی ہیں۔ گو بعض تنگ نظر اور تنگ خیال حضرات اُردو کو مسلمانوں کی اور ہندی کو ہندوؤں کی زبان کہہ کر منافرت کی خلیج وسیع کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ لیکن حقیقت کو بے حجاب کیا جائے تو بلا خوفِ تردید کہنا پڑتا ہے کہ یہ مسلمان ہی ہیں جنھوں نے برادرانِ وطن سے بیشتر ہندی زبانوں کی تہذیب و ترقی پر توجہ دی ہے۔ اس مُلک کی شمال مغربی زبانوں یعنی پشتو، سندھی کشمیری اور پنجابی کا قریب قریب تمام ادبی سرمایہ مسلمانوں کی کوششوں کا ممنونِ احسان ہے بنگالی زبان اور اُس کے ادبیات کو فروغ دینے والے مسلمان ہیں۔ برج قنوجی اور اودھی کی ترقی میں مسلمانوں نے خاص حصہ لیا ہے۔

فاتحین کے علاوہ ہندی بھاشا کے پرچار کرنے میں ایک اور طبقہ کا ہاتھ بھی ہے جس کے افراد صلح کل تھے اور ہندوستان کے تمام باشندوں میں بغیر کسی بھید بھاؤ کے اپنا پیغام پہنچاتے تھے۔ یہ صوفیائے کرام تھے جنھوں نے عربی، فارسی اور

سنسکرت کے عالم ہوتے ہوئے بھی رائج الوقت عام فہم زبان اختیار کی کیوں کہ اُن کا یقین تھا کہ یہی وہ ذریعہ ہے، جس سے ہم انسانوں کے دلوں میں اخلاص و محبت کا جذبہ اُبھار سکتے ہیں۔ یہی سبب تھا کہ لوگوں نے اُن کے کلام کو سُنا، سمجھا اور اس پر عمل کیا۔ یہی طبقہ بعد میں مبلغین کے نام سے مشہور ہُوا۔ اِن مبلغین میں جہاں شیخ فرید الدین گنج شکر، حضرت نظام الدین اولیا، تلسی داس اور کبیر داس کی ادبی خدمات گنی جا سکتی ہیں۔ وہاں شیعہ اسماعیلی بوہروں کے مبلّغوں کی ادبی خدمات کو نظر انداز کر دینا بڑی بے انصافی ہو گی۔ جنھوں نے بھارت کی سرزمین کو اپنا وطن بنایا۔ اور لوگوں کو نیکی و راستی کا درس دیتے ہوئے علم و ادب کی اہم خدمات انجام دیں۔

بوہروں کی ایک کتاب "عیون الاخبار" (جس کا قلمی نسخہ حیدرآباد کے کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے) میں لکھا ہے کہ خلیفہ معز الدین اللہ (۳۴۱ھ تا ۳۶۵ ہجری) نے داعی حلم بن شیبان کو دہلی کی طرف روانہ کیا۔ جنھوں نے اپنی تبلیغ میں ہندی زبان کے الفاظ استعمال کئے۔ کتاب "مجالس سیفیہ" سے پتہ چلتا ہے کہ خلیفہ امام مستنصر باللہ نے ۴۲۷ھ میں میں ایک عالم شیخ احمد کو یمن سے ہندوستان بھیجا۔ شیخ احمد اس ملک کی زبان سے واقف نہ تھے، اس لئے کچھ عرصہ کھمبایت میں رہ کر ہندیوں کی بود و باش کو دیکھتے رہے۔ اتفاق سے ان کی ملاقات شاہی خاندان کے دو سپوتوں سے (جو آپس میں حقیقی بھائی تھے) ہوئی۔ اُن کا نام رام ناتھ اور روپ ناتھ تھا۔ شیخ احمد اُن کو اپنے ہمراہ مصر خلیفہ امام مستنصر باللہ کے دربار میں لے گئے جہاں شیخ نے ان کو کلمہ توحید پڑھایا تو امام نے رام ناتھ کا نام عبداللہ اور روپ ناتھ کا نام نورالدین رکھا۔ انھیں عربی کی تعلیم دی گئی اور عقائد اسماعیلی سکھائے گئے۔ جب دونوں علم دین میں فائق ہوئے تو امام نے دوبارہ شیخ احمد کے ہمراہ انھیں ہندوستان بھیجا تاکہ عقائد اسماعیلی کی تبلیغ کریں چوں کہ دونوں ہندوستان کی زبان سے کماحقہٗ واقف تھے، اس لئے ان کی تبلیغی زبان ایسی تھی جس کا بیشتر حصہ ہندی الفاظ پر مشتمل تھا۔ یہاں تک کہ بوہروں نے اپنی عربی تصانیف کو بھی ہندی نام سے موسوم کیا۔ چناں چہ ایک عالم نے جو داعی عبدالعلی سیف الدین کے قبل گزرے ہیں، اپنی عربی تصنیف کا نام "سلّہ ہنڈو" رکھا، علاوہ ازیں

ہندوستانی فرمارواؤں نے ہندی علوم و فنون کی اشاعت و ترقی میں کسی طرح کی فرقہ وارانہ تفریق یا جانب داری کو روا نہیں رکھا اور اہلِ کمال کی بلا لحاظ مذہب و ملت سرپرستی کی۔ سنسکرت اور ہندوستان کی دیگر زبانوں کو عام کر دیا۔ علم کا دروازہ ہر قوم کے لئے بلاتفریق مذہب و ملت کھول دیا۔

اس رواداری اور صلح کوشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی جو ایک غیر ملکی زبان تھی اُس کے ماہرین ہندو فضلا، ادبا اور شعرا کثرت سے پیدا ہو گئے۔ دوسری جانب مسلمان احباب نے وید۔ رامائن۔ مہابھارت۔ بھاگوت اور دوسری مذہبی کتابوں کی فراہمی اور حفاظت میں بڑی کوششیں کیں، اور بے شمار مذہبی و علمی کتب کا ترجمہ عربی و فارسی میں کیا۔ حضرت امیر خسرو۔ عبدالرحیم خانِ خاناں، ملا داؤد۔ ملک محمد جائسی وغیرہ نے ہندی ادب میں جو نمایاں مقام حاصل کیا، وہ اہلِ علم سے پوشیدہ نہیں۔ مسعود۔ قطب علی۔ اکرم فیض کبیر اور اُن کے لڑکے کمال نے ہندی کو درجہ کمال پر پہنچا دیا۔ جس کے لئے برملا کہنا پڑتا ہے کہ ہندی زبان کا عروج اور کمال مسلمانوں کا مرہونِ منت ہے۔

نہ صرف مسلمان حکمران بلکہ اُن کے وزرا۔ عہدہ دار۔ صوبہ دار اور اُمرا بھی جی کھول کر علوم و فنون کی سرپرستی کرتے تھے، اس کے لئے جاگیریں دیتے تھے۔ جائدادیں وقف کرتے تھے۔ ان کی دریا دلی نہ صرف ادب و زبان تک محدود تھی بلکہ موسیقی کو بھی خوب فروغ دیا۔ جس سے ہندی زبان کو اور بھی وسعت و ترقی نصیب ہوئی۔

عہدِ ناصر الدین محمود کا مشہور مورخ پنڈت چندر سین (المتوفی ۱۲۶۶ عیسوی) اپنی مشہور تصنیف منتخب التواریخ میں لکھتا ہے کہ:

"سلاطینِ اسلام کے عام درباروں میں اور اُن کے انتظامیہ محکموں میں ایک شودر کو بھی وہی اعزاز حاصل تھا جو اعلیٰ ذات کے ہندو کو حاصل تھا"

(منتخب التواریخ۔ صفحہ ۲۵۸)

شہنشاہ جہاں گیر کا درباری مورخ رتن لال (المتوفی ۱۶۲۷ء) اپنی مشہور تصنیف

تاریخ ہند میں لکھا ہے کہ

"مسلمانوں کی علم نوازی نے ہندوؤں کے بے جان قالب میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی تھی۔ پنڈت بھگوان داس، شری ہیت منوہر لال، پنڈت کشن چند، اور پنڈت ڈوگرمل گلشنِ علم کے وہ پھول تھے جنھوں نے مغل بادشاہوں کے دامن میں تربیت پائی تھی"

(تاریخ ہند۔ صفحہ ۶۴۸)

ڈاکٹر راجندر پرشاد مرحوم، سابق صدر جمہوریہ ہند نے ایک کتاب انگریزی میں "تقسیمِ ہند" لکھی ہے۔ اس کے ابتدائی حصے میں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی و علمی رواداری پر بھی تبصرہ کیا ہے، آپ فرماتے ہیں کہ

"بہت سے مسلمان حکمران علوم و فنون کے سرپرست رہے ہیں جنھوں نے نہ صرف فارسی و عربی زبان کو فروغ دیا، بلکہ سنسکرت زبان، اور ہندوستان کے لٹریچر اور سائنس کی بھی سرپرستی کی۔ انھوں نے ہندوستان میں علوم و فنون کو جو ترقی دی اس کو یہاں مختصراً بھی لکھنا ممکن نہیں۔ شاہانہ سرپرستی میں خود سنسکرت کی کتابوں کا ترجمہ اس غرض سے کیا کہ ہندوؤں کے علوم کے خزانے مسلمانوں تک پہنچ جائیں۔ انھوں نے دوسروں کو اس زبان کی تحصیل کی ترغیب دی۔ ہندو طلبا کے تعلیمی نصاب میں سنسکرت زبان بھی شامل تھی۔ غرض سنسکرت زبان کی سرپرستی ہر ممکن طریق سے کی گئی"

ڈاکٹر صاحب موصوف اسی کتاب میں دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ:

"ہندی کی طرف سے لڑنے والوں کو یہ بات یاد رکھنی چاہیئے اور کسی وقت بھی مسلمانوں کے اس احسان سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہیئے جو ہندی زبان اور ہندی ادب کو ترقی دینے کی صورت میں انھوں نے امیر خسرو سے لے کر آج تک کیا ہے"

مسٹر این سی مہتہ آئی سی۔ایس صوبہ متحدہ اپنی کتاب (گلنڈی بیوشن آف اسلام ٹو انڈین کلچر) میں لکھتے ہیں کہ:۔

"مسلمان بادشاہ اکثر علم نواز تھے۔ سنسکرت کے چند مقبول شہ کار بالخصوص قصص عربوں ہی کی وساطت سے بیرونی دُنیا تک پہنچے۔ سیاسی اقتدار کے دوش بدوش عربوں کی زبان بھی کسبِ علوم کا بین الاقوامی ذریعہ بن گئی۔ ہندوستان کے پاس سرمایۂ علم موجود تھا، وہ عربی مصنفین کی کاوش سے مہذب دنیا کو دستیاب ہُوا۔ ہندی ادبیات اور علوم میں اُنھوں نے جو اضافہ کیا وہ ایک جداگانہ چیز ہے۔ مسلمان بادشاہوں کے فیض سے رامائن، مہابھارت اور پوران عوام تک پہنچے۔"

ڈاکٹر تاراچند اپنی کتاب (انفلوئینس آف اسلام ان انڈین کلچر) میں فرماتے ہیں کہ:۔

"مسلمانوں کی خدمات صرف اُردو یا ہندی ہی کو ترقی دینے تک محدود نہیں رہی ہیں، بلکہ دوسری صوبائی زبانوں کی بھی بہت کچھ مدد کی گئی ہے۔ شمال میں ہندی۔ جنوب میں مراٹھی۔ پورب میں بنگالی زبانیں محض بول چال کی زبان سے ترقی کر کے ادبی زبانیں بن گئی ہیں اور اس ترقی میں مسلمانوں کا کافی حصہ ہے۔"

ڈاکٹر بینی پرشاد اپنی کتاب (ہسٹری آف جہانگیر) میں لکھتے ہیں۔ کہ

"فارسی مورخوں نے ایسے اہل علم کی طویل فہرست دی ہے جو مغل حکمرانوں کی سرپرستی میں افلاس سے نکل کر دولت و حشمت کی زندگی بسر کرنے لگے تھے۔ اس عہد کے فارسی اور ہندی شعرا کے تذکروں کے مطالعہ سے حیرت ہوتی ہے کہ شعرا کی کتنی بڑی تعداد دربار کی ضیافتوں سے مستفید ہوتی تھی۔"

"کوتا کومدی" کے مصنف نے اپنے دیباچہ میں لکھا ہے کہ:۔

"ہندی کے جتنے بڑے بڑے شاعر ہوئے ہیں سب اسی زمانے میں گزرے ہیں جب مسلمانوں کا آفتاب حکومت نصف النہار تھا ہندی اسی زمانے میں

ایسی پھولی اور پھلی کہ ہم آج تک اُس کی خوشبو اور ذائقہ سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔"

بنگال کا ایک صاحبِ قلم "راج کمار سنہا" اخبار "ہندوستان اسٹینڈرڈ" کے سنڈے ایڈیشن میں لکھتا ہے۔ کہ

"شاید بہت تھوڑے لوگ اس حقیقت سے آگاہ ہوں گے کہ ہندوؤں کا کلاسیکل ادب یورپ کی سوسائٹیوں میں فارسی زبان میں پہنچا اور مسلم فرماں رواؤں نے اپنی سرپرستی اور نگرانی میں ہندو شاستروں کا ترجمہ کرایا اور بعضوں نے خود کیا اور انھیں یورپ تک پہنچایا۔"

مہاتما گاندھی اپنے اخبار "ہریجن سیوک" بابت ۲۳ جون ۱۹۳۶ء میں فرماتے ہیں کہ:

"اگلے زمانے میں مسلمان ہندی سیکھتے تھے اور اُسے ایک ادبی زبان کی حیثیت دینے میں انھوں نے اپنے ہندو بھائیوں سے زیادہ نہیں تو اُتنی ہی کوشش کی ہے۔"

مسٹر مکندی لال بار ایٹ لا نے رسالہ "سرسوتی" میں ایک مضمون شائع کرایا، جس میں وہ لکھتے ہیں کہ

"ہندوستانی لٹریچر کی ترقی بھی مسلمانوں کے عہد میں خوب ہوئی۔ البیرونی نے جو احسان دُنیا اور ہندوستانی لٹریچر پر کیا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ مسلم دورِ حکومت میں سنسکرت زبان میں قومی اور مذہبی لٹریچر کی بہت ترقی ہوئی۔ ہندی زبان کی تعلیم و ترقی بھی اسلامی عہدِ حکومت ہی میں ہوئی۔"

جناب رمیش چندر سین بی۔ اے "تاریخ ادبیاتِ بنگال" میں لکھتے ہیں کہ وہ بنگالی زبان کے ادبی پایہ تک ترقی کرنے کے متعدد اسباب ہیں، ان میں سب سے بیش بیش بادشاہ مسلمانوں کی فتح بنگال ہے، اگر ہندو راجہ بدستور سابق مختار اور حکمراں رہتے تو بنگالی زبان کے لئے دربار تک

رسائی حاصل کرنا ایک دشوار امر تھا۔ ان پٹھانوں نے تیرھویں صدی عیسوی میں بنگال کو تسخیر کر لیا۔ ان کے سلاطین نے بنگالی زبان سیکھی اور اپنی کثیر التعداد ہندو رعایا کے ساتھ جن پر حکمرانی کرنے کے لئے وہ آئے تھے قریبی تعلقات قائم کر لئے۔ جب ان سلاطین نے سنسکرت کے مشہور رزمیوں رامائن اور مہابھارت کا نام سنا جو ہندوؤں کی مذہبی اور معاشرتی زندگی کی تشکیل میں عجیب و غریب اثر رکھتے تھے، تو قدرتاً ان کو شوق ہوا کہ ان نظموں کے موضوع سے آگاہی حاصل کریں۔ انھوں نے چند عالموں کو بنگالی زبان میں ان کے ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ جس زبان کو وہ اب بولتے اور جانتے تھے۔ مہابھارت کا بنگالی ترجمہ ناصر شاہ والئ گوڑ کے حکم سے ہوا۔"

(ادبیات بنگال صفحہ ۱۰ و ۱۱)

جب بنگالی زبان کے ادبیات کا سنگ بنیاد مسلمانوں کے ہاتھ سے رکھا جاتا ہے تو یقین کرنا چاہئے کہ دوسرے علاقوں میں جو اہل اسلام کے زیر نگیں تھے، انھوں نے دیسی زبانوں کی ترویج و ترقی میں ضرور حصہ لیا ہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ بھاشا کے میدان میں مسلمان شعرا کے نام ہندو شعرا سے مقدم ہیں۔ ہندی شعرا زیادہ تر دسویں صدی ہجری میں پیدا ہوتے ہیں لیکن مسلمانوں میں ہندی شعرا کے سرتاج خواجہ مسعود سعد سلمان (المتوفی ۵۱۵ھ ہجری) ہیں بار ہا سب سے پیشتر انھیں نے لکھا ہے۔ مشائخ و صوفیائے کرام نے سب سے پیشتر دہلی و پنجاب میں ہندی کی سرپرستی کی ہے۔ ان اہل اللہ میں ہم بعض مشہور بزرگوں کے نام دیکھتے ہیں۔ مثلاً شیخ فریدالدین مسعود متوفی سنہ ۶۶۴ ہجری۔ شیخ نظام الدین اولیا متوفی سنہ ۷۲۵ھ امیر خسرو متوفی سنہ ۷۲۲ھ۔ شیخ شرف الدین بوعلی قلندر پانی پتی متوفی سنہ ۷۲۴ھ وغیرہ۔

بوعلی شاہ قلندر نے شیخ نظام الدین اولیا سے ہندی دوہوں میں مشاعرات کئے ہیں۔

اس جماعت نے ہندی موسیقی کی تہذیب و ترقی میں بھی بڑا حصہ لیا ہے۔ جہاں وہ فارسی موسیقی، قوالی و ترانہ کے دلدادہ تھے، وہاں ہندی موسیقی سے بھی ان کی خانقاہیں خالی نہیں تھیں۔ وہ سنسکرت تک کے نغمات سے بہرہ اندوز ہونے کے عادی تھے۔ شیخ

بہاءالدین ذکریا ملتانی متوفی ۶۶۶ھ اس فن میں مہارتِ کامل رکھتے تھے۔ مُلتانی دھناسری انھیں کی ایجاد ہے۔ امیر خسرو نے فارسی اور ہندی موسیقی کو پیوند دیا۔ سلطان حسین شاہ جون پوری متوفی ۹۰۵ھ نے سترہ راگ ایجاد کئے۔ نائک بخشو نے بہادری راگ۔ نائکی کلیان اور نائکی کانہڑا وضع کئے۔ درباری کانہڑا میاں تان سین کی ایجاد ہے۔
شیخ عطاء اللہ الملقب بہ شیخ رتن فنِ موسیقی میں ممتاز پایہ رکھتے تھے۔ شیخ بہاءالدین برناوی متوفی ۱۰۳۸ھ اس فن میں کامل و اکمل تھے۔ یہ ساز خیال اور ساز کھڑی کے موجد ہیں۔
ابراہیم عادل شاہ متوفی ۱۰۳۵ھ فنِ موسیقی میں نائکی کا درجہ رکھتا تھا۔ باز بہادر والیٔ مالوہ اس فن میں بے نظیر مانا گیا تھا۔ انتہا یہ کہ فنِ موسیقی پر جس قدر نفیس کتابیں لکھی گئی ہیں وہ اکثر مسلمان مصنفین نے لکھی ہیں۔ بنگالی میں اس فن کی تمام تصنیفات مسلمان دماغوں کا نتیجہ ہیں۔

رسالہ "آج کل" دہلی کا موسیقی نمبر ماہ اگست ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا تھا اس میں ڈاکٹر وسنتی ہٹا ٹکر" اپنے مضمون (ہندوستانی موسیقی کا ارتقا) میں یوں رقم طراز ہیں کہ:-
"مسلمانوں کی آمد اور اُن کے ساتھ میل جول سے شمالی ہند کی موسیقی پر اثر پڑنا قدرتی بات تھی۔ علاءُ الدین خلجی سے محمد شاہ تک قریب قریب اورنگ زیب کو چھوڑ کر ہر ایک فرماں روا کو موسیقی سے حقیقی لگاؤ تھا۔ شغل و تفریح کی خواہش نے انھیں موسیقی کے بہترین سرپرست بنا دیا اس طرح موسیقی نے مندروں اور معبدوں میں پوجا پاٹ کے ذریعے کی صورت میں اپنی ہستی برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ درباروں میں بھی رسائی حاصل کرلی اور اس پر فرماں رواؤں کے پُر احساس رجحانات و میلانات کا گہرا اثر پڑا۔
امیر خسرو نے ہندوستانی موسیقی کے ڈھانچے میں ایرانی نغمات کو شامل کیا اور ستار و طبلہ جیسے ساز ایجاد کئے۔ قوالی کے چلنت بولوں اور جزئیات سے "خیال" وجود میں آیا۔ مندروں کی دھرپد سے "درباری" یعنی شاہی درباروں کی دھرپد کی تخلیق عمل میں آئی۔ اکبر کا عہد دھرپد کے انتہائی عروج کا زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ سوامی ہری داس اور میاں تان سین

جیسے زندۂ جاوید استاد بنیادی طور پر دھرپدی کے سنگیت کار تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تخلیقی تخیل کے اس امتزاج کی بدولت ہندوستانی موسیقی میں خوش سلوب تان پلٹوں اور استنوادیسموا سُروں کا زیادہ سے زیادہ استعمال ہونے لگا۔

نواب واجد علی شاہ والیٔ لکھنؤ کے دربار میں دو سہل تر اور نسبتاً زیادہ جذباتی چیزیں ٹھمری اور دادرا ایجاد کی گئیں۔

پنجاب میں ایک صاحب جو ہر فن کار غلام نبی، جو بعد میں "شوری میاں" کے نام سے مشہور ہوئے، نے ٹھمری کی ایک نرم و نازک علاقائی شکل یعنی "ٹپہ" ایجاد کیا۔ اسی طرح شمالی ہند میں ہندی موسیقی نے شاہی سرپرستی میں ترقی کی۔

مسلمان بادشاہوں کو ہندی موسیقی نے اس قدر والا و شیدا کر لیا کہ ہر بادشاہ اور ہر نواب نے اسے دل کھول کر نوازا۔ فن کاروں کو جاگیریں اور انعامات دیئے۔ والیان ریاست نے بھی موسیقاروں کو اپنے اپنے دربار میں جگہ دی۔ جے پور کے دربار میں رجب علی خاں بین کار مہاراجہ کے اُستاد تھے اور "بہرام خاں" موسیقی کے زبردست عالم تھے۔

نواب یوسف علی خان بہادر مرحوم والیٔ رام پور کے دربار میں روشن خاں ڈاگر، بہادر خاں، باسط خاں رُبابیے نبیرۂ میاں تان سین اور صادق علی خاں گوئیے موجود تھے۔ اور نواب کلب علی خاں بہادر مرحوم کے عہد میں بہادر حسین خاں بہادر خاں کے شاگرد امیر خاں۔ عنایت خاں۔ رحیم اللہ خاں۔ عظیم اللہ خاں۔ قطب بخش گوئیے۔ میاں حیدر شاہ الغوزہ نواز نیز اور بہت سے ماہرین فن حاضر دربار رہتے تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ ہر دو امیر خود بھی اس فن میں بے نظیر تھے۔

علاوہ ازیں محمد حسین خاں مرحوم۔ وزیر خاں مرحوم نبی بخش خاں بین کار مرحوم۔ عنایت حسین خاں، نذیر حسین خاں گوئیے۔ فدا حسین خاں سرودیئے، بندہ خاں سارنگی نواز حفیظ خاں۔ کریم خاں ستار نواز۔ بندہ دین۔ محمد علی خاں رُبابیئے صاحب زادہ حیدر علی خاں۔ صاحب زادہ سعادت علی خاں۔ سید سجاد حسین سوز خواں ٹھاکر نواب علی خاں وغیرہ کا تعلق بھی

دربارِ رام پور سے تھا۔

ہندوستان کے علاوہ دوسرے اسلامی ممالک پر بھی ہندی موسیقی اثر پذیر رہی اور اپنی ہمہ گیری کے سبب افغانستان کے رستے دربارِ ایران تک پہنچی، جس کو حکما نے اپنی آغوشِ شوق میں لے کر فنونِ حکمت کا ایک حصہ بنا لیا اور اس کی تکمیل میں کوشاں رہے شیخ الرئیس بوعلی سینا نے "قرنا" اور "شہنائی" ایجاد کی۔ پھر یہ رنگین تحفہ یونان اور یورپ تک پہنچا۔ ان فن کاروں میں بہت سے حضرات برج بھاشا کے شاعر تھے اور بیشتر سنسکرت کے عالم تھے۔ الغرض مسلمانوں نے جہاں ہندی شعروادب کو مدارجِ ارتقا پر پہنچایا، وہاں ہندی موسیقی کو بھی کمال عطا فرمایا۔

چناں چہ موجودہ گئے گزرے دور میں بھی مسلمان برابر ہندی موسیقی کی خدمت بجا لا رہے ہیں۔ مثلاً نواب مرزا صاحب قدر پیا مرحوم۔ بندہ دین مہاراج۔ مینے خاں، میاں فضل حسین۔ میاں علی جان۔ ماسٹر راحت حسین راحت۔ حیدر جان۔ للن پیا۔ اعظم پیا۔ فیاض خاں ولایت حسین خاں شفق اکبرآبادی۔ درس۔ اُستاد حافظ علی خاں۔ امراؤ۔ استاد صادق علی خاں۔ معزالدین۔ ملکہ جان۔ زہرہ جان۔ اُستاد عبدالکریم۔ نذرالاسلام تصدق۔ اسد۔ اُستاد اللہ دئے خاں مرحوم۔ اُستاد عظمت حسین خاں۔ مے کش مرحوم اکبرآبادی۔ ظہور خاں صاحب۔ رام داس جناب میکش صاحب کے سگے نانا تھے۔ آپ بہت بڑے ماہرِ موسیقی ہونے کے علاوہ سنسکرت کے پنڈت، ہندی کے شاستری اردو فارسی کے منتہی اور ان زبانوں کے صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ موسیقی میں رام داس اور اردو فارسی میں ممکن تخلص فرماتے تھے۔ اسی طرح بیجو باورا نہایت مشہور نائک اور کامل گائک ہوئے ہیں۔ آپ میاں "تان سین" کے ہمعصر تھے۔ یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ مسلمان علمائے موسیقی یا اُستادانِ فنِ موسیقی ہر قسم کے مذہبی تعصبات اور فرقہ وارانہ تنگ نظری سے بالکل پاک اور مبرّا تھے۔ ان میں اکثر متقی اور پرہیزگار صوم وصلوٰۃ کے پابند اور اسلامی طریقِ عبادت کے حامل ہوتے ہوئے بھی ہندوانہ مذہبی رسومات یہاں تک کہ مورتی پوجا میں یقین ہی نہیں رکھتے تھے بلکہ اس پر عمل کرنے سے بھی گریزاں نہ تھے

اور یہ سلسلہ متقدمین علمائے موسیقی تک ہی محدود نہیں، بلکہ ہمارے زمانے تک جاری ہے، اور اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ عظیم ماہرِ موسیقی اُستاد علاء الدین خاں صاحب کا انتقال حال ہی میں ہوا ہے۔ موصوف اپنی ریاست کے راج گورو تھے۔ نہایت متقی و پرہیزگار تھے اور باقاعدگی سے مندر جایا کرتے تھے، ان کے ایک صاحب زادے نے جوانی میں سنیاس لے کر فقیرانہ زندگی اختیار کر لی تھی۔

جہاں تک ان بزرگوں کی موسیقانہ تخلیقات کا تعلق ہے اُن کے مطالعہ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ کسی مسلمان کی شعری تخلیق ہیں۔ مندرجہ بالا موسیقاروں کے علاوہ حاجی سُبحان خاں نائک بخشو۔ بیجو نایک۔ میاں رمضان خاں۔ تان رس خاں۔ میاں اچپل۔ امراؤ خاں۔ میاں نعمت خاں سدا رنگ۔ میاں من رنگ۔ احمد۔ ابراہیم خاں۔ اُستاد حاجی الطاف حسین خاں۔ ولایت حسین خاں۔ چاند خاں۔ سورج خاں۔ حضرت محمد غوث گوالیاری۔ ان بزرگوں کے حالات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ موسیقی قومی یکجہتی کے لئے ایسی مثال ہے جیسے جسم انسانی میں روح۔

ہندی ادب کے ضمن میں ہندی موسیقی کی داستان ضرور طول پکڑ گئی لیکن یہ نتیجہ بھی ضرور اخذ ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے آریہ ورت سے رشتہ جُڑتے ہی ہندی کی طرف دھیان دینا شروع کر دیا تھا۔ خود غزنویوں نے شروع ہی سے ہندی زبان کی طرف توجہ دی تھی، ابوالعلا المعرّی نے اپنے رسالہ" الغفران میں لکھا ہے کہ محمود کے زمانے میں غزنی کے اندر محلّے کے محلّے ہندو آبادی کے تھے اور انھیں اپنے مذہبی مراسم ادا کرنے کی پوری آزادی حاصل تھی محمود غزنوی خود بڑا عالم اور اہلِ علم کا قدردان تھا۔ چناں چہ عنصری و فردوسی ایسے باکمال شعراء۔ ابوریحان محمد بن احمد البیرونی ایسے ریاضی دان۔ جوتشی اور سنسکرت زبان کے قادر الکلام مصنّف (جس نے ہندوؤں کے مذہب۔ فلسفہ اور تمدّن کا خود مطالعہ کیا اور اس باب میں کتابیں لکھیں، نیز کئی دوسری سنسکرت کتابوں کا ترجمہ کیا۔) عتبی ایسے مورّخ اس کے دربار کی زینت اور اس علم دوستی و علم پروری کی زندہ مثالیں ہیں۔

تاریخ فرشتہ کے بیان کے مطابق محمود کے دربار میں اہلِ کمال کا اس قدر مجمع تھا کہ ہندوستان میں کسی بادشاہ کے زمانے میں نہیں ہوا۔

۱۰۲۳ء مطابق ۴۱۳ھ ہجری میں گوالیار کے راجہ نندا نے محمود کی اطاعت قبول کرنے کے بعد ہندی میں ایک مدحیہ نظم لکھ کر سلطان محمود کی خدمت میں پیش کی۔ محمود کو نظم کا ترجمہ سُنایا گیا وہ اس قدر خوش ہوا کہ پندرہ قلعے جن میں کالنجر کا قلعہ بھی شامل تھا راجہ نندا کو عطا کیے۔ ہندی کا حیرت خیز اثر دیکھیے کہ فارسی کا مشہور شاعر حکیم سنائی متوفی ۵۲۷ھ جب ہندوستان آیا تو اپنے فارسی اشعار میں ہندی لفظ استعمال کر گیا۔ مثلاً ؎

نہ در آں معدہ غدہ میدہ

نہ در آں دیدہ قطرۂ پانی

عثمان مختاری غزنوی ہندوستان آئے تو اپنے فارسی اشعار میں ہندی الفاظ باندھنے لگے۔ (پنجاب میں اُردو۔ صفحہ ۳۷)

متقدمین و متاخرین متفقہ طور پر کہتے ہیں کہ خواجہ مسعود سلمان ہندی میں بھی صاحبِ دیوان تھے۔

محمود کے بیٹے شہاب الدین مسعود نے بھی بہت سی سنسکرت اور ہندی کتابوں کے ترجمے کرائے۔ اسی طرح بہرام بن مسعود کے زمانے میں بھی سنسکرت کتابوں کا علمی ذخیرہ عربی و فارسی میں منتقل ہوا۔

غلامان خاندان کے بادشاہ شمس الدین التمش کی فراخ دلی کا یہ عالم تھا کہ اس نے اپنے سکوں پر ناگری رسمِ خط میں بھی اپنا نام لکھوایا اور شوجی کے بیل کی تصویر بھی اُن پر نقش کرائی۔

غیاث الدین بلبن کا دربار علماء و فضلاء کا مرکز تھا۔ امیر خسرو، حضرت شیخ گنج شکر، خواجہ حسن، شیخ عثمان، شیخ صدرالدین، شیخ بہاء الدین ذکریا ملتانی اسی دربار کی زینت تھے جو فارسی اور عربی کے علاوہ ہندی اور سنسکرت سے بھی بہرہ اندوز رہے۔ یہاں یہ بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ امیر خسرو نے لمبی عمر پائی۔ اُن کا تعلق

پانچ بادشاہوں سے رہا۔ غیاث الدین بلبن۔ شہزادہ بغرہ قرہ خاں۔ جلال الدین خلجی علاء الدین خلجی اور غیاث الدین تغلق۔ سلطان نصیر الدین بادشاہ ہوتے ہوئے بھی فقیرانہ اور منکسرانہ زندگی گزارتے تھے۔ شہزادہ محمد اپنے محل میں امیر خسرو کی زیرِ صدارت ادبی مباحث جاری رکھتا تھا۔ سلطان جلال الدین خلجی کے حالات مکمل ادبی تھے۔ سلطان علاء الدین خلجی کے خزانے سے ہندی کے باوا آدم امیر خسرو کو ایک ہزار تنکہ ماہ بماہ ملتا تھا۔ علاء الدین نے مختلف علوم کی کتابیں جمع کر رکھی تھیں۔ اس زمانے کا مشہور ہندی شاعر کیدار تھا۔ علاء الدین اس کی بہت قدر کرتا تھا۔

غیاث الدین تغلق کے زمانے میں بادشاہ کی ہنر پروری سے امیر خسرو زیادہ فارغ البال رہے۔ امیر خسرو نے "تغلق نامہ" بادشاہ کے نام سے معنون کیا۔

ناصر الدین والئی لکھنوتی متوفی سنہ ۸۶۴ھ نے بنگالی میں مہابھارت کا ترجمہ کرایا۔ اسی صدی ہجری میں فیروز شاہ خلجی متوفی سنہ ۹۰ھ نے سنسکرت سے بعض کتابیں کرائیں۔ سلطان زین العابدین والئی کشمیر متوفی سنہ ۸۷۵ھ کئی زبانوں میں ماہر تھا۔ ایک طرف اُس نے مہابھارت اور راج ترنگنی کا ترجمہ کرایا، دوسری طرف فارسی و عربی کتب کا ترجمہ کشمیری زبان میں کرایا۔

ودیاپتی ہندی شاعر غیاث الدین والئی بنگالہ کا مداح تھا۔ ہندی زبان کی سرپرستی میں علاء الدین حسین شاہ والئی بنگال متوفی سنہ ۹۳۵ھ کا دربار ہندی اور بنگالی شعراء سے آباد تھا۔ قطبن نے اپنی تصنیف "مرگاوتی" سنہ ۹۰۹ھ میں اسی بادشاہ کے نام پر معنون کی ہے۔ اسی کے حکم سے "مالادھر واسو" ساکن کلنگ رام نے بھاگوت کا ترجمہ بنگالی زبان میں کیا، جس کے عوض بادشاہ نے شاعر کو "گن راج" کا خطاب دیا۔ اسی حسین شاہ کے سپہ سالار "پرگل خاں" کے حکم سے گوبند پرمیشور نے مہابھارت کا دوسرا ترجمہ بنگالی زبان میں شروع کیا۔ ترجمہ ابھی نامکمل تھا کہ اُس کا انتقال ہوگیا۔ اُس کے فرزند چھوٹے خاں نے "سری کرنانندی" سے یہ ترجمہ مکمل کرایا۔

قاضی محمود گجراتی متوفی ۹۲۰ھ ہندی کے زبردست شاعر تھے۔ ملک محمد جائسی نے شیر شاہ سوری کے نام پر "پدماوت" لکھی۔ شیخ دانیال چشتی نویں صدی ہجری میں ہندی کے اعلیٰ شاعر گزرے ہیں۔ شیخ عثمان غازی پوری نے چتراولی کا عشقیہ افسانہ لکھا۔

فیروز شاہ تغلق کی علم دوستی کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جب اُس نے نگر کوٹ فتح کیا تو وہاں کے مندر سے تیرہ صد قدیم کتب سنسکرت کی ملیں۔ اُس نے انتخاب کر کے متعدد کتابوں کا ترجمہ فارسی میں کرایا۔ انھیں کتابوں میں "بارہ سنگھت" کا ترجمہ، مولانا اعزالدین تھانیسری نے فارسی میں کیا۔

عروض اور فنِ موسیقی کی کتابیں بھی سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کی گئیں۔ کتاب "چشمۂ کوثر" میں علامہ شیرانی لکھتے ہیں، کہ

> "فیروز شاہ کے دور کا یہ امر آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ ہندی زبان میں مثنوی بھی لکھی گئی۔ مولانا داؤد نے کتاب "چنداین" جو لورک اور چندا کا عشقیہ افسانہ ہے۔ تاشہ خان جہان خلعت وزیر خان جہان کے نام پر لکھی۔"

فیروز شاہ نے ایک اہم تزئین کام یہ بھی سرانجام دیا کہ میرٹھ اور خضر آباد کے قریب سے دو سنگین مینار اُکھڑوا کر کوشک شکار میں نصب کرائے۔ ہر چند یہ مینار ہندو مذہب سے تعلق رکھتے تھے، لیکن اُس نے مصارفِ کثیرہ سے اپنی دارالحکومت میں منتقل کرائے۔

محمد تغلق بہت سے علوم والسنہ کے علاوہ ہندی زبان کا بھی ماہر تھا۔ اُس نے اپنی ایک قیام گاہ کا نام "سرگ دواری" یا "سرگ دوار" رکھا تھا۔ یہ ادیب لبیب ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھا۔

سکندر لودھی ۱۴۸۸ء سے ۱۵۱۷ء تک حکمران رہا ہے، اُس کے عہد میں کبیر صاحب کی بھگتی کی تحریک زوروں پر تھی۔ اس کے حکم سے فنِ طب سے متعلق سنسکرت

کی مشہور کتاب "دھر کرم مہا دیدک" کا ترجمہ "طب سکندری" کے نام سے فارسی زبان میں کیا گیا۔ اس کے درباری شعراء میں ایک برہمن بھی تھا جو غیر مسلم ہونے کے باوجود علوم مروجہ کی کتابوں کا درس دیتا تھا۔

فیروز شاہ بہمنی ہندی کا قدردان اور زبردست فاضل تھا۔ محمود شاہ بہمنی خود ہندی میں شعر کہتا تھا۔

عادل شاہ نے اپنے دربار میں ہندی شعراء ادبا، اور مصنفین کو پناہ دے رکھی تھی۔ اس نے حکومت کے حساب کو فارسی میں رکھنے کی بجائے ہندی میں رکھنے کی اجازت دی۔ اس کام کے لیئے برہمن مقرر کیئے جن کا بہت اثر حکومت پر تھا۔

(دیکھیئے اکبری دربار کے ہندی کوی صفحہ ۲۳)

یوسف عادل شاہ نے محکمہ مال میں ہندو افسر مقرر کیے۔

لودھیوں کے بعد مغلوں کا دورِ حکومت آیا جو جملہ علوم مروجہ کے ساتھ ساتھ ہندی ادب کی ارتقاء و افزائش کے لیے خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ ہندی ادب کے ضمن میں مغلوں کا نام تا ابد درخشاں رہے گا۔ بہ الفاظِ دیگر مغلیہ دور ہندی ادب کے شباب کا دور تھا۔ بادشاہوں نے نہ صرف ہندی شاعروں کی قدردانی میں خزانوں کے منہ کھول دیئے تھے، بلکہ خود بھی فکرِ سخن میں مستغرق رہتے تھے، چناں چہ بابر کو ہندی زبان سے اتنا پیار ہو گیا کہ اس نے ہندی میں شعر کہنا چاہا۔ چناں چہ ملاحظہ ہو ؎

مجکا ہُوا نہ کچھ ہوس مانک موتی
فقرا بلیغو بس بولفو سیدپانی دوتی

یہ شعر تزکِ بابری میں موجود ہے جس کا نسخہ رام پور کے کتب خانہ کی زینت ہے۔ اس کتاب میں جامن۔ پنکھا وغیرہ کئی الفاظ بلا تکلف ترکی میں ملا دئے گئے ہیں۔ ادبی تذکروں سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کے دربار میں ہندی شاعر موجود تھے۔ چناں چہ بابر کے ہاتھ سے جب ابراہیم لودھی مارا گیا تو اس کے ایک درباری کوی نے یوں کہا تھا ؎

نوسے اوپر تھا بتیس   پانی پت میں بھارت دیسا
اَکٹسی رجب شکروارا   بابر جیتا ابراہیم ہارا

(دیکھیے ہسٹری آف پرشین لنگویج اینڈ دی لٹریچر ایٹ دی مغل کورٹ صفحہ ۱۶)

"بابر نے ہندی سیکھی ضرور تھی اور اُس میں شعر بھی کہے تھے لیکن اُسے عمر نے دغا دی اور پوری طرح کامیاب نہ ہو سکا"

(مغل بادشاہوں کی ہندی صفحہ ۲ و ۳)

بابر نامہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بابر نے اپنے ادب نواز ساتھیوں کے ساتھ ناؤ پر بیٹھ کر ہندوی اشعار کہتے ہوئے اُن سے لطف حاصل کیا ہے۔

(دیکھئے اکبری دربار کے ہندی کوی صفحہ ۲)

ہمایوں عمر بھر مصائب و شدائد کا شکار رہا، اس پر بھی اُس نے ہندی شعرا کی قدر دانی، سرفرازی اور عزت افزائی کا سلسلہ جاری رکھا۔

تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ ہمایوں کے دربار میں علماء و شعراء کے علاوہ جیوتشی لوگ بھی وظیفہ پاتے تھے۔ ہمایوں خود بھی جیوتشی تھا۔ اس سلسلہ میں اُس نے چھیم بندیجن کو خوب نوازا ہے۔

"ہمایوں کے دربار میں فارسی کے مسلمان شاعر ایسے بھی تھے جو ہندی میں بھی شعر کہتے تھے اور ہندی گیتوں کو بڑے پریم سے اپنے سوامی کے سامنے گاتے تھے۔ ان میں شیخ عبداللہ بلگرامی اور شیخ گدائی دھلوی ممتاز درجہ رکھتے تھے"۔

(مغل بادشاہوں کی ہندی۔ صفحہ ۲ و ۷)

نرہری کوی کا ہمایوں کے دربار میں رہنا ذیل کے ہندی شعر سے ثابت ہوتا ہے:

کوی لکھی دلستی سکوی بھنے نرہری سبھا گیہ دھر
شاہ ہمایوں نکٹ رہے سندر شوسیستی دھر

(دیکھئے انشی چترا زلال جی صفحہ ۲ و ۳)

ہمایوں کے درباری کوی چھیم بندیجن نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی بہادری کی

تعریف اس طرح کی ہے۔

دھرنی تھرنی تھر تھرت ڈرنی   رتھ تریانی تل ٹوٹے پکھو
دھوم دھام دھر دھر لوک   سُر پتی اتی بیٹھ سے ہٹو
ہم گیری سمیرو کیلاس ڈگ تب   ہے ہری ہے ہری بھون کر بھیو
بھیم کوپی حضرت علی تب   ذوالفقار کرم گہیو

(اکبری دربار کے ہندی کوی صفحہ ۲۷، شو سنگھ سروج صفحہ ۱۰۲)

شیر شاہ سوری صاحب ذوق اور فراخ دل بادشاہ تھا۔ نرہری کوی اُس کے دربار میں بھی رہا ہے۔ نرہری نے اس کی بہادری کی تعریف یُوں کی ہے:

سیر ساہ ننج بجوری کھڑگ دھرنی گھٹا ماری میدہ مری
نرہری سکوی جوگتی گرن گاوت نایت بھوت سارن ہوری

شیر شاہ خود پاٹھ شالاؤں اور مٹھوں میں جا کر اپنی روحانی ترقی کی نسبت عُلما سے مشورہ کیا کرتا تھا۔ اس کا بیٹا سلیم شاہ خود بھی ہندی کا شاعر تھا اور ہندی شعرا کا قدردان بھی۔ اس کی ہندی شاعری کے نمونے اسنگیت راگ کلپدرم پہلا حصہ صفحہ ۳۰۲ پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

نرہری سلیم شاہ کے دربار میں بھی رہا ہے۔ چنانچہ ایک دوہے میں اس نے سلیم شاہ کے لئے دُعا مانگی ہے۔

برہم جہنی جگدیش کنہہ کرد یا کرت رچ نیم
اُس نر مل بھر چر جیو سے جیتی شاہ سلیم

(اکبری دربار کے ہندی کوی صفحہ ۲۹)

اکبری عہد ہندی ادب کے ارتقا کے لئے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس بادشاہ کی بلند نظری۔ فراخ دلی۔ ادب نوازی۔ مذہبی رواداری۔ ملنساری وسیع المشربی۔ رعایا پروری۔ علم دوستی۔ عدل گستری۔ شاعر نوازی اور ہر دل عزیزی نے ہندی شاعری کو وہ ترقی دی کہ آج تک بھی ہندی ادب اُس کے احسان سے عہدہ برآ نہیں

ہو سکتا۔ گو اس سے پہلے مسلمان بادشاہوں نے باقاعدہ ہندی کو نوازا ہے لیکن اکبر ہنر پروری اور قدردانی میں سب سے افضل تھا۔ اس میں محمود غزنوی کا جوش۔ آزاد خیالی اور سخاوت۔ سلطان نصیر الدین کا صبر و غنا۔ محمد تغلق کی ادب دانی و علمیت۔ سلطان فیروز شاہ کی فضیلت۔ شیر شاہ کی طرزِ حکومت کے اجتماع کے علاوہ مذہب کی نئی راہ کا انکشاف اور ہندی بھاشا کے متعدد شاعروں کو سہارا دینے کا ملکہ بھی موجود تھا جبھی ہندی علم و ادب اُس کے چترِ دولت کے سایہ میں پایہ میں پھلتا پھولتا رہا۔ تزکِ جہانگیری حصہ اول صفحہ ۳۳ پر جہانگیر خود لکھتا ہے کہ:

"میرے والد صاحب ہمیشہ ہر ایک مذہب اور عقیدے کے علماء بالخصوص بھارت کے مشہور پنڈتوں کی صحبت میں رہتے تھے اور شاعری اور فارسی کے رموزِ سخن سے واقف تھے"

فی الاصل اکبر دربار میں خود لکھنا پڑھنا نہ تھا، اس لئے لوگوں نے اُسے اَن پڑھ مشہور کر دیا، ورنہ اُس نے ہندی اور فارسی کی تعلیم باقاعدہ اُستادوں سے حاصل کی ہے۔ چنانچہ بھانوں چندر اُپادھیائے سے اکبر نے "سوریہ سہسر نام" پڑھا تھا۔ اکبر نامہ میں ابوالفضل نے اکبر کی سخندانی اور سخن گوئی کا ذکر کیا ہے۔ وہ مثنوی مولانا روم۔ دیوانِ حافظ اور دیگر فارسی کتب پڑھوا کر سنتا تھا۔

(اکبر نامہ حصہ اول صفحہ ۴۸۴-۴۸۵)

اکبری عہد سے پہلے ہندی شاعری بلحاظِ فن غیر مربوط عالم میں تھی، اور عروض سے بے نیاز تھی، لیکن اکبر کے زمانے میں اس کا یہ نقص بھی دور ہو گیا اور متعدد کتابیں اس فن پر لکھی گئیں۔ اکبری دربار کے اندر اور باہر عظیم الشان صاحبِ فن اور عدیم النظیر اربابِ ہنر موجود تھے۔ مہاتما سورداس اور تلسی داس ایسے بھگت۔ سوامی ہری داس اور تان سین ایسے منشی۔ راجہ بیربل۔ تان سین۔ مُلّا دو پیازہ۔ حکیم ہمام۔ عبدالرحیم خان خاناں۔ راجہ ٹوڈر مل۔ ابوالفضل اور فیضی ایسے نورتن اور شاعر اکبری عظمت و شوکت کا زندہ ثبوت ہیں۔

سیاسی آزادی نے اکبر کے دل کو وسیع بنانے کے ساتھ ہی مذہبی آزادی کے لئے بھی ترغیب دی تھی۔ ہندو ماحول میں جنم لینے، حرم سرا میں ہندو رانیوں سے ہندو گیت سننے۔ ہندو افسروں کا حسنِ سلوک، اور سب سے بڑھ کر بانسل کی راجپوتانی کا ہمایوں کو راکھی بھائی بنانے کے منظر نے اکبر پر ایک گہرا اثر چھوڑا تھا۔ اسی ضمن میں وہ اکثر سادھوؤں سنیاسیوں اور یوگیوں سے مشورے کرتا رہتا تھا۔ اُس نے چالیس دن تک سنت دادو دیال سے بحث جاری رکھی اور اُن کی بھگتی سے متاثر ہوا۔ اکبر کے زیر سایہ فارسی اور ہندی کے متعدد شعراء و علماء کو وظیفے ملتے تھے۔ ابوالفضل کی مشہور اور لاثانی تصنیف آئینِ اکبری میں اس قسم کے وظائف کی ایک طویل فہرست موجود ہے۔ پیھو سرسوتی۔ رام کرشن۔ بلبھدر مصر۔ واسدیو مصر۔ رمن بھٹ۔ گوپی ناتھ اور بھاگیرت بھٹاچاریہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

(دیکھئے آئینِ اکبری صفحہ ۵۳۷)

اکبری دربار کے نورتن اعلیٰ درجہ کے ہنرشناس اور ہنروان انسان تھے۔ ان علماء و شعراء کے ذریعے ہندی ادب کو بہت ترغیب حوصلہ اور ہمت و ترقی نصیب ہوئی۔

اکبری دربار کے ہندی شاعروں کو دو حصوں میں بانٹ سکتے ہیں۔

۱۔ ایک تو وہ گروہ جو مستقل طور پر اقامت گزیں تھا۔ ان میں کئی اعلیٰ مدارج پر فائز تھے۔ جیساں چتربھج داس برہمن۔ راجہ آس کرن۔ راجہ پرتھوی راج۔ منوہر کوی۔ راجہ ٹوڈرمل۔ نرہری۔ برہم۔ تان سین۔ گنگ، اور رحیم خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

۲۔ دوسری قسم شعراء کی وہ ہے، جن کا دربار میں آنا جانا تو تھا لیکن دربار سے باقاعدہ تعلق نہیں تھا۔ ان میں چندربھان۔ ویاس۔ مدن موہن۔ کرنیش۔ نکھن داس۔ سورداس۔ ڈرساجی۔ ہولی رائے قابلِ ذکر ہیں۔ "مصر بندھو ونود" میں امرت رائے۔ جیت رام۔ جگدیش۔ جودھ۔ جگنگ اور مان رائے

نام بھی اکبری دربار کے شاعروں میں آیا ہے۔

چتربھج داس برہمن کو اکبری دربار سے ایک ہزار روپیہ ملتا تھا۔ منوہر کوی اکبر کے مصاحب فارسی اور سنسکرت کے جیّد عالم اور شاعر تھے۔ فارسی میں توسنی تخلص کرتے تھے۔ تزکِ جہانگیری اور مہر بند صوود توده میں ان کا ذکر ملتا ہے۔ ان کی جوانی اکبری دربار میں اور بڑھاپا جہانگیر کے دربار میں گزرا۔ جہانگیر نے ان کو "رائے منوہر" اپنی حکومت کے آٹھویں سال ایک ہزاری کا خطاب۔ اور آٹھ سو گھوڑے عطا کیے تھے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد جہانگیر نے ان کے بیٹے پرتھوی چند کو رائے کا خطاب دیا۔ پانچ سو کا منصب اور چار گھوڑے عطا کیے تھے اور ان کے گاؤں میں انھیں ایک جاگیر بخشی دی۔ (دیکھئے توزکِ جہانگیری حصہ اوّل صفحہ ۲۳۱ و ۲۳۸)

راجہ ٹوڈرمل اکبری دربار کے مایۂ ناز وزیر مالیات و اقتصادیات تھے۔ اکبر نے انھیں راجہ کا خطاب دیا تھا۔ ریاضی داں ہونے کے علاوہ بہادر بھی تھے اور شاعر بھی۔

"نرہری" بابر۔ ہمایوں اور اکبر تینوں بادشاہوں کے دربار میں رہے ہیں۔ انھوں نے تینوں کی مدح ایک ہی چھند میں اکٹھی کی ہے۔ یہ وہ نرہری ہیں جن کے دروازے پر مغل بادشاہوں کے دیئے ہوئے ہاتھی جھومتے تھے۔ (دیکھئے اکبری دربار کے ہندی کوی صفحہ ۶۶)

شور داس۔ مدن موہن اکبر کے وقت سنڈیلے کے خزانچی تھے۔ انھوں نے خرچ زیادہ کر دیا۔ اکبر نے ان کا قصور معاف کر دیا اور تیرہ لاکھ کا نقصان برداشت کر لیا۔ (ہندی ساہتیہ کا اتہاس ڈشکل صفحہ ۱۸۲)

نرہری نے پٹھان ونش کو بھی بنتے اور بگڑتے دیکھا ہے۔ دونوں حالتوں کا بیان اس کے اشعار میں ملتا ہے۔ (نرہری کے ودھ و شیہ چھند)

"اکبرنامہ" صفحہ ۸۲ پر لکھا ہے کہ اکبر نے آڈلیسہ کے راجہ کے پاس حسن خاں خزانچی کے ساتھ اور کسی کو نہ بھیج کر نرہری کو بھیجا تھا۔ نرہری کی ترغیب سے اکبر نے گئو ہتیا بند کر دی تھی۔

(اکبری دربار کے ہندی کوی صفحہ ۷۷)

"ہندی لٹریچر صفحہ ۳۶ پر لکھا ہے کہ:

"اکبر نے نرہری کو مہا پاتر کا خطاب دیا تھا اور کئی گاؤں جاگیر میں عطا کیے تھے جس کا بیان وہاں کوی نے اپنے گیت میں کیا ہے"۔

بیربل کا اصل نام مہیش داس تھا۔ یہ اکبر ہی کی عنایت کا کرشمہ ہے کہ لوگ مہیش داس کا لفظ بھول کر فقط بیربل اور پھر بیربل کہنے لگے۔ اکبر نے بیربل کو کوی راج"

کا خطاب دیا تھا اور نگر کوٹ (کانگڑہ) کے قریب ایک اچھی جاگیر دے کر راجہ کا خطاب دیا۔ لاہور کے حاکم مرزا ابراہیم کے بھائی مسعود کو پکڑ لانے کے صلے میں اکبر نے اُن کو مصاحب دانشور (بدھی مان منتری) کا خطاب عطا کیا۔

(دیکھئے طبقاتِ اکبری صفحہ ۳۹۹ یا معاصرالامرا صفحہ ۲۶۶)

۱۶۴۰ء میں اکبر نے اُن کو نیائے اوشیش کا خطاب دیا تھا۔ اس کے علاوہ دو ہزاری پھر پنج ہزاری کا منصب دیا، اور رہنے کے لئے فتح پور سیکری میں خاص محل بنوا کر دیا۔ اکبر کے خود نوشت سورٹھے بھی ملتے ہیں۔ چناں چہ بیربل کی موت پر اکبر نے ہندی سورٹھے کہہ کر ماتم کیا ہے۔

(اکبری دربار کے ہندی کوی صفحہ ۸۹)

بیربل کا بڑا لڑکا "لالہ" شہزادہ سلیم کے دربار میں بمقام الہ آباد رہا۔ یہ بات مشہور ہے کہ بیربل نے اجاریہ کیشوداس کو ایک سو ہے پر ایک کروڑ دام کی ہنڈی دی تھی۔ اکبر کو ہندی شاعری کا شوق اس قدر تھا کہ وہ گاہے گاہے اپنے درباری کویوں کے سامنے ہندی کا مصرع طرح رکھتا تھا۔ ان شعرا میں گنگ کا رتبہ بلند تھا۔ خان خاناں نے گنگ کے ایک چھپے پر خوش ہو کر چھتیس لاکھ روپے بطور انعام دیئے تھا۔

(اکبر نامہ صفحہ ۴۹۹)

بیربل نے بھی گنگ کے ایک چھپے پر ایک لاکھ روپیہ انعام دیا تھا۔

(شوسنگھ سروج صفحہ ۴۰۲)

شہزادہ دانیال جو اکبر کا بیٹا اور خان خاناں کا داماد تھا۔ اکبر نے اُس کی تعلیم و تربیت ہندوؤں کی دیکھ ریکھ میں کرائی تھی۔ ہندی بھاشا اور ہندی شاعری سے اُسے خاص اُنس تھا۔ خود بھی ہندی کا اچھا شاعر تھا۔

عبدالرحیم خان خاناں نے ہندی شعرا کی خوب سرپرستی کی ہے متعدد ہندی شعرا اس کے زیرِ سایہ رہتے تھے۔ "معاصر رحیمی" صفحہ ۵۶۲ پر درج ہے کہ خان خاناں نے ہندی کویوں کو جتنا نوازا ہے اُس کا دسواں حصہ بھی فارسی کویوں کو نہیں نوازا ہے

نتیجہ کے طور پر ہندی کویوں نے رحیم کی جو حمد و ثنا کی ہے، اُس کا سوواں حصہ بھی فارسی شعرا نے نہیں کی "۔ اس سے رحیم کی ہندی نوازی کا پتہ چلتا ہے۔

"رحیم رتنا ولی" اور "خان خاناں" نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ راجہ آس کرن کو رحیم نے خوش ہو کر ہر دوہے پر ایک لاکھ روپیہ دینا چاہا۔ ان کے علاوہ جادر کوی۔ نندن کوی۔ پرسدّھ کوی۔ سنت کوی۔ ہری ناتھ نرہری سارا کوی۔ مکند کوی اور گنگ وغیرہ متعدد ہندی کویوں نے رحیم کی مدح سرائی کی ہے۔

مہارانا امر سنگھ والیٔ اودے پور اور ریوان نریش راجہ رام چندر سے رحیم کی انتہائی محبت تھی، وہ دونوں ہندی کوی بھی تھے۔ کوی تُلسی داس سے رحیم کی محبت تو سب جانتے ہیں۔ چنانچہ ایک بار ایک برہمن اپنی کنیا کے بیواہ کے لئے دھن نہ ہونے سے گھبرایا ہوا گوسوامی جی کے پاس آیا۔ گوسوامی جی نے اُسے رحیم کے پاس بھیجا اور دوہے کا مندرجہ ذیل ایک مصرع لکھ کر ساتھ دے دیا۔ ع

سُر تیئے۔ نر تیئے۔ ناگنئے۔ یہ چاہت سب کوئے

رحیم نے اُس برہمن کو بہت سا دھن دے کر وداع کیا اور دوہے کا دوسرا مصرع اس طرح پورا کر کے بھیجا۔ ع

گود لئے ہُلسی پھرے تُلسی سو سُت ہوئے

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اکبر کے وقت گنگ شاعر کے قلم سے کھڑی بولی کی نثر پہلے پہل نکلی۔ (ہندی گدھیہ وکاس صفحہ ۹)

جہاں گیر کے وقت جٹ مل کو ہندی نثر کا ادیب مانا جاتا ہے۔

(ہندی گدھیہ وکاس صفحہ ۹)

اکبری دربار کے نورتنوں میں فیضی فارسی کے علاوہ سنسکرت اور ہندی کا جید عالم تھا، اُس نے سنسکرت کی کتب کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ چنانچہ اُس کا کیا ہوا گیتا کا منظوم ترجمہ مقبول خاص و عام ہے۔

اکبری عہد کی یہ نمایاں خصوصیت ہے کہ اکبر نے ایک دار الترجمہ کی بنیاد رکھی۔

جس میں مسلم اور غیر مسلم اہلِ قلم مقرر کیے گئے۔ اس ادارہ کے صدر ملک الشعرا ابوالفیض فیضی تھے۔ بہت سی سنسکرت اور ہندی کتب فارسی قالب میں ڈھالی گئیں۔ اسی مفہوم کو رسالہ نگار لکھنؤ بابت ماہ اگست ۱۹۵۵ء صفحہ ۷ پر قاضی محمد ابراہیم صاحب نے یوں ظاہر کیا ہے:۔

"اکبر نے ہندو ادیبوں اور پنڈتوں کو اپنے پاس بٹھا کر مقدس کتابوں کو اُن سے سُنا۔ ان کتابوں کو سُننے کے بعد اُس نے ضروری سمجھا کہ اُن کو فارسی میں منتقل کیا جائے تاکہ فارسی دان مسلمان بھی ان سے بہرہ اندوز ہو سکیں۔ اسی غرض سے اُس نے ایک دارالترجمہ قائم کیا، جس میں ہندو مُسلم اور دوسرے اہل قلم کو اس کام کے لیے مقرر کیا۔ ملک الشعرا ابوالفیض فیضی کو اس کا صدر مقرر کیا۔ دارالترجمہ کے اکثر اراکین سنسکرت کے ماہر تھے، جن میں مُلّا عبدالقادر بدایونی فیضی نقیب خاں اور مُلّا شیری خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے تراجم کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ مہابھارت: نقیب خاں، مُلّا عبدالقادر بدایونی۔ ملا شیری اور حاجی تھانیسری کی متفقہ محنت و سعی سے فارسی میں ترجمہ کیا گیا، اور ابوالفضل نے اس پر مقدمہ لکھا۔ اس ترجمہ کا ایک نسخہ ممبئی یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہے اور نام اس کا "رزم نامہ" ہے۔

۲۔ رامائن:۔ مُلّا عبدالقادر بدایونی نے چھ سات سال کی جانفشانی کے بعد ۹۹۹ھ میں مکمل کیا۔ اس کا آخری شعر یہ ہے ؎

قصہ نوشتیم بہ سلطاں کہ رساند
جاں سوختہ کردیم بجاناں کہ رساند

۳۔ اتھروید:۔ مُلّا بدایونی۔ حاجی ابراہیم سرہندی۔ نو مسلم برہمن شیخ بھاون اور فیضی نے مکمل کیا۔

۴۔ تاریخ کرشن جی: اراکین دارالترجمہ نے مکمل کی۔

۵۔ سنگھاسن بتیسی ۔ مُلّا عبدالقادر بدایونی اور خواجہ حسن امروہوی۔

۶۔ لیلا وتی ۔ فیضی نے ترجمہ کیا۔ یہ ریاضی کی مشہور کتاب ہے۔ اس کا قلمی نسخہ بمبئی یونی ورسٹی کی لائبریری میں موجود ہے۔

۷۔ تاجک :۔ مکمّل خاں گجراتی نے ترجمہ کیا۔

۸۔ بھگوت گیتا ۔ فیضی نے فارسی نظم میں ترجمہ کیا۔

۹۔ ہروِنش پران ۔ مولانا شیری نے ترجمہ کیا۔

۱۰۔ کلیلہ دمنہ ۔ ابوالفضل کے قلم کا نتیجہ ہے۔

۱۱۔ راج ترنگنی ۔ مولانا شاہ محمد شاہ آبادی نے اور مُلّا بدایونی نے اس کا ترجمہ سلیس زبان میں کیا۔ ترجمے کے صلے میں اکبر نے دس ہزار تنکہ اور ایک گھوڑا انعام دیا۔ چناں چہ مُلّا بدایونی اپنی تاریخ "منتخب التواریخ" میں اس کا اعتراف کرتے ہیں۔

۱۲۔ نل دمن ۔ فیضی نے یہ قصّہ پانچ ماہ میں مکمّل کیا۔ ۴۲۰۰ اشعار اس مثنوی کے ہیں۔

۱۳۔ یوگ وششٹ ۔ نقیب خاں ۔ مُلّا شاہ محمد اور ابوالفضل نے ترجمہ کیا۔

۱۴۔ ہیش جہانند ۔ ابوالفضل نے ترجمہ کیا۔

۱۵۔ بحر الاسماء ۔ مُلّا بدایونی نے ترجمہ کیا۔

سنسکرت کے علاوہ ہندی ادب کی طرف بھی اکبر نے بڑی توجہ کی۔ اس نے اس ادب کی بیش بہا کتابوں اور ادبی پاروں کو فارسی میں ڈھالا، تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ مستفید ہو سکیں۔

شوُرداس کے والد صاحب بابا رام داس اکبری دربار کے مغنّی تھے، اور سوامی ہری داس کا گانا سُننے کے لئے اکبر بادشاہ سادھو کے لباس میں تان سین کے ساتھ آیا تھا۔ تان سین اُن کی عزت گورو کی طرح کرتے تھے۔

(ہندی ساہتیہ کا اتہاس: از شکل صفحہ ۱۸۶)

ہلول رائے اور برہم بھٹ کو بھی اکبر نے زمین عطا کی تھی
منتی رام نے ایک کتاب "پھول منجری" جہانگیر کے حکم سے لکھی اور "چھند سار" کتاب فتح شاہ بندیلہ کے لئے لکھی۔

جہانگیر کے دربار میں بھٹّاچاریہ۔ بنارسی۔ پٹھان مصر۔ جوتک رائے۔ جیو نسنتی کو بڑا اعزاز حاصل تھا۔ ایک دفعہ ایک پیشین گوئی کے صلے میں جہانگیر نے جوتک رائے کو سونے سے تلواکر سونا اُسی کو دے دیا۔

بشن داس مصر کی شاہی دربار میں بڑی عزّت تھی۔ ایک نظم کے صلے میں جہانگیر نے اُن کو ایک ہاتھی عنایت کیا۔ اور پہنکر کوی کے اشعار سے خوش ہو کر اُنھیں قید سے آزاد کر دیا۔

(ہندی ساہتیہ کا اتہاس از شکل صفحہ ۲۷)

پہنکر کوی نے "رس رتن" نامی کتاب لکھ کر ہندی افسانہ نگاری کی ابتدا کی۔ طاہر نے "کوک سار" نامی کتاب ۱۰۳۰ھ میں لکھی۔

جہانگیر کے عہد میں شیخ سعد اللہ مسیح پانی پتی نے راماین کو فارسی نظم کا جامعہ پہنایا۔ اور اسی عہد میں ملک محمد جائسی ایسا یکتائے روزگار ہندی شاعر ظاہر ہوا جس کے بلند پایہ ہندی کلام نے ہندی شاعری کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیا۔

اکبر اور جہانگیر کی طرح شاہ جہاں بھی ہندو اہلِ قلم کی برابر سرپرستی کرتا رہا۔ وہ خود بھی ہندی کا شاعر تھا۔ ۱۰۶۱ھ میں ایک ہندی شاعر نے اُس کے نام پر کبت کہہ کر دو ہزار روپے اور ایک ہاتھی انعام میں حاصل کیا۔ ہندی شعراء سُندر داس اس کے دربار کا ملک الشعراء تھا۔ اس کی تصانیف "سُندر سنگار" اور "سنگھاسن بتیسی" برج بھاشا میں مشہور ہیں۔ ہندی کے مشہور شعراء "چنتامنی" اور "راجہ شمبھو ناتھ سنگھ" بھی اسی کے دربار سے منسلک رہے۔ راجہ شمبھو نے شاہ جہاں کی فرمائش پر "کوندا کلپ لتا" نامی کتاب لکھی۔

(بزم تیموریہ صفحہ ۲۱۱)

شاہ جہانی عہد کا سب سے ممتاز شاعر اور ادیب چندر بھان

برہمن تھا۔ (بزم تیموریہ۔ صفحہ ۲۰۸)

بہاری لال چوبے اور متی رام تربھائی کو بھی بڑا اعزاز حاصل تھا۔

نروندرائے ہندی شاعر نے شاہ جہاں کی فرمائش پر ایک کتاب لکھی، جس میں ہندی۔ سمبت اور قمری مہینوں کے اعداد و شمار لکھے ہیں۔ اسی عہد میں ہرناتھ ایک ہندو فاضل "مہا پاتر" کے لقب سے ملقب تھا۔ جگن ناتھ کو "مہا کوی رائے" (ملک الشعرا) کا خطاب دیا گیا، اور اُسے روپوں سے تلوایا گیا۔ اُس کا وزن ۴۵۰۰ روپوں کے برابر ہوا، جو اُسے دے دیے گئے۔

شاہ جہاں کی سرپرستی میں اُپنشد۔ بھگوت گیتا اور یوگ وششٹ کا فارسی میں ترجمہ ہوا۔ ان شعرا کے علاوہ سیناپت۔ نیل کنٹھ اور بھوشن بھی شاہ جہانی دربار کے ہندی کوی تھے۔ یہ شاہ جہاں ہی تھا کہ سرسوتی کو سنسکرت شاعری سے ہٹا کر ہندی کی طرف لایا۔ سرسوتی نے ہندی ادب میں خوب اضافہ کیا۔ چنتا منی نے شاہ جہاں کے حکم سے "اروشی" نام کا منظوم لغت تیار کیا۔ ایک طبی کتاب "پران سکھ" نامی ۱۰۶۴ھ میں لکھی گئی۔ اسی عہد میں جگن ناتھ کلاونت نے بارہ دھرپد مختلف نغموں میں تیار کیے، جو بادشاہ کو بہت پسند آئے۔

دارا شکوہ میں اکبر اعظم کی بہت سی خصوصیات نمایاں طور پر موجود تھیں۔ وہ ہندوؤں سے بہت دلچسپی رکھتا تھا۔ اُن کے ادب اور معاشرت کو محبت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ چناں چہ بابا لال داس جی بیراگی سادھو اس کے گورو تھے۔ یہ وہی بابا لال داس جی ہیں جن کی گدی آج بھی موضع دھیان پور، ضلع گورداس پور (پنجاب) میں موجود ہے۔ انھوں نے ساڑھے تین سو سال عمر پائی۔ ابراہیم لودھی کے بھی یہ گورو تھے۔ بابر سے بھی ان کا تعلق رہا۔ پھر دارا شکوہ بھی ان کا مرید ہوا۔ "اسرارِ معرفت" نامی کتاب میں دارا شکوہ اور بابا لال داس جی کی باہمی روحانی گفتگو سوال و جواب کے رنگ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

دارا شکوہ سنسکرت کا بہت بڑا فاضل تھا۔ اس نے سنسکرت کتابوں کے ترجمے

فارسی میں کرائے اور خود بھی بھاگوت پران کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ علاوہ ازیں اُس نے " اُپنشد" کا ترجمہ "سِرِّ اکبر" کے نام سے کیا۔ اس کے یہاں متعدد ہندی دان ملازم تھے۔ جن کا کام ہندی زبان میں ترجمے کرنا تھا۔ " سارسنگرہ " جو دوہوں کی بیاض ہے، اسی کے حکم سے مدوّن ہوئی۔

سترھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں دولت خاں قاضی نے "نور حیندارانی" بنگالی نظم لکھنی شروع کی۔ قاضی کی بے وقت موت کے باعث یہ نظم ختم نہ ہو سکی۔ ایک اور مسلمان شاعر " علاول" نے ۱۶۵۶ء میں اس کی تکمیل کی۔ عبد الحکم نے قصّہ یوسف زلیخا کو اسی زبان میں نظم کیا۔ دولت وزیر بہرام نے "لیلیٰ مجنوں" نام کی مثنوی لکھی۔ " یمین جلال" ایک عشقیہ افسانہ محمد اکبر نے لکھا۔ کبیر محمد نے " رنگ مالا" شمشیر علی نے " ریجوان ساہا" (رضوان شاہ) اور شمس الدین صدیق نے " بھاؤ لابھ" لکھی۔ (پنجاب میں اُردو صفحہ ۱۱۷)

اورنگ زیب اگرچہ صوفی منش بادشاہ تھا، لیکن ادب شناس اور علم دوست اس قدر تھا کہ اُس کے دربار میں دُور دُور سے ہندی شعرا جمع ہوئے۔ اُس نے ان کی خاص طور پر قدر افزائی کی۔ چنانچہ اس کے عہد کے مشہور شعرا میں ایشور داس۔ دانش خاں۔ کالیداس ترویدی اور عبد الجلیل بلگرامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایشور داس کو ملک الشعرا کا خطاب عطا کیا تھا۔ علاوہ ازیں بیرداس چنتامنی۔ وامق کھتری۔ رائے بندرابن، جس نے تاریخ ہند لکھی اور عالمگیر کے نام منسوب کی۔ بھیم سین کائستھ نے " نسخۂ دل کُشا" کے نام سے تاریخ لکھی۔ سجان رائے کھتری جس نے خلاصۃ التواریخ لکھی، عالمگیر دربار کے پروردہ تھے۔ بھوشن کوی پہلے اورنگ زیب کے دربار میں رہے، پھر ۱۶۶۷ عیسوی کے آخیر پر ۵۲ سال کی عمر میں شیواجی کے پاس پہنچے۔ (دیکھئے بزمِ تیموریہ)

سمت ۱۷۶۱ بکرم میں برندہ کوی کرشن گڑھ کے مہاراجہ راج سنگھ کے ہمراہ اورنگ زیب کی فوج میں ڈھاکے تک گئے تھے۔ اورنگ زیب اُن سے ہندی اشعار سُن کر

محفوظ ہوتا تھا۔ (ہندی ساہتیہ کا اتہاس از رام چندر شکل صفحہ ۳۲۷)

کالی داس ترویدی سمت ۱۷۴۵ بکرم میں گول کنڈہ کی چڑھائی وقت اورنگ زیب کی فوج میں گئے تھے۔ اس لڑائی کا حال بیان کرتے ہوئے اُنھوں نے اورنگ زیب کی بہت تعریف کی ہے۔ (ہندی ساہتیہ کا اتہاس از رام چندر شکل صفحہ ۲۶۱)

ایک دفعہ شہزادہ محمد اعظم نے خاص قسم کے آم تحفے میں بھیجے اور اُن کے نام مقرر فرمانے کی درخواست کی۔ اورنگ زیب نے اُن کے نام "سدھارس" اور "رسنا بلاس" تجویز کئے۔ مہاراجہ جسونت سنگھ اچھے ہندی شاعر تھے، اورنگ زیب نے اُنھیں صوبے دار بنایا۔ سبل سنگھ چوہان اورنگ زیب کے دربار میں رہنے والے راجہ مترسین سے اپنا تعلق بتاتے ہیں۔

(ہندی ساہتیہ کا اتہاس از شکل صفحہ ۳۲۶)

سُکھ دیو مصر اورنگ زیب کے وزیر فاضل علی شاہ کے یہاں بہت عرصہ رہا۔ اس نے اِس وزیر کے نام پر ایک کتاب "فاضل علی پرکاش" لکھی۔

(ہندی ساہتیہ کا اتہاس از شکل صفحہ ۲۹۰)

اورنگ زیب نے گجرات کے بوہروں کی تعلیم کے لئے بڑی کوشش کی۔ یہ لوگ ہندی کے زبردست حامی تھے۔ عالم گیر اورنگ زیب کے رقعاتِ عالم گیری فارسی میں ہیں۔ ان میں بکثرت ہندی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ مثلاً:

۱۔ درارسالِ ڈالی انبہ بہ تلافیِ مافات کوشند۔

۲۔ دریں ضمن گرسیِ کھچڑی پیشتر بنظر گذشت۔

۳۔ مزۂ کھچڑی بریانیِ شما در زمستان یاد می آید۔

۴۔ چار گھڑی روز ماندہ باز دیوانِ عام می فرمودند

۵ شادیانۂ فتح بنوازند و حرفِ ایامِ طفولیت یاد دارند کہ بابا جی دھوں دھوں

عہدِ عالم گیر میں ملّا عبد الواسع ہانسوی نے اُردو ہندی الفاظ کا ایک لغت مدوّن کیا اور اُس کا نام "غرائب اللغات" رکھا۔ الفاظ کے معنی فارسی میں لکھے

یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ اورنگ زیب کے عہد میں فارسی سے ملی ہوئی کھڑی بولی یعنی ریختہ میں بھی شاعری شروع ہو گئی جس کی اشاعت فارسی پڑھے لکھے لوگوں میں برابر بڑھتی گئی۔ اس طرح کھڑی بولی کو لے کر اردو زبان کھڑی ہوئی۔

شاہزادہ اعظم شاہ کا مرتبہ ہندی شعرا کے سرپرستوں کی فہرست میں بہت ممتاز ہے۔ دیو ونت شاعر نے سولہ برس کی عمر میں اپنی پہلی ہندی نظم شاہزادے کے سامنے پڑھی۔ شاہزادے نے اسے پسند کیا۔ اور انعام و اکرام سے مالا مال کر دیا۔
حسن نواز شاعر بہاری نے اپنی مشہور تصنیف "ست سئی" کا ایک نسخہ شاہزادے کو بھیجا، جسے اعظم شاہی نسخہ کہا جاتا ہے۔ شاہزادے نے بہاری کو بیش بہا انعامات سے نوازا۔ انتر وید کے رہنے والے [illegible] کوی "نواز" بھی اعظم شاہ کے دربار میں رہتے تھے، انھوں نے شاہزادے کے حکم سے "دو شکنتلا ناٹک" [illegible] میں لکھی ہے۔ دیو کوی نے اپنی کتابیں "اشٹ یام" اور "بھاو ولاس" اعظم شاہ کو سنائیں اور انعام سے مالا مال ہوا۔

مسلمان کوی عالم قوم کے برہمن تھے لیکن ایک خاتون شاعرہ شیخ رنگریزن کے عشق میں مسلمان ہو گئے تھے، یہ اورنگ زیب کے بیٹے معظم کے دربار میں رہتے تھے۔ یہی شاہزادہ بعد میں بہادر شاہ کے نام سے تخت نشین ہوا۔ عالم کی عورت شیخ بھی دربار میں رہتی تھی۔ عالم نے ایک تصنیف "عالم کیلی" جس میں رادھا اور کرشن جی کے واقعات درج ہیں اپنی یادگار چھوڑی۔

دیوا نامی شاعر ۱۱۲۴ھ میں اس بادشاہ کے دربار سے متعلق تھا۔ اسی زمانہ میں شری دھر یا مرلی دھر کوی نے جنگ نامہ لکھا جس میں فرخ سیر اور جہاندار کی لڑائی کا حال لکھا۔
سری پت بھٹ ایک گجراتی برہمن تھا۔ انہیں نے سید ہمت خاں نواب الہ آباد کے نام پر "ہمت پرکاش" [illegible] ایک [illegible] میں نظم کی۔ اسی زمانے میں قاسم [illegible] نے کیشو داس کی "رسک پریا" پر ایک نفیس شرح لکھی۔ اسی عہد میں عبد الرحیم بھی ایک مشہور ہندی شاعر ہوا ہے۔ ایک اور ہندی شاعر علی رام نے نواب ہمت خاں

کی فرمائش پر ہندی کے فنِ عروض میں کتاب "پنگل من ہرن" سمبت ۱۷۸۱، لکھی۔ سید محمد سعید المخاطب بہ سید میراں بھیک چشتی صابری عہد عالم گیر کے بزرگ ہیں ان کا انتقال ۱۱۳۱ھ میں ہوتا ہے۔ ہندی زبان کے جید عالم اور قابل شاعر تھے۔ انھیں کے مرید محبوب عالم عرف شیخ جیون ہیں۔ ہریانہ کی زبان میں ان کی تصنیف سے "درد نامہ محمد" اور "عشر نامہ" یادگار ہیں۔ یعقوب خاں نے ہندی زبان میں کتاب "رس بھوشن" لکھی۔

فرخ سیر کے عہد میں مرزا عبد الرحمن نے "نکھ سکھ" لکھی۔ سید پہار شاہ خلف سید حمزہ "رس رتناکر" ایک طبی تصنیف کے مصنف ہیں۔ شیخ سلیمان ایک معراج نامہ موسوم بہ "خالق نامہ" کے ناظم ہیں۔ شیخ خوشحال محمد قادری نوشاہی متوفی ۱۱۲۷ ہجری فارسی اور ہندی کے مقبول شاعر تھے۔

کوی گردھر رائے آصف الدولہ کے دربار سے انعام پاتے رہے اور راجہ ہمت قائم خاں کے دربار سے متعلق رہے۔

صورت مصر کانیہ کبج برہمن تھے۔ پہلے نصر اللہ خاں سردار کے ہاں رہے، پھر دہلی کے مغل بادشاہ محمد شاہ کے دربار میں آیا جایا کرتے تھے۔

گنجن کوی گجراتی برہمن تھے، انھوں نے "قمر الدین خاں ہلاس" گرنتھ لکھا۔ قمر الدین خاں دہلی کے بادشاہ محمد شاہ کے وزیر تھے اور ہندی شاعری کے دلدادہ تھے۔ ان کی تعریف گنجن کوی نے خوب دل کھول کر کی ہے۔ جس سے جان پڑتا ہے کہ ان کے ذریعہ شاعر کو بہت عزت ملی ہوگی (ہندی ساہتیہ کا اتہاس از شکل صفحہ ۲۷۵)

کوی دھنانند دہلی کے بادشاہ محمد شاہ کے میر منشی تھے۔ برج بھاشا کے مستند شاعر اور بلند پایہ استاد تھے۔ یہ نادر شاہ کے سپاہیوں کے ہاتھوں مارے گئے۔

(ہندی ساہتیہ کا اتہاس از شکل صفحہ ۳۲۵)

بھگونت ناگری داس دہلی کے بادشاہ محمد شاہ کے دربار میں سمبت ۱۸۰۴ بکرم میں رہتے تھے۔ انھوں نے بوندی کے ہاڑا جیت سنگھ کو مارا تھا۔ کمان اور ... کشور محمد شاہی دربار کے ... مصر پیاری ... علی اکبر علی خاں کے دربار میں

بھی رہ چکے تھے۔ (ہندی ساہتیہ کا اتہاس از شکل، صفحہ ۳۴۶)

خود محمد شاہ بادشاہ دہلی متوفی ۱۱۶۱ھ ہندی زبان کا شاعر تھا۔ اس کی تصنیفات سے "بارہ ماسہ" اور "ویکٹ کہانی" اب موجود ہیں۔

اعظم خاں نے اس کے حکم سے "سنگار درپن" سمت ۱۸۸۶ بکرم میں تصنیف کی۔ آنند گھن شاعر مشہور محمد شاہ کا ملازم تھا۔ امیر خان محمد شاہی دیوی گوی کا مربی تھا۔ اسی عہد میں عالم، فیض، اکرم، غلام نبی اور انور خاں بھی ہندی شعرا کے زمرے میں منسلک تھے۔ فیض نے کیلاوتی کا سنسکرت سے دوبارہ ترجمہ کیا۔ ہندی بھگت مالا میں اس دور کے ہندی شعرا کے زمرہ میں رس خاں، شیخ نبی، میر احمد تاج خاں، اور پیرزادی کہانی بی کے نام بھی ملتے ہیں۔

(پنجاب میں اردو۔ صفحہ ۱۳)

محمد شاہ نے عربی زبان کی مستند کتاب "سلم [illegible]" کا ترجمہ ہندی میں کرایا اور اس پر ہزاروں روپے صرف کئے۔ اس بادشاہ کے دربار میں شاہ سدا رنگ کے علاوہ خواجہ میر درد جو اس وقت کے بڑے ممتاز صوفی اور صاحب سجادہ تھے، ہندی موسیقی میں اتنے بڑے استاد تھے کہ گویے اور کلاونت اپنی چیزیں اصلاح کے لئے پیش کیا کرتے تھے۔ یہی حال ان کے نواسے میر مہدی، تخلص کا تھا۔

جلال الدین شاہ عالم ثانی خود ہندی کے مایہ ناز شاعر تھے۔ ان کا کلام "نادرات شاہی" کے نام سے نواب رام پور کے زیر اہتمام شائع ہو چکا ہے۔ یہ کتاب اُس عہد کی صاف ستھری ہندی زبان کا قیمتی نمونہ ہونے کے سبب ہندی ادب میں نمایاں جگہ پانے کی مستحق ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاہ عالم کے زمانے میں ہندوؤں کے تعلقات حکومت سے نہایت خوشگوار محبت آمیز اور ہمدردانہ تھے قلعہ معلی میں اسلامی اور ہندوانہ رسمیں یکساں طور پر منائی جاتی تھیں اور بادشاہ کو ہندی ادب سے کمال دلچسپی تھی۔ شاہ عالم ثانی السنہ شرقیہ میں سے فارسی، اردو، ہندی اور پنجابی کی نظم و نثر پر قادر تھے۔ عربی، سنسکرت اور ترکی بھی جانتے تھے۔ ہندی اور اردو میں اُن کا تخلص آفتاب تھا۔ شاہ عالم تھا

نادراتِ شاہی کی خاص خوبی یہ ہے کہ بادشاہ نے اکثر نظموں کو راگ اور تال
میں باندھ کر شروع میں اُس راگ اور تال کا نام لکھوا دیا ہے جس سے کتاب موسیقی
والوں کے لئے بے دل چسپ اور مفید ہوگئی ہے ساتھ ہی یہ بھی روشنی پڑتی ہے کہ مسلمانوں
کو ہندی موسیقی سے حقیقی محبت تھی۔

ابو ظفر بہادر شاہ اُردو شاعری کے علاوہ ہندی کے بھی دلدادہ تھے اُن کے
کلیات کے آخر پر ہندی کلام کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ ان کے اُستاد حضرت ذوق ہندی موسیقی
کے ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ ہندی میں بھی شعر کہتے تھے۔ مغلیہ سلاطین کی بعض بیگمات بھی
ہندی میں شعر کہتی تھیں، جن کا ذکر حسبِ موقع آگے آئے گا۔

واجد علی شاہ اختر بھی ہندی میں شعر کہتے تھے اور ہندی شعروں میں اکھتر تخلص
کرتے تھے۔ آج کل بھی اُن کی ٹھمریاں مشہور ہیں۔ ان کے دربار میں بیسیوں ہندی کوی، قوال
اور مغنی پرورش پاتے تھے۔

ہندی شعر گوئی میں تو مسلمان حصہ لیتے ہی تھے، نثر نگاری میں اُن کی خدمات قابلِ داد
ہیں۔ چنانچہ میاں رونق، میاں ظریف، گلزار خاں، سید مہدی حسن، محمد علی ناخدا،
نے شاندار ہندی ناٹک لکھے ہیں۔ آغا محمد حشر کے ناٹک سور داس، گنگا وترن، بن دیوی
مدھر مرلی و آج بھی ملتے ہیں۔

دہلی کی مرکزی سلطنت سے علیحدہ ہو کر خود مختار اسلامی حکومتوں نے بھی ہندی
زبان کی خدمت میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔ چنانچہ شاہانِ بنگال نے بہت سی سنسکرت
کتابوں کے ترجمے بنگلہ زبان میں کرائے۔ نیز فارسی کتابیں بنگلہ قالب میں ڈھالی گئیں یہی سبب
ہے کہ ہندی کے مشہور شاعر ودیاپتی نے اپنے متعدد گیتوں میں مسلم فرزندانِ بنگال کی خدمت میں
عقیدت کے پھول پیش کئے ہیں۔ بنگلہ زبان کی مشہور کتاب "کرتی واس کی رامائن" کا وجود
مسلمانوں ہی کا مرہونِ منت ہے۔ مہا بھارت کا پہلا ترجمہ ناصر شاہ والیٔ بنگال (۱۲۸۲ء
تا ۱۳۲۵ء) کے حکم سے ہوا تھا۔

حسین شاہ (۱۴۹۳ء تا ۱۵۱۸ء) نے "مل دھر باسو" کو بھاگوت پران کا ترجمہ

کرنے پر مامور کیا۔ اس کے حکم سے پراگی کے بیٹے "چھتی خان" نے مہابھارت کے ایک حصے کا ترجمہ کیا۔ امیر خسرو کے بعد ہندوستانی موسیقی کا بہت بڑا محسن اور بہت بڑا ماہر جونپور کا سلطان حسین شرقی تھا جس نے موسیقی میں آٹھ نئے راگ اضافے کئے اور ہندی راگ راگنیوں کے تال میل سے نئی راگنیاں اختراع کیں۔ خیال جو دھرپد سے بہتر ہے، سلطان حسین ہی کا ایجاد ہے۔ اس نے دھرپد کی جگہ خیال کو رواج دیا۔

گجرات کا بادشاہ سلطان محمود شاہ بیگڑا ہندی نواز تھا۔ اس کے حکم سے وید واگ بھٹ کی طبی کتاب "اسٹانگ ہردی" کا فارسی میں ترجمہ ہوا اور نام "شفائے محمود شاہی" رکھا گیا۔

شاہانِ کشمیر میں سے سلطان زین العابدین (۸۲۳ھ تا ۸۷۵ھ) فارسی کے علاوہ سنسکرت اور ہندی کا بھی ماہر تھا۔ اس نے سنسکرت کی مشہور اور پرانی کتابوں کا ترجمہ فارسی میں کرایا، جیسے راماین، مہابھارت، پنچ تنتر، بھگوت گیتا وغیرہ۔ راجہ جے سنگھ کے عہد سے اپنے زمانے تک کا حال سنسکرت میں لکھوایا۔ سوم نامی ایک شخص نے جو کشمیری زبان کا شاعر تھا اور ہندی علوم میں بھی بے نظیر تھا "زین حرب" نام کی ایک کتاب لکھی جو سلطان کے حالات پر مشتمل تھی۔

ہندوستان کے قدیم فارسی لغت بحر الفضائل، مؤید الفضلا، شرف نامہ، اور ادات الفضلا میں مصنفین نے فارسی، عربی الفاظ کے معنی بیان کرتے ہوئے، اُن کے ہندی مترادفات بھی بیان کئے ہیں، جو اس امر کا بیّن ثبوت ہیں کہ ہندی الفاظ اُن دنوں کتنے ضروری اور اہم تھے۔ سلطنت بہمنیہ کی عام زبان دکھنی تھی، جو ہندی کی ایک شاخ ہے۔ حضرت خواجہ بندہ نواز اور سید محمد عبداللہ حسینی اسی زبان میں شعر کہتے تھے چنانچہ معراج العاشقین، ہدایت نامہ، عشق نامہ اور نشاط العشق نامی کتب ان کی یادگار ہیں۔ بہمنی بادشاہ سلطان محمد شاہ ثالث (۸۶۷ تا ۸۸۷ھ) کے عہد میں ملا نظیری فارسی کے شاعر تھے لیکن وہ ہندی میں بھی شعر کہتے تھے چنانچہ نمونہ ملاحظہ ہو:

دیکھ شیخ و برہمن نے کینا یار فراموش — ہمن تیں بھی فراموش ہے یار فراموش

(اُردوئے قدیم صفحہ ۳۲)

قدیم زمانے میں ہندی کو دکن میں دکنی اور گجرات میں گجراتی یا گجری کہتے تھے چنانچہ

شاہ برہان الدین جانم جو بیجاپور کے ایک قدیم مصنف ہیں اپنے رسالہ "حجت البقا" میں فرماتے ہیں :-

جیسے ہووے گیان بچاری تا دیکھیں بھاکا گجری

اہل گجرات نے نویں صدی کے وسط میں اس زبان میں تصنیف و تالیف کا کام شروع کر دیا تھا، چنانچہ اس زمانے میں شیخ باجن۔ سید گاؤں دھنی۔ دولت۔ شیخ خوب محمد چشتی، اور اسی فارسی کے علاوہ گجراتی یا گجری (جو ہندی کی ایک شاخ ہے) میں شعر کہتے تھے۔ اسی طرح شعرائے گول کنڈہ میں ملا وجہی۔ ملا غواصی۔ شاہ محمد جامی طبعی اور نوری وغیرہ شعرا، دکنی زبان میں شعر کہتے تھے۔ شاہ محمد جامی، سلطان محمد قلی قطب شاہ کے دربار میں رہتا تھا۔ اس نے کوک شاستر کتاب سنسکرت سے اخذ کر کے فارسی نظم میں لکھی تھی۔ (اُردوئے قدیم صفحہ ۶۶)

عادل شاہیہ دربار میں بھی ہندی زبان کو بہت کچھ دخل ۔ ا ہے۔ چنانچہ ابراہیم عادل شاہ نے سرود ہندی میں ایسا کمال پیدا کیا تھا کہ اس عہد کے تمام گویے اُسے "جگت گورو" کہا کرتے تھے۔ اس نے علم موسیقی میں ایک کتاب لکھی تھی جس میں سرود ہندی کے قواعد وضوابط نظم بند کئے تھے۔ اور اس کا نام "نورس نامہ" رکھا تھا۔ ملا ظہوری نے اس پر دیباچہ لکھا تھا جو آج بھی سہ نثر ظہوری کے نام سے مشہور ہے۔

"بساتین السلاطین" صفحہ ۳۴ میں لکھا ہے کہ علی عادل شاہ ثانی کے دربار میں نصرتی ہاشمی اور آتشی تین شاعر ایسے تھے جو فارسی کے علاوہ ہندی گو بھی تھے۔ حضرت میرانجی نے "دل ترنگ" اور "گل باس" دو چھوٹے چھوٹے رسالے ہندی میں لکھے ہیں۔

سنسکرت کی ایک کتاب "شکا سب تتی" ہے۔ اس کا ہندی نام "تنک بہتری"۔ مولانا ضیاء الدین بخشی بدایونی نے اس کا ترجمہ ۷۳۰ھ میں فارسی میں کیا ہے پھر اس ترجمہ سے آگے مختلف زبانوں میں درجنوں تراجم ہوئے۔ علاوہ ازیں دکنی شعراء میں سلطان تانا شاہ گول کنڈہ۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ گول کنڈہ۔ ملا قطبی دکنی بھی ہندی میں شعر کہتے تھے۔ بیجاپوری بھی ہندی میں شعر کہتے تھے

دورِ متوسط میں بھی سینکڑوں مسلمان شعرا نے ہندی میں دادِ سخن دی ہے جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں البتہ تذکروں سے بخوبی دیکھی جاسکتی ہے۔

دورِ حاضر میں متعدد مسلمان حضرات ہندی کی خدمت کر رہے ہیں۔ ان میں بعض حضرات ہندی موسیقی کے استاد اور دل دادہ ہیں۔ بعض ہندی، اردو اور فارسی تینوں زبانوں کے شاعر ہیں۔ مثلاً مولانا نجم آفندی۔ مولانا ماہر القادری۔ عظمت اللہ خاں۔ یوسف ہندی۔ محمد ابراہیم خلیل والئی ٹونک۔ سید امیر علی میر۔ بے دم وارثی۔ سید محمد عبداللہ کان پوری۔ سوامی مارہروی۔ نواب رضا علی خاں رام پور۔ حامد اللہ آبادی۔ سائل گوالیاری۔ آرزو لکھنوی۔ کیفی چڑیاکوٹی۔ خورشید چھنگوری۔ ظفر کیبور۔ عزیز سلطانی۔ نثار دھاردی۔ بزمی چڑیاکوٹی۔ جمال الدین جالی بیکل اتساہی۔ پروفیسر معین الدین احمد میرٹھی۔ موصوف نے اپنی زندگی کے بیش قیمت بیس سال سنسکرت کی تعلیم میں صرف کئے ہیں۔ آپ نے خلفائے عباسیہ کے چند نہایت دلچسپ قصوں کو عربی زبان سے سنسکرت میں ترجمہ کیا ہے اور ہندو مذہب کی سنسکرت کتابوں سے انتخاب کر کے ان کا ترجمہ مع متن انگریزی اور اردو میں شائع کیا ہے۔ طوالت سے بچنے کے لئے صرف اشارہ ہی کر دیا گیا ہے۔ ورنہ اس حقیقتِ حال کے اظہار کے لئے ایک دفتر بھی کافی نہیں۔ بہرکیف یہ امر مسلمہ و متحقق ہے کہ مسلمانوں کے فیضِ عام اور رواداری نے ہندی ادب کو ایک انتہائی وقیع اور رفیع مقام پر فائز کر دیا ہے۔

ہندی کے مسلمان شعراء

(۱) آپ بھرنش کال (قدیم ہندی کا دور)

سمنت ۶۰۰ بکرم سے سمنت ۱۰۵۰ بکرم تک

ابتدا میں اپ بھرنش کو دیش بھاشا ہی کہا گیا ہے۔ وکرم کی تیسری صدی میں بھرت منی نے اپنے گرنتھ میں عوام الناس کی بولی کو دیش بھاشا ہی کہا ہے۔ "ورا رچی" کے "پراکرت پرکاش" میں بھی اپ بھرنش کا نام نہیں ہے۔ اپ بھرنش نام پہلے پہل بلبھی کے راجہ "دھرا سین دوم" کے کتبوں میں ملتا ہے۔ جن میں اس نے اپنے پتا "گوہیہ سین" (جو ۵۹۳ء مطابق سمنت ۶۵۰ بکرم سے پہلے ہو چکا ہے) کو سنسکرت۔ پراکرت اور اپ بھرنش تینوں زبانوں کا شاعر کہا ہے۔ اسی زمانے میں "بھامہ" نے بھی تینوں زبانوں کا ذکر کیا ہے۔

راجہ ہرش ۶۰۰ عیسوی سے ۶۴۷ء مطابق (سمنت ۶۶۳ بکرم سے سمنت ۷۰۴ بکرم) کے درباری شاعر "بان" نے "ہرش چرتر" میں سنسکرت کے شعرا کے ساتھ بھاشا کے شعرا کا کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس طرح اپ بھرنش ہندی میں تصنیف و تالیف کا پتہ ہمیں چھٹی صدی عیسوی کے وسط اور ساتویں صدی عیسوی کے شروع میں ملتا ہے۔ اس دور کے تحریری نمونے بودھوں کی بجریان شاخ کے سدھوں کی لکھی ہوئی کتابوں میں ملتے ہیں۔

۹۳۳ء میں دیو سین نامی ایک جین مصنف گزرے ہیں۔ ان کی "شراوکاچار" اور "دوہا سو بھاو پرکاش" نامی کتابوں کا پتہ چلتا ہے۔ دونوں دوہوں میں لکھی ہوئی ہیں، اور ان

کی زبان اس زمانے کی مروجہ اَپ بھرنش ہے۔ علاوہ ازیں جَین کویوں کی اور بہت سی تصنیفات ملتی ہیں۔ مثلاً ''شرتی پنچمی کتھا''، ''یوگ سار''، ''جس ہرچریو''، ''اَنے کمار چریو'' وغیرہ۔

۹۶۲ء میں پشپ دنت کوی نے ''آدی پُران'' اور ''اُتر پُران'' نامی کتابیں چوپائیوں میں لکھیں۔ اسی زمانے میں ''یش دھر چرتر'' بھی چوپائیوں میں لکھی گئی۔ دسویں صدی عیسوی سے شروع ہو کر پٹھانوں کے آنے تک بجرایانی سِدھوں، تانترک یوگیوں۔ اور ناتھ پنتھی سادھوؤں کا دَور دورہ رہا ہے۔ اُن دنوں ''نالندا'' اور ''وکرم شلا'' نام کی دو یونیورسٹیاں علم وفضل کا مرکز تھیں۔ اِن سدھوں میں سب سے پرانے ''سرہا'' نامی سِدّھ ہیں۔ جن کا زمانہ ''ڈاکٹر ونے توش بھٹاچاریہ نے ۶۳۳ء مقرر کیا ہے اور گورکھ ناتھ کا زمانہ دسویں صدی کا آغاز مانا گیا ہے۔

''تاریخ شاہد ہے کہ محمد بن قاسم کے حملے اور سندھ کی فتح کے زیر اثر ۷۱۲ء میں سندھ اور ملتان کے علاقے میں مسلمان بس گئے تھے، جن میں سے کچھ صوفی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ گورکھ ناتھ کے چیلوں میں ہندو اور مسلمانوں دونوں قوموں کے لوگ ملتے ہیں۔ چونکہ ناتھ پنتھی یوگیوں کو اشاعت مذہب کے لئے مسلمانوں کو بھی مخاطب کرنا ہوتا تھا۔ اس لئے اُنھوں نے ایک سدھکڑی بھاشا کا آسرا لیا۔ جس کا ڈھانچہ کچھ کھڑی بولی لئے راجستھانی تھا۔ ان کتابوں میں پوجا اور تیرتھاٹن کے ساتھ ساتھ نماز اور روزہ وغیرہ الفاظ بھی ملتے ہیں۔ (دیکھئے کافر بودھ)

گیارھویں صدی کے شروع میں جین اچاریہ ہیم چندر نے ایک بڑھیاری ویاکرن گرنتھ ''سِدھ ہیم چند رشبدانشاسن'' گجرات کے راجہ سِدھ راج کے عہد میں لکھا۔ جس میں سنسکرت، پراکرت اور اَپ بھرنش تینوں کا استعمال کیا۔ مثالیں اَپ بھرنش میں دی گئی ہیں۔ اسی زمانہ میں پرمار خاندان کے راجہ منج اور بھوج (۱۰۱۸ عیسوی سے ۱۰۶۰ عیسوی تک) نے اَپ بھرنش کو بڑی ترقی دی۔ یہ دونوں بڑے عالم اور علم دوست تھے۔

۱۱۸۴ء میں ایک جین پنڈت ''سوم پربھ سوری'' نے ''کمار پال پرتی بودھ''

نامی کتاب نظم، نثر میں لکھی جس میں سنسکرت اور پراکرت کے علاوہ اپ بھرنش کے دوہے بھی آئے ہیں۔ انھیں دنوں "ودیاپتی" نے "کیرتی لتا" نامی کتاب اپ بھرنش میں، اور "پداولی" دیش، بھاشا میں لکھی، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس وقت دیش بھاشا اپ بھرنش کی جگہ لے چکی تھی۔

اپ بھرنش کال میں مندرجہ بالا ہندو شعرا کے علاوہ جناب قدر، قطب، اکرم فیض، سائیں، بنیا مسلمان شعرا کا نام قدیم تذکروں میں ملتا ہے۔ لیکن افسوس کہ ان کے حالات پردۂ اخفا میں ہیں اور کلام بھی نایاب و معدوم ہے۔ اس لئے نہیں کہا جاسکتا کہ اُن کی زبان کیا تھی؟ تاہم یہ یقینی ہے کہ اپ بھرنش کال میں ہونے کے سبب اُن کی شاعری اُس عہد کی پراکرت اور اپ بھرنش میں رہی ہوگی، اور اُسی نے رفتہ رفتہ ترقی کر کے موجودہ مہذب صورت اختیار کی۔

کتاب "عیون الاخبار" کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ شیعہ اسماعیلی مبلغین ۳۲۱ھ ہی سے تبلیغ اسلام کے لئے ہند میں آنے شروع ہوئے۔ علاوہ ازیں "مجالس المومنین" "راس مالا" کے گجراتی ترجمے "مراٗت احمدی"، "پریچنگ آف اسلام" ایسی کتابیں ہیں جن سے صاف طور پر عیاں ہوتا ہے کہ خلیفہ مصر امام مستنصر اللہ دکن میں اپنے مبلغ بھیجا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ "داعی ادریس" اپنی تصنیف میں لکھتے ہیں کہ بنی فاطمہ کے خلیفہ "امام معز الدین اللہ" اپنے مبلغین کو دہلی اور ہستناپور کی طرف بھیجا کرتے تھے۔

عیون الاخبار میں یہ بھی لکھا ہے کہ خلیفہ صاحب موصوف کا زمانہ (۳۴۱ھ تا ۳۶۵ھ) تھا۔ انھوں نے داعی حلم بن شیبان کو دہلی کی طرف روانہ کیا۔ جنھوں نے اپنی تبلیغ میں ہندی زبان کے الفاظ استعمال کئے۔ ان مبلغین کو بوہرے کہا جاتا تھا، اور یہ عقائد اسماعیلی کی تبلیغ کرتے تھے۔ ان میں شیخ احمد۔ عبداللہ۔ نورالدین۔ شیخ آدمی صفی الدین۔ اسماعیل بن عبدالرسول۔ یوسف بن سلیمان۔ جلال ہبتہ اللہ قابل ذکر ہیں۔

ظاہر ہے کہ ان علمائے مبلغین کو اپنی تبلیغ موثر بنانے کے لئے اس وقت کی اپ بھرنش زبان استعمال کرنی پڑتی ہوگی۔ ان کا کلام علمائے بوہرہ کی بیاضوں میں

پوشیدہ ہے جس کے شائع ہونے پہ قدیم ہندی بھاشا پر اچھی طرح روشنی پڑ سکتی ہے۔
چنانچہ بیبتہ اللہ کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔ دیکھئے اُنھوں نے کس طرح ہندی، عربی اور گجراتی زبان کو ملا کر پیش کیا ہے۔ ؎

پانی کنارے جا دیکھ بگلو جیہ جا پنکھ سمیٹی
یک پا لو تھی اور بھوو ہی لیوی بیوے آنکھ میچی
ہتو تھتی سراسر ڈھالینے مونڈی نیچی
ظاہرہ ملیح و باطنہ قبیح

مطلب۔ تو ندی کے کنارے جا کر دیکھ تجھے ایک ٹانگ اُٹھائے، پیروں میں اپنی چونچ چھپائے۔ آنکھیں بند کئے، گردن جھکائے خاموش کھڑا ایک بگلہ نظر آئے گا جو سادھو کی صورت بنائے ہوئے ہے۔ یاد رکھ اُس نے صرف شکار کے لئے یہ صورت بنا رکھی ہے یعنی اُس کا ظاہر اچھا اور باطن خراب ہے ؎

نارسیا تہ دیکھی نے گرچہ رُوپ، او پرمت رکھیے
رُوپ دیکھ مت لاوے کیا ترعیس کرے نت رکھیے

مطلب۔ اے انسان تو عورت کا ظاہری حُسن نہ دیکھ بلکہ اُس کی سیرت پر بھی غور کر، اگر روپ دیکھ کر گھر لایا اور وہ بد اخلاق ہے تو تیرے لئے بھجال ہے۔
مندرجہ بالا اشعار آپ بھرنش کال کی ہندی کا حقیقی نمونہ ہیں اور ظاہر کرتے ہیں کہ چوتھی صدی ہجری ہی میں ہندی وجود پذیر تھی۔

(۲)

ویر گاتھا کال

(رزمیہ شاعری کا دور)

(سمت ۱۰۵۰ بکرم سے سمت ۱۳۷۵ بکرم تک)

زمانے نے پلٹا کھایا اور روز گار اپنا رنگ لائی۔ سندھ اور مُلتان پر محمد بن قاسم کے حملے کے اثرات زبان پر پہلے ہی تھے، پھر ۹۹۶ء میں سبکتگین نے دو حملے پنجاب پر کئے اس کے بعد اُس کے بیٹے محمود غزنوی نے ۹۹۷ء سے ۱۰۲۵ء تک کے عرصے میں سترہ حملے پے در پے ہندوستان پر کئے۔ ۱۱۷۵ء سے ۱۱۸۲ء تک محمد غوری نے پنجاب۔ سندھ اور مُلتان پر قبضہ جما کر ۱۱۹۲ء میں تراوڑی کے مقام پر پرتھوی راج کو شکست دی اور ۱۱۹۴ء میں جے چند کو ہلاک کر کے قنوج فتح کر لیا۔ ہوسِ ملک گیری کی اس افراتفری اور دار و گیر کے عالم میں لوگوں کے خرمنِ امن و سکون پر خوف و ہراس اور اضطراب و یاس کی بجلی بلائے ناگہاں بن کر گری۔ اب کیا تھا۔ بزم رزم سے بدل گئی۔ ناقوس کی جگہ طبلِ جنگ نے چھین لی۔ معبد گاہوں کی رونق اسلحہ خانوں میں آگئی۔ راجپوت سوئے ہوئے شیر کی طرح انگڑائی لے کر اُٹھے اور اپنے بقائے نفس و سلطنت کے لئے اپنی تمام قوتِ مدافعت استعمال کرنی شروع کی۔ اس ضمن میں جہاں اور ذرائع استعمال کئے گئے، وہاں قلم سے تلوار کا کام لیا جانے لگا۔ ہر راجہ کے دربار میں بھاٹ۔ چارن۔ سیوگ۔ پنچولی۔ خوجی۔ مُطرب اور رجز خواں جمع ہو گئے۔ مذہبی، روحانی اور فلسفیانہ شاعری کی جگہ رجز خوانی اور رزم گوئی شروع ہو گئی اور راجاؤں کی شجاعت، رِجال بازی کے قصّے [illegible] کی فضا نے جوش و

خروش کے ساتھ بیان کر کے لوگوں میں نئی روح پھونکی جانے لگی۔ یہ رزمیہ فضا اصناف سخن میں بھی دوہا اور چوپائی سے آگے بڑھ کر گیت۔ سوَیا۔ تروٹک۔ شاردول۔ چھپا وغیرہ متعدد چھندوں پر محیط ہو گئی۔ رزمیہ کتابیں لکھی جانے لگیں جو عام طور پر دو قسم کی ہیں۔

۱۔ پربھند کاویہ یعنی مثنویات، ۲۔ گیت کاویہ یعنی نغمات موسیقی۔

مثنویات میں سب سے پہلی اور اہم کتاب "کھمان راسو" ہے، جو "دلپت وجے" نامی شاعر کی تصنیف ہے۔ اس میں سورج بنس کے سرتاج شری رام چندر جی سے لے کر مہارانا پرتاپ تک کا مختصر حال اور چتوڑ کے مہارانا کھمان دوم کے بہادرانہ کارناموں کا مفصل حال درج ہے۔

دوسری اہم کتاب "بسیل دیو راسو" ہے جو "نرپتی نلسیہ" کی تصنیف ہے۔ اس میں اجمیر کے مہاراجہ وگرہ راج چہارم عرف بسیل دیو کا حال درج ہے۔ یہ مثنوی ۱۱۵۵ء میں لکھی گئی۔

تیسری اہم ترین مثنوی "پرتھوی راج راسو" ہے، جو چند بردائی کی تصنیف منیف ہے۔ اس میں پرتھوی راج چوہان کے ہنگامہ آرا اور لرزہ خیز جنگی کارنامے، اس کی فوق الفطرت جرأت و جسارت کے قصے مذکور ہیں۔

تاریخ ہند میں چند بردائی اور پرتھوی راج کو جو اہمیت اور جو اعزاز حاصل ہے محتاج بیان نہیں۔ ان میں اگر ایک خدنگ افگنی کے کمال دکھاتا ہے تو دوسرا جیخ صحافت کا ماہتاب نور انتساب ہے۔ پھر اس پر طرہ یہ کہ دونوں کی تولید و رحلت کی ساعت ایک۔ غور و پرداخت ایک۔ یہاں تک کہ تن و توش اور شکل و صورت بھی ایک۔ گویا بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک ہی ساعت اور ایک ہی برج میں شمس و قمر کا اجتماع وقوع پذیر ہوا ہے۔

چند بردائی ہندی کے سب سے پہلے بلند پایہ رزم گو شاعر مانے جاتے ہیں۔ بعض محققین پرتھوی راج راسو کو چند بردائی کی اصلی تصنیف نہیں مانتے لیکن یہ بحث ہمارے موضوع سے تعلق نہیں رکھتی۔

مندرجہ بالا رزمیہ مثنویوں کے علاوہ جے چند پرکاش۔ آلہا کھنڈ۔ ان لچھن پرمان راسو۔ وجے پال راسو اور ہمیر راسو وغیرہ رزمیہ مثنویاں لکھی گئیں۔ ان تصنیفات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ جوں جوں دَور ختم ہوتا جا رہا ہے زبان نکھتی جا رہی ہے۔ اس نکھار کا پتہ دینے والے دلّی کے امیر خسرو۔ ترہت کے ودیاپتی اور ملّا داؤد ہیں۔

جس طرح کھڑی بولی دلکش بھاشا کا صاف شستہ نمونہ امیر خسرو کے گیتوں اور شعروں میں ملتا ہے، اُس طرح پوربی بھاشا کا نکھرا ہوا نمونہ ودیاپتی کی پداولی میں ملتا ہے۔ ویر گاتھا کال اصل میں مہاراجہ ہمیر ہی کے عہد تک سمجھنا چاہئے۔ اس کے بعد لوگوں کے خیالات اور رجحانات تبدیل ہونے لگے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ہمیر کے بعد کوئی رزمیہ نظم نہیں لکھی گئی بلکہ وقتاً وقتاً پر اس قسم کی کئی کتابیں لکھی جاتی رہیں۔ ہندی ادب میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ کسی زمانے میں کوئی بھی طرزِ سخن ایجاد ہوئی تو آگے چل کر اُس کا اثر کم ہو گیا ہو لیکن بالکل معدوم نہیں ہوا۔ کسی نہ کسی صورت میں اپنی جھلک دکھاتا رہا بہر کیف اس رزمیہ دَور میں حسب ذیل مسلمان شعرا ہوئے۔

۱۔ خواجہ مسعود ابن سعد سلمان

آج تک امیر خسرو کو ہندی کا پہلا مسلمان شاعر سمجھا جاتا تھا۔ لیکن جدید تحقیق کے مطابق امیر خسرو سے سو سال پہلے ہندی کے مسلمان شعرا کا سراغ ملتا ہے۔ چنانچہ متقدمین و متاخرین متفقاً کہتے ہیں کہ مسلمانوں میں ہندی شعرا کے سرتاج اور پہلے صاحب دیوان شاعر خواجہ مسعود سعد سلمان المتوفی ۵۱۵ھ ہیں۔ ان کا ہندی کلام اگرچہ دستبرد زمانہ سے محفوظ نہیں رہا، لیکن ہندی میں بارہ ماسہ سب سے پیشتر اُن ہی نے لکھا ہے۔ ان کے ہندی دیوان کی نسبت تذکرہ نگاروں نے صاف طور پر اقرار کیا ہے۔ چنانچہ محمد عوفی لکھتا ہے:

"و را او را سہ دیوان است یکے بتازی و یکے بپارسی و یکے بہندوی"

(لباب الالباب محمد عوفی، صفحہ ۲۴۶ جلد دوم)

عوفی کے علاوہ امیر خسرو بھی فرماتے ہیں

"پیش ازیں از شاہانِ سخن کسے را سہہ دیوان نہ بود مگر مرا کہ خسرو ممالک کلام مسعود سعد سلمان را اگرچہ ہست۔ امّا آں سہہ دیوان در عبارتِ عربی و فارسی و ہندوی است۔ در پارسی مجرد کسے سخن را سہہ قسم نہ کردہ جز من کہ دریں کار قسام و عادلم" (دیباچہ غرۃ الکمال صفحہ ۶۶)

"ان کی ولادت بمقام لاہور تخمیناً پانچویں صدی ہجری کے آخر میں ہوئی باپ کا نام سعد سلمان تھا جو شاہ غزنی کی طرف سے لاہور اور دوسرے مقامات میں بہت سی جائداد کا مالک تھا۔ اس کے مرنے پر لوگوں نے از راہِ ظلم مسعود سے یہ جاگیر چھین لی جس کی دادخواہی کے واسطے وہ غزنی پہنچا۔ وہاں اس کے دشمنوں نے غلط الزامات لگا کر اُس کو قید کرا دیا۔ اُس نے سلطان ابراہیم شاہِ غزنی کی مدح اور اپنی تکالیف کے اظہار میں قصیدہ لکھا اور قید سے رہائی پائی۔ ۵۱۵ھ مطابق ۱۱۲۱ء میں وفات پائی"

(قاموس المشاہیر جلد دوم صفحہ ۲۱۴)

۲۔ بابا فریدالدین گنج شکر رح

"شیخ فریدالدین ہندوستان کے مشہور اولیاء کرام سے تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاء کے پیر تھے ان کے والد شیخ جلال الدین سلیمان فرخ شاہ کابلی کی اولاد میں فاروقی شیخ تھے۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مرید و خلیفہ تھے اور شیخ سعدالدین حمویہ، سیف الدین معرزی اور بہاء الدین ذکریا کے ہمعصر تھے ۱۱۷۳ء مطابق ۵۶۹ھ میں پیدا ہوئے تھے اور سنیچر کے دن ۱۷ اکتوبر ۱۲۶۵ء مطابق ۵ محرم ۶۶۴ھ کو ۹۴ برس کی عمر میں وصال ہوا۔ آپ کا مزار جودھن (پنجاب) میں ہے جو اب ضلع منٹگمری میں پاک پٹن کے نام سے مشہور ہے۔ آپ کا سالانہ عرس ۵ محرم کو ہوتا ہے۔ آپ کی ریاضتیں مشہور ہیں۔ مدتوں ایک کاٹھ کی ٹکیا پیٹ کو باندھکر صرف نمک کی ایک ڈلی اور ایک پیالہ بھر پانی پر قناعت کی ہے۔ شیخو پورہ ضلع بدایوں میں آپ کی

اولاد اس وقت موجود ہے۔" (قاموس المشاہیر جلد دوم صفحہ ۱۲۴)

آپ کا ہندی کلام بہت زیادہ ہے۔ اس کا کافی حصہ سکھوں کی مقدس کتاب شری گرو گرنتھ صاحب میں درج ہے۔ آپ کے ہندی کلام میں فارسی کے الفاظ بھی جا بجا آ گئے ہیں۔ کیوں کہ آپ کی مادری زبان فارسی تھی اور ہندی کا ابتدائی دور تھا۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

اسا کیہڑی بھی سو ریت | جاؤں نا ئے گہر جاؤں میت

فریدا رتی رت نہ نکلے جے تن چیرے کوئے | جو تن اتے رب سیاں تن تن رت نہ ہوئے

فریدا کوٹھے منڈپ ماڑیاں سارے بھی گئے | کوڑا سودا کر گئے گورے آئے پئے

فریدا دوہوں دیئے بلندیاں ملک بہہ تھائے | گڑھ لیا گھٹ لٹیا دیوے گیا بجھائے

برہا برہا آکھئے برہا تو سلطان | فریدا جتن برہا نہ اپجے سو تن جان مسان

فریدا بھوم رنگا ولی منجھ وسولا باگ | جو جن پیر نوازئیے تناں آنچ نہ لاگ

۴۔ شیخ نظام الدین اولیاء

آپ کا لقب سلطان المشائخ ہے۔ آپ کے والد کا نام سید احمد صاحب تھا جن کا مزار شہر بدایوں سے بجانب شمال دو فرلانگ کے فاصلے پر ہے۔ شیخ صاحب کے جد امجد بخارا سے تشریف لائے تھے شیخ صاحب کی ولادت ۶۳۶ھ ۱۲۳۸ء مطابق صفر ۶۳۴ھ میں بمقام بدایوں ہوئی۔ پانچ برس کی عمر میں یتیم ہو گئے۔ آپ کی تعلیم و تربیت آپ کی والدہ محترمہ نے کی۔ علوم ظاہری حاصل کر چکنے کے بعد علوم باطنی کی تحصیل کے لئے پاک پٹن شیخ صاحب دل میں جا کر بابا فرید

گنج شکر کے مرید ہوگئے۔ آپ اپنے زمانے کے درویش کامل تھے۔ ۳ اپریل ۱۳۲۵ء مطابق ۱۸ ربیع الاول ۷۲۵ھ کو بمقام دہلی انتقال ہوا۔

شیخ صاحب ہندی موسیقی سے اچھی طرح واقف تھے، یہاں تک کہ سنسکرت کے نغمات سننے کا شوق بھی تھا۔ ان کا ہندی کلام باوجود تلاش کے دست یاب نہیں ہو سکا۔ البتہ حافظ محمود شیرانی یوں فرماتے ہیں:-

"شیخ فریدالدین مسعود متوفی ۶۶۴ھ۔ شیخ نظام الدین اولیا متوفی ۷۲۵ھ۔ امیر خسرو متوفی ۷۲۲ھ۔ شیخ شرف الدین بوعلی قلندر پانی پتی، متوفی ۷۲۴ھ انھوں نے شیخ نظام الدین اولیا سے ہندی دوہوں میں مشاعرات کئے ہیں۔" (پنجاب میں اردو صفحہ ۱۴۱)

۴۔ شیخ بہاءالدین ذکریا ملتانی

آپ کی ولادت ۵۶۵ھ مطابق ۱۱۷۰ء بمقام کوٹ کروڑ، ضلع ملتان ہوئی۔ والد کا نام شیخ وجیہہ الدین قریشی تھا۔ تعلیم کے بعد بغداد کا سفر کیا اور شیخ شہاب الدین سہروردی کے مرید ہوئے۔ پھر ملتان واپس آکر بابا فریدالدین شکر گنج حاضر باشوں میں شامل ہو گئے۔ سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں ۷ نومبر ۱۲۶۶ء مطابق ۷ صفر ۶۶۵ھ بمقام ملتان وفات پائی۔

آپ ہندی شاعری کے علاوہ ہندی موسیقی میں مہارت کامل رکھتے تھے۔ چناں چہ ملتانی دھناسری ان ہی کی ایجاد ہے۔ ہندی موسیقی کی تہذیب و ترقی کے علاوہ ہندی شاعری کو بھی خاص ترقی دی۔

افسوس کہ آپ کا کلام دست برد زمانہ کی نظر ہو گیا۔ درحقیقت یہ اہل اللہ لوگ یا اہل اللہ بزرگ اپنے کلام کو محفوظ بھی نہیں رکھتے تھے۔

۵ - امیر خسروؒ

امیر خسروؒ جس طرح عربی فارسی کے جیّد عالم، بے نظیر ادیب اور صاحب فن شاعر تھے، اسی طرح ہندی میں بھی یگانۂ روزگار ہو چکے ہیں۔ خاک ہند اب تک ان ایسا صاحب کمال انسان پیدا نہیں کر سکی۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ فارسی تو اُن کے احسان سے گراں بار تھی ہی، ہندی بھی اُنہی کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوئی۔ یہ ہندوستان کے نہایت مشہور صوفی شاعر تھے۔ ان کا لقب "طوطیٔ ہند" تھا۔ ان کے والد سیف شمسی الملقب بہ امیر محمود سیف الدین لاچین قوم کے ترک تھے۔ جو بلخ سے ہندوستان آئے۔

امیر خسروؒ پٹیالی، ضلع ایٹہ میں ۱۲۵۳ء مطابق ۶۵۱ھ میں پیدا ہوئے۔ ۸ سال کی عمر میں سایۂ پدری سر سے اُٹھ گیا۔ تعلیم و تربیت ان کے نانا عماد الملک نے کی۔ ۹۹ کتابیں آپ کی تصنیف کہی جاتی ہیں۔ جن میں سے زیادہ حصہ معدوم ہے۔ برج بھاشا میں بھی اُنھوں نے بہت کچھ لکھا۔ آپ سنسکرت بھی جانتے تھے۔ آپ کے اشعار کی تعداد چار پانچ لاکھ بیان کی جاتی ہے۔ بہت سی پہیلیاں۔ دوسخنے۔ مکرنیاں آپ کی طرف منسوب ہیں۔ فن موسیقی میں بھی اچھا دخل تھا۔ بہت سے نئے گیت ایجاد کئے۔ ستار میں اکثر نئی باتیں پیدا کیں۔ قوالی کو ایک خاص قاعدے پر قائم کیا۔ اُنھوں نے برج بھاشا اور کھڑی بولی کو ایسی روانی، سلاست اور سادگی سے استعمال کیا کہ آج تک ان کے ارشادات لوگوں کی دل کشی، دلچسپی اور دل پذیری کا موجب ہیں۔ اُنھوں نے سُلطان غیاث الدین بلبن کے عہد سے سُلطان محمد تغلق کے عہد تک گیارہ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا ان میں سے سات بادشاہوں کی ملازمت بھی کی۔

تقی اوحدی نے اپنے تذکرہ (جو ۱۰۲۴ھ میں تمام ہوا) میں لکھا ہے کہ حضرت امیر خسرو کا ہندی کلام فارسی کلام سے بہت زیادہ ہے۔ لیکن اوحدی کا یہ بیان اس وقت ایک افسانہ معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ زمانے کے ناقدر شناس ہاتھوں نے اس تمام

ذخیرے کو تباہ کردیا۔ تھوڑا سا حصہ جو زمانے کی دستبرد سے بچ گیا ہے، وہ بھی پردۂ اخفا میں ہے۔ امیر خسرو سے متعلق ڈاکٹر اسپرنگر کا ایک مضمون ۱۸۵۲ء میں شائع ہوا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ شاہان اودھ کے کتب خانوں میں امیر خسرو کے دو سو جیبیاں موجود تھے، اور اُن کے علاوہ ایک مجموعہ میں متفرق کلام جمع تھا، جس میں فارسی غزلیں اور مکرنیاں تھیں۔ آپ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مرید تھے، ان سے دلی عقیدت رکھتے تھے۔ جب ۱۳۲۴ء میں نظام الدین اولیاؒ کا انتقال ہوا تو آپ پر زبردست اثر پڑا اور اسی غم میں اپنے مرشد کے چھ ماہ بعد دنیا سے رخصت ہو گئے۔ تاریخ وفات ۱۹ ذیقعد ۷۲۵ھ ہے۔ حیرت ہے کہ حافظ محمود شیرانی نے اپنی تصنیف "پنجاب میں اردو" میں ان کی تاریخ وفات ۷۲۲ ہجری لکھی ہے جو قطعاً غلط ہے۔

روایت ہے کہ دنیا سے رخصت ہوتے وقت یہ دوہا امیر خسرو کی زبان پر تھا:

گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈالے کیس
چل خسرو گھر آپنے رین بھئی چہو دیس

یعنی خواجہ نظام اولیاؒ نے اپنا منہ اس دنیا سے چھپا لیا ہے جس کی وجہ سے اب میرے لئے دنیا میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے چونکہ اب محبوب خدا کو دیکھنا ہی نصیب نہ ہوگا۔ اس لیے ایسی دنیا سے اپنے اصلی گھر (عالم آخرت) کو چلنا چاہیئے۔ نمونہ کلام ہندی:

خسرو رین سہاگ کی جاگی پی کے سنگ — تن میرو من پی او کو، دوأو بھئے اِک رنگ

وہ گئے بالم وہ گئے ندیو کنار — آپے پار اُتر گئے ہم تو رہے اروار
بھائی رے ملاحو ہمکوں پار اُتار — ہاتھ کا دیوونگی مُندرا گل کا دیووں ہار

بابل بھئی ونج کوں تاندا کو بھول — ہو پچھا ونج وہاجیا نہ لاہا نہ مول

چکور چکوی دو جنے ان کو مار نہ کوئے — اوہ مارے کرتار کے رین بچھوڑی ہوئے

چیستان خربزہ

دس ناری کا ایک ہی نر — بستی باہر واکا گھر
پیٹھ سخت اور پیٹ نرم — منھ میٹھا تا شیر گرم

نمونہ ہندی اور فارسی ملا کلام

شبان ہجراں دراز چوں زلف و روز وصلت چو عمر تاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں، تو کیسے کاٹوں اندھیری تیاں
یکایک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں

۶ — باجن گجراتی

آپ کا نام شیخ بہاء الدین۔ باجن تخلص اور گجرات وطن ہے۔ آپ مشاہیر اولیا میں سے ہیں۔ آپ کے والد کا نام معز الدین ہے۔ ۷۹۰ھ میں پیدا ہوئے مشہور محدث شیخ علی المتقی کے حضرت اور شیخ عبداللہ متوکل کے مرید تھے۔ آپ نے کچھ مدت سیاحی بھی کی تھی۔ عرب و ایران کی سیاحت سے واپس آکر اپنے پیر کے فرزند شیخ رحمت اللہ متوکل کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اور اُن کی وفات کے بعد ۷۹۹ھ کے قریب خاندیس میں آکر بمقام برہانپور مقیم ہو گئے اور اسی جگہ ۱۲۲ سال کی عمر میں ۱۴ ذی قعدہ ۹۱۲ھ کو انتقال کیا۔ آپ فارسی اور ہندوی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ نمونہ کلام:

یوں باجن باجے رے اسرار چھاجے رے
سنڈل من میں دھمکے — رباب رنگ میں جھمکے
صوفی اُن پر ٹھمکے — یوں باجن باجے رے
اسرار چھاجے رے

بھونرا لیوے پھول رس، رسیا ہوئے باس — باجن پہنچے آس کو بھونرا کھڑا اُداس

نہ ان جنیا نہ وہ جا بیا   نہ وہ مائی باپ کھلایا
باجن سب ان آپ نہ پایا   پرگٹ ہو پر آپ لگایا

باجن کسی سر کھیا نہیں اُس سر کیہا نہیں کیجے   جیسا کوئی من منہ جینت ویسا بھی نہ ہوبے

باجن کوئی نہ جانے وہ کد تھا اوکد تھے پرگٹ ہوا
وہی جانے آپ کون جب تھے پرگٹ ہوا

۷۔ سیّد بھیکہ جائسی

امیر خسرو کے زمانے سے پہلے بارھویں صدی عیسوی میں جائس کے مسلمانوں کی زبان میں ہندوستانی زبان کا اثر پڑا ہر یہ سنتا ہے کہ جائس کے اُس زمانے کے رئیس کا نام سیّد بھیکہ تھا۔ سنا ہے کہ بھاشا زبان کے بھی شاعر تھے۔ کلام موجود تھا۔ مگر ۱۹۲۵ء کی طوفانی بارش میں ضائع ہو گیا۔ (از بیاض جناب جہ جائسی مرحوم)

مولانا میر غلام علی آزاد بلگرامی اپنے تذکرہ "ماثر الکرام موسوم بہ سرو آزاد" دفتر ثانی صفحہ ۳۵۹ / ۳۶۰ پر ہندی شاعر دیوان سید رحمت اللہ کے ذکر میں دیوان سید بھیکہ کا ذکر بڑی تفصیل اور احترام سے کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

"دیوان سید بھیکہ از عظمائے عہد بود در سخاوت و شجاعت و مروت و بہ خلقی شہرۂ روزگار می زیست در فصاحت صوری ناز و جاہ معنوی فراہم داشت در سرکار نواب احتشام خاں و نواب محتشم خاں عالمگیر شاہی و نواب مرتضیٰ خاں والا شاہی عالمگیری صاحب اعتبار و معتمد الاقتدار بود"

۸۔ شیخ شرف الدین ابو علی قلندر پانی پتی

شیخ شرف الدین نام۔ کنیت ابو علی۔ لقب قلندر۔ سلطان غیاث الدین تغلق شاہ کے

عہد میں ایک بزرگِ کامل تھے۔ بادشاہ نے اپنے فرزند شاہ مبارک خاں کو جو نہایت حسین و جمیل تھے شیخ کے سپرد کر دیا تھا اور شیخ اُس سے بے حد اُلفت رکھتے تھے۔ ان کے والد ماجد عراق سے ہندوستان آئے تھے اور پانی پت میں سکونت اختیار کی تھی۔ یہاں شیخ کی ولادت ہوئی۔ والدہ کا نام بی بی حافظہ تھا۔ ۹ رمضان المبارک ۷۲۴ھ کو ۱۲۲ سال کی عمر میں واصل بحق ہوئے۔ (قاموس المشاہیر حصہ اول صفحہ ۵۴)

انھوں نے شیخ نظام الدین اولیا سے ہندی دوہوں میں مشاعرات کئے ہیں اور مبارز خاں کے ارادۂ سفر کے وقت ذیل کا ہندی دوہا اُس کے ترجمہ فارسی کے ساتھ خاں کے پاس بھیجا تھا ؎

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے

بدھنا ایسی رین کر بھور کبھو نہ ہوئے

شعرِ فارسی ؎

من شنیدم یارِ من فردا ارادہ داشتہ
یا الٰہی تا قیامت برنیاید آفتاب

(پنجاب میں اردو صفحہ ۱۴)

حضرت گلچین کرنالی نے قلندر صاحب کے حالات پر ایک کتابچہ چالیس صفحہ اردو مشن ملتان سے شائع کیا ہے۔ اِس میں تین دوہے ہندی کے ہیں۔ اِن میں ایک دوہے کے متعلق شبہ ہے کہ یہ فی الواقع شاہ قلندر کا ہے یا کسی اور کا۔ دوہا یہ ہے ؎

پوتھی پڑھی پڑھی پنڈت بھیا نہ کوئے
ایک اچھر پریم کا پڑھے سو پنڈت ہوئے

یہ کبیر کا مشہور دوہا ہے۔

("ہماری زبان" ۸ نومبر ۱۹۶۷ء صفحہ ۱۲)

"ہندی موسیقی کی تہذیب و ترقی میں بھی اُنھوں نے بڑا حصہ لیا ہے۔"

(دیباچہ فرہنگ آصفیہ)

۹ - حضرت شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری

آپ ہندوستان کے مشاہیر اولیا میں سے ہیں۔ ۶۶۱ھ میں پیدا ہوئے۔ لہٰذا میں نظام الدین اولیا کے مرید ہونے کی نسبت سے ۶۹۰ھ میں دہلی آئے اور شیخ صاحب کے انتقال کی خبر سن کر شیخ فردوسی کے مرید ہو گئے۔ وہاں سے بہار میں جا کر مدتوں کوہ راجگیر میں عبادت اور ریاضت میں مشغول رہے ۷۸۲ھ میں وفات پائی۔ آپ فارسی کے علاوہ ہندی میں بھی شعر کہتے تھے۔ شرف تخلص کرتے تھے۔ آنکھ کے درد کے لئے آپ کا یہ نسخہ بہت مشہور ہے ؎

لودھ پھٹکری مرداسنگ	ہلدی زیرہ اِک اِک ٹنگ
افیون چنا بھر مرچیں چار	اُڑد برابر تھوتھا ڈار
پوست کے پانی پوٹلی کیجے	تُرت پیڑ نینوں کی ہرے

آپ کے فال نامے بھی بہت ہیں، جو ہندی میں لکھے ہیں۔ ایک فال نامہ ملاحظہ ہو ؎

دس چار چھ اگم آوے	آٹھ پانچ پہل مانگے آوے
نوین اگیارہ پہنچے رانج	نو سو سترہ کرے اکاج

دوہے اور شعر ملاحظہ ہوں ؎

شرفا گور ڈرانی مس اندھیاری رات	واں نہ پوچھے کوئی کون تمہاری جات
کالا ہنسا نہ ملا بسے سمندر تیر	پنکھ پسارے بکھ ہرے نرمل کرے سریر
شرف حرف مایل کہیں درد کچھو نہ بسائے	گرد چھوئیں در بار کی سو درد دور ہو جائے

(بہار، اور اردو شاعری صفحہ ۱۲)

۱۰۔ شیخ علی متقی، جون پوری

آپ کا نام شیخ علی متقی اور وطن جون پور تھا۔ ہندوستان کے بلند پایہ عالم گزرے ہیں۔ آپ کا مشغلہ درس و تدریس تھا۔ گجرات کے فرماں رواؤں کو آپ سے بہت عقیدت تھی۔ آپ ہندوستان سے ترکِ سکونت کر کے مکہ شریف چلے گئے تھے۔ لیکن کبھی کبھی ہندوستان تشریف لایا کرتے تھے۔ آپ کا انتقال مکہ شریف میں ہوا۔

آپ کو ہندی زبان اور اُس کی شاعری سے خاص اُنس تھا۔ کلام صوفیانہ ہوتا تھا۔ لیکن افسوس کہ دستِ بُردِ زمانہ نے یہ کلام برباد کر دیا۔ بڑی تلاش سے صرف ایک شعر نصیب ہوا، جو درج ذیل ہے ؎

سُن سہیلی پریم کی باتا ۔ یوں مل رہے جیوں دُودھ بتاتا

۱۱۔ ابوعبداللہ النکتی

یہ مسعود سعد سلمان کے ہم عصر ہیں جو سلطان ابراہیم (۴۹۲ھ تا ۵۱۵ھ) کے زمانے میں گزرے ہیں۔ فارسی اور ہندی میں شعر کہتے تھے۔ انھوں نے اپنے ہندی کلام کے دو دیوان بھی مرتب کیے تھے۔

(عوفی، جلد دوم صفحہ ۲۴۶)

(ہفت اقلیم در تحت لاہور)

۱۲۔ شاہ سلیمان

زمانہ قدیم میں بمقام نصیر آباد (جسے چھوٹا جائس کہا جاتا ہے) میں بھاشا کے شاعر گزرے ہیں۔ روضہ شاہ سلیمان قصبہ کے اندر موجود ہے۔ مگر آپ کا کلام نایاب ہو چکا ہے۔ (از بیاضِ مہر جائسی مرحوم)

۱۴۔ ابوریحان محمد بن البیرونی

تاریخ شاہد ہے کہ محمود غزنوی خود بڑا عالم اور اہلِ علم کا قدر دان تھا۔ چناں چہ "ابوریحان محمد بن احمد البیرونی" ایسا ریاضی داں، جیوتشی اور سنسکرت زبان کا قادر الکلام مصنف (جس نے ہندوؤں کے مذہب، فلسفہ اور تمدن کا خود مطالعہ کیا اور اس باب میں کتابیں لکھیں، نیز کئی سنسکرت کتابوں کا ترجمہ کیا) اس کے دربار کی زینت تھا۔

البیرونی ملک خوارزم میں بمقام شہر بیرون ۹۷۱ء میں پیدا ہوئے۔ مباحث علمی پر ایک سو سے زیادہ کتب اس فاضل شخص نے تصنیف کیں، جن میں سے اکثر نایاب ہیں۔ سلطان محمود غزنوی کے ہندوستان پر لشکر کشی کے زمانے میں البیرونی ہندوستان ہی میں موجود تھے۔ یہاں رہ کر سنسکرت کے عالم ہوئے اور کتاب الہند تصنیف کی جو اہلِ ہند کے فلسفہ، ہیئت اور تاریخ پر مشتمل ہے اور جس سے قابل مصنف کی انصاف پسندی اور بے تعصبی ظاہر ہوتی ہے۔ البیرونی کو مسلمانوں کا ارسطو سمجھنا چاہئے۔ حال میں آپ کی سوانح عمری زبانِ اُردو میں انجمن ترقی اُردو نے شائع کی ہے۔ ۴۳۰ھ مطابق ۱۰۳۹ء میں انتقال ہوا۔ علم اقلیدس، ہیئت، تاریخ، ادب اور منطق میں کامل دستگاہ تھی۔ علم معقول اور فنِ طلسمات میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ (قاموس المشاہیر جلد اول صفحہ ۴۶)

سنسکرت کے ساتھ ہندی کے بھی ماہر تھے مگر اب ان کا ہندی کلام معدوم ہے۔

اس دور میں کھوماں۔ خطب علی سائیں، فیض اور اکرم کے نام بھی ملتے ہیں۔ اکرم اور فیض کا زمانہ سمت ۱۲۰۵ بکرم سے سمت ۱۲۵۸ بکرم ہے۔ (پنجاب میں اُردو صفحہ ۱۲۱)

فیض غالباً محمد معظم فیض ہیں جو فارسی اور ہندی کے زبردست شاعر تھے اور سنسکرت کے بھی فاضل تھے۔ انھوں نے لیلاوتی کا سنسکرت سے دوبارہ ترجمہ کیا ہے۔ ڈیڈوانہ کے رہنے والے ہیں اور قائمخانیوں کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا زمانہ عہدِ محمد شاہی ہے۔ (پنجاب میں اُردو صفحہ ۱۱۹)

۳۔ بھگتی کال

(عبادت و تصوّف کا دور)

(سمت ۱۳۷۵ بکرم سے سمت ۱۷۰۰ بکرم تک)

ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت مستحکم ہو جانے پر ہندو رعایا کے شکست خوردہ دل میں وہ جرأت، وہ جسارت، وہ حوصلہ، وہ ولولہ، وہ جوش و خروش وہ ہوش مہلک گری اور وہ جذباتِ جدال و قتال نہ رہے۔ اگر کہیں دُھن کے پکے، بات کے دھنی، اور اپنی ضد پر قائم رہنے والے مُٹھی بھر انسان تھے بھی تو حکومت کے خلاف زبان کھولنے کی ہمت نہ رکھتے تھے۔ اس عالم مجبوری و معذوری میں انھیں سوائے حاکم کُل کے اور کوئی سہارا سُجھائی نہ دیتا تھا۔ اس لئے یہ لوگ مذہب کی طرف جھک گئے۔ مہذّب و تعلیم یافتہ طبقہ نے تو بھگتی اور اپنا شیوہ بنایا، لیکن عوام بجز اپنی سِدھوں اور ناتھ منپتھی یوگیوں کے زیرِ اثر منتر تنتر اور بھوت پریت کی پرستیوں میں اُلجھ گئے۔ بھگتی کا سیلاب ایسا اُمنڈا کہ اس میں ہندو تو در کنار مسلمان بھی دوش بدوش بہہ گئے۔ چنانچہ مسلمانوں میں خدارسیدہ اور بزرگ صوفیوں نے اور ہندوؤں میں ان کے فراخ دل اور فلسفی بزرگوں نے اپنی اپنی قوم میں رواداری کا جذبہ پیدا کیا۔ انھوں نے بنی نوعِ انسان کو محبت، آشتی، یگانگی اور صلح کا پیغام دیا، اور دونوں قوموں کو بتایا کہ خدا اپنی تمام مخلوقات سے محبت کرتا ہے، اس لئے انھیں بھی اپنے جیسے انسانوں کے ساتھ جو ان کے ہمسایہ بھی ہیں محبت سے رہنا چاہئے۔ یہی رواداری کی تبلیغ اور یہی بھگتی کی تحریک تھی جو ہندو مذہب کے اعلیٰ فلسفے اور اسلام کے عقیدۂ توحید کے

باہمی توافق اور ارتباط کا نتیجہ تھی۔

بھگتی کی تحریک سے مسلمان علمبرداروں میں خواجہ معین الدین چشتی۔ بابا فرید گنج شکر اور گلبرگہ کے حضرت گیسو دراز خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس تحریک نے جہاں ہندو مسلمانوں کے درمیان رواداری کا جذبہ اور خدا پرستی کا شوق پیدا کیا، وہاں یہ بات خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے کہ اس تحریک میں تمام حصہ لینے والوں نے عربی، فارسی اور سنسکرت کی بجائے مقامی اور سادہ زبان میں اپنی تبلیغ کی۔ ہندوؤں میں ہر سمت ویدانت کا پرچار ہونے لگا۔ ویدوں اپنشدوں برہم سوتروں اور گیتا کے تراجم ہونے شروع ہوئے۔ دسویں صدی کے آخر میں دکھنی بھارت میں رامانج نے وشنو مت کا پرچار شروع کیا اور لوگوں کو وشنو کی ساکار بھگتی کی طرف لگایا۔

تیرھویں صدی میں گجرات میں مادھو آچاریہ جی ہوئے۔ اسی زمانے میں مہا تما نمبارک جی ہوئے۔ ان بزرگوں نے وشنو تعلیمات کے احیاء کی تحریک کو عام کیا اور خدا کی مادی شکل کی پرستش کو رواج دیا۔ مشرقی ہند میں جے دیو کے کرشن پریم سے بھرپور نغمے گونجنے لگے۔

پندرھویں صدی عیسوی میں ایک طرف تو رامانج کے چیلے سوامی رامانند نے وشنو کے اوتار رام کی پرستش پر زور دیا، دوسری طرف ولبھ اچاریہ نے خلقِ خدا کو کرشن پریم میں رنگ دیا۔ گویا رامائی اور کرشنائی تعلیم عام ہوگئی۔ جنوبی ہند میں مہاراشٹر کے مشہور بھگت نام دیو نے ہندو، مسلمان دونوں کے لئے بھگتی کی ایک مشترک راہ نکالی۔ انھوں نے پہلے کرشن کی مادی پیکر میں بھگتی کی اشاعت کی۔ پھر ناتھ پنتھی یوگی گیان دیو کی صحبت کے اثر سے وحدت الوجود کا درس دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں ساکار (خدا کا مادی پیکر) اور نراکار (وحدت الوجود) دونوں قسم کی تعلیم پائی جاتی ہے۔ اسی چیز کو ترقی دے کر کبیر داس نے اس مت کو نرگن پنتھ کے نام سے چلایا اور اس میں عرفان و تصوف کی تعلیم دی۔ کبیر نے ان گمراہ لوگوں کی صحیح موقع پر رہنمائی کی جو ناتھ پنتھی یوگیوں کی تبلیغ کے باعث عبادت و ریاضت سے دور ہٹ گئے تھے۔ اس پنتھ میں نانک، داؤد، اور

ملوک داس ایسے سنت ہوئے۔

روحانیت کا یہ سرچشمہ جو دکن سے پھوٹا، دو دھاراؤں میں بہہ نکلا۔ ایک دھارا کا نام گیان (عرفانِ حقیقت) اور دوسری دھارا کا نام بھگتی (عبادت و ریاضت) ہوا۔ ان دونوں شاخوں میں ہندو سنت اور مسلمان صوفی دوش بدوش تھے۔ آگے چل کر ہر ایک شاخ دو حصوں میں بٹ گئی۔ گیان والی شاخ میں ویدانت مت کے سنت گیان مارگی (موحد) اور تصوف کی راہ پر چلنے والے پریم مارگی (صوفی) کہلائے۔ اسی طرح بھگتوں میں بھی اپنے رہنماؤں کے زیرِ اثر کچھ رام بھگت اور کچھ کرشن بھگت بن گئے۔ اس طرح بھگتی تحریک چار گروہوں میں منقسم ہو گئی۔ (۱) گیان شری سلسلہ (حقیقت پرست) (۲) پریم مارگی یا صوفیوں کا سلسلہ۔ (۳) رام بھگتی سلسلہ۔ (۴) کرشن بھگتی سلسلہ۔

رامائی سلسلہ کی ابتدا وشنوی اثرات کے احیاء ہی سے ہوئی۔ اس تحریک کے علم برداریوں تو رامانج اچاریہ تھے، لیکن انھیں کے سلسلے میں راما نند جی نے اسے خوب پروان چڑھایا، اور اسے ایک واضح شکل بخشی۔ اس سلسلے میں بھی ہندوؤں کے دوش بدوش مسلمانوں نے رام بھگتی کے جوہر دکھائے۔ ایک طرف تو رامانج آچاریہ نے وشنو جی کے رام اوتار کی تبلیغ کی۔ دوسری طرف نمبارک اچاریہ، مادھو اچاریہ وشنو سوامی بلبھ اچاریہ نے اس امر کی تلقین کی کہ وحدت الوجود کائنات میں مختلف طریقوں سے جلوہ دکھاتا ہے اور اس لحاظ سے انھوں نے حقیقت کو نورانی اور زنجیر مجسم بنانے کی شری کرشن کی شکل میں دیکھا اور عشق و عبادت کے جذبے کو عرفان و حقیقت سے بالاتر سمجھا۔ اس امر کی وضاحت کے لیے کئی کتابیں لکھیں۔ جن کے مطالعے نے کرشن پرستی کا بے پایاں جذبہ لوگوں کے دلوں میں بھر دیا۔ خاص کر اکبر اعظم کے عہد میں ہندو اصحاب کے ساتھ مسلمان شعرا بھی کرشن بھگتی سے متاثر ہو کر قلم سنبھال کر اٹھے۔

اس طرح اس تحریک کے جادو سے سینکڑوں مسلمان صوفی اور کرشن بھگت شعرا ظہور میں آئے، جنھوں نے ہندی میں عرفان و حقیقت اور عبادت و ریاضت کے دریا بہا دیئے لیکن افسوس کہ ان میں سے آج متعدد حضرات کا کلام تو کیا ان کا نام

بھی دست برد زمانہ کی بھینٹ چڑھ گیا۔ انتہائی تحقیق و تلاش سے جو مواد فراہم ہو سکا نذرِ ناظرین کیا جاتا ہے۔

۱۔ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز

آپ کے جدِ اعلیٰ حضرت ابوالحسن جندی ہرات سے دہلی تشریف لائے تھے۔ آپ کے والد محترم کا نام سید یوسف حسینی تھا۔ مصنف تاریخ حبیبی نے آپ کا سالِ ولادت ۷۲۳ھ لکھا ہے لیکن سیرِ محمدی کے مصنف حضرت مولانا شاہ محمد علی سامانی نے ۴ رجب ۷۲۱ھ لکھا ہے اور یہی ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ آپ کا اسمِ گرامی سید محمد تھا۔ ابوالفتح کنیت اور القاب صدرالدین ولی الاکبر الصادق۔ لیکن وہ ہمیشہ حضرت بندہ نواز گیسو دراز کے نام سے مشہور ہے

گیسو دراز نام کی وجہ تسمیہ خزینۃ الاصفیا میں یوں بتائی ہے کہ..... ایک بار آپ کے پیرو مرشد حضرت نصیرالدین محمود چراغ دہلی پالکی میں تشریف لے جا رہے تھے دوسرے مریدوں کے ساتھ آپ بھی پالکی اٹھائے ہوئے تھے۔ چوں کہ آپ کے بال بہت دراز تھے، وہ پالکی کے نچلے حصے سے الجھ گئے۔ آپ چاہتے تو پالکی روک کر اپنے بال سلجھا سکتے تھے۔ سخت تکلیف کے باوجود اپنے مرشد کی عقیدت اور احترام کی وجہ سے کچھ نہ بولے اور بدستور پالکی اٹھائے رہے آخر حضرت چراغ دہلی کو اس کا علم ہوا، تو انھوں نے اپنے محبوب مرید کے اس ایثار سے خوش ہو کر فی البدیہہ یہ شعر کہا:۔

ہر کہ مرید سید گیسو دراز شد ۔۔۔ واللہ خلاف نیست کہ او عشق باز شد

مرشد کے لب مبارک سے ان الفاظ کا نکلنا تھا کہ آپ اسی نام سے مشہور ہو گئے۔

خواجہ صاحب نماز ظہر کے بعد طلبہ اور مریدوں کو علم تصوف اور حدیث اور سلوک کا درس دیا کرتے تھے، جو لوگ عربی، فارسی سے ناواقف تھے اُن کو سمجھانے کے لئے آپ دکنی میں تقریر فرماتے تھے۔ ایسے مریدوں کی فرمائش پر آپ نے چھوٹے چھوٹے متعدد رسالے دکنی زبان میں تصنیف فرمائے تھے۔ ان میں معراج العاشقین اور معراج نامہ اور ہدایت نامہ زیادہ مشہور ہیں۔ ۸۲۵ھ ہجری میں آپ کا انتقال ہوا۔ عربی فارسی کے علاوہ دکنی ریختہ ہندی کی ایک شاعر ہے

ہیں بھی شعر کہتے تھے۔ نمونہ ملاحظہ ہو ؎

آج برا ہے کی آگ مجھ تنے لاگے ہے　　آج برا ہے کی آگ مجھ تنے لاگے ہے

منہ کا دکھلائے کا رادی کرسی لگائے　　رادی کرسی لگائے آج برا ہے کی آگ

عود تبی کا شور مور اجالائے نسیدن جلتی ہور مشوق موسا لائے الیسی سلمو بیتی مرچ کی نالہ ہے

حال حوالہ ہے آج برہے کی آگ مجھ تنے لاگے ہے

(معراج العاشقین صفحہ ۱۰۱)

اونچا منڈہر عشق کا کوئی کیونکر پاوے　　بچارول ہیر پائی چڑھ کر نیچے ہار تا آوے

جی بیس دیوے، پانوں تل تو بھی نہ پاوے

(معراج العاشقین صفحہ ۹۵)

۲۔ مولانا مظفر بلخی قدس سرہٗ

مولانا مظفر بلخی قدس سرہٗ ۷۸۲ھ میں اپنے پیر مخدوم شرف الدین احمد یحییٰ منیری کے وصال کے بعد سجادہ نشین ہوئے۔ ۷۸۸ھ میں راہی ملک عدم ہوئے۔ مولانا کے ملفوظات اور تصنیفات بے شمار ہیں۔ دو سو کے قریب ان کے مکاتیب بھی ہیں۔ علاوہ ازیں آپ کا ایک فارسی مطبوعہ دیوان بھی ہے۔ آپ نے ہندی میں بھی طبع آزمائی فرمائی ہے۔ صرف ایک ہی دوہا دستیاب ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو:

جی مگن میں ہے کہ آئی ہیں سہانی رتیاں

جن کے کارن تھہیت دن سے بنائی گتیاں

(بہار اور اردو شاعری صفحہ ۱۴)

۳۔ مُلّا داؤد

مُلّا داؤد حضرت امیر خسرو کے زمانے کے قریب ہی سلطان فیروز شاہ تغلق کے عہد میں ہوئے ہیں۔ انھوں نے مثنوی کے طرز پر "چنداین" نامی ایک ہندی نظم لکھی تھی جس

میں نواک اور چندا کے معاشقہ کا بیان تھا۔ اس سے زیادہ ان کے حالات آج تک پردۂ اخفا میں ہیں۔ یاد رہے کہ فیروز شاہ تغلق کا زمانۂ حکومت تاریخ کی کتابوں میں سنہ ۱۳۵۱ء سے سنہ ۱۳۸۸ء تک لکھا ہے۔

۴۔ اَجَن

بھوانی شنکر اور رام چند شُکل کے تذکروں سے صرف اتنا پتہ چل سکا ہے کہ اَجَن کی تصنیف "پریم بن" کہی جاتی ہے، اور زمانہ سنہ ۱۳۳۵ء سے سنہ ۱۵۲۰ء تک کہا جاتا ہے۔ نمونۂ کلام دستیاب نہیں ہو سکا۔

۵۔ شیخ شاہ محمد بن شیخ معروف فرملی

جناب مولانا میر غلام علی آزاد بلگرامی "سروِ آزاد" میں یوں رقم طراز ہیں:۔

"عشیرۂ فرملیان بلگرام در روزگار اکبر بادشاہ عمدگی و اعتبار داشتہ اند و لوای فوقیت برافراشتہ۔ شیخ شاہ محمد در آں عہد صاحب ثروت و اقتدار بود و بحکومت احصار قیام داشت۔ و او در نظم ہندی استادِ کامل بود و گوئی نکتہ سنجی از اقران می ربود۔ جمیع ماہرانِ این فن امروز استادیِ او را تسلیم می کنند و سخنِ او را بجان خریداری می نمایند۔"

(ماثر الکرام موسوم بہ "سروِ آزاد" صفحہ ۳۵۲)

تذکرہ طورِ کلیم بھی اسی تذکرہ کا ہم نوا ہے۔

شیخ صاحب فوجی افسر تھے۔ ایک دن شکار کی غرض سے اپنی فوج کے ہمراہ باہر گئے۔ اتفاقاً فوج سے الگ ہو گئے۔ چلتے چلتے ایک گاؤں کے قریب سے گزرے وہاں چمپا نامی ایک ہندو لڑکی پر فریفتہ ہو گئے۔ دونوں میں ہندی دوہوں کی شکل میں جو باہم مکالمہ ہوا، انتہائی دلچسپ ہے۔ آخر شیخ صاحب اُسے گھوڑے پر بٹھا کر گھر لے آئے۔ شیخ شاہ محمد آخری عمر میں قنوج میں اقامت گزیں ہو گئے اور یہیں اُن کا انتقال ہو گیا۔

تذکروں سے نہ یومِ ولادت کا پتہ چلا نہ سالِ وفات کا۔ ان کی ہندی منظومات کے چند نسخے متداول ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔ دوہا ؎

مرگ نینی مرگ راج کٹ مرگ نابھن مکھ جاہ
مرگ انگ، مرگ مد تلک مرگ ابھیت سرتاہ

مطلب: شیخ صاحب اپنی محبوبہ کے حسن وجمال کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:
اے ہرن جیسی آنکھوں والی۔ چیتے جیسی کمر والی، ماہ وش، نازک اندام اور ماتھے پر کستوری کا تلک لگانے والی محبوبہ ہرن بھی، تیرے تیرِ نظر کا کشتہ اور فریفتہ ہے۔

پریتم نین تر نگ چڑھ چاہنہ جو سیلت آئی
من پار اگھٹ کو پ نین ابھر دہول دس جائی

مطلب: شیخ صاحب کہتے ہیں کہ معشوق کی آنکھیں (جو سوار شدہ اسپ شوخی ہیں) جب نخت میری طرف دیکھتی ہیں تو چاہِ چشم سے دل بے قرار ہو کر مثلِ سیماب معشوقہ کی دونوں آنکھوں کا تعاقب کرتا ہے کہ ان کو پکڑے۔

تو مکھ پانپ امیہ ندہ دیکھت نینت ترکات
نین مجبتر اکھت سب پیوت ہون نہ گھات

مطلب: تیرے چہرے کی خوبی ایسا دریائے آبِ حیات ہے جس کی صفت بیان نہیں کی جا سکتی بلکہ قابلِ دید ہے تیری آنکھیں شب و روز اس آبِ حیات کو نوش کرتی ہیں اور سیر نہیں ہوتیں۔

الی مالا بین لٹیں آہ کل دری پتار
مرگ مد کرنن کو چھوئی برن پاس تو پار

مطلب: اے نازنین تیرے موئے عنبر کند بے خطا ہیں جن کے خوف سے زنبور ہائے سیاہ صحرا کو بھاگ گئے ہیں اور سب سانپ زمین کے نیچے چھپ گئے ہیں، اور مشک بھی ان کا حلقہ بگوش ہے۔

۶۔ چمپا

ابھی ابھی بیان ہُوا کہ چمپا ہندو لڑکی تھی، شیخ شاہ محمد سے محبت ہو جانے پر ان کے ساتھ چلی گئی اور ان کی صحبت میں رہ کر مسلمان ہو گئی۔ وہ ہندی شاعرہ تو پہلے ہی تھی، شیخ صاحب کی تربیت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ یہاں تک کہ ہندی شاعری میں یہ شیخ صاحب پر بھی فوقیت لے گئی۔ شیخ صاحب عمر کے آخری حصے میں افیون استعمال کرتے تھے۔ ایک دن انھوں نے ذیل کا دوہا لکھ کر محل میں بھیجا اور چمپا سے افیون طلب کی:

چنچل تھنین ہیر لگ اریب ہاری بدہن سیتے
چمپا دی پرشاہ کے یہ جوڑی تہاری ہتے

مطلب: جو شہ مسک۔ دشمنِ خواب، اور میری سواری ہے، اگر تمھاری رائے میں مناسب ہو تو بھیج دو۔ مطلب یہ کہ افیون طلب کی۔

چمپا نے افیون بھیجتے ہوئے ذیل کا دوہا لکھ بھیجا ؎

روپ گنوان جگ ہنسن تیجی کام کی کھاد
یوں نہہ ہو تجوں ساہ یہ کہاں بساہی بیاد

مطلب: یہ بَلا حُسن کو خراب کرنے والی، اور خلقت کی ہنسی کا سبب ہے، ساتھ ہی نفسانی خواہش کو بیدار کرنے والی آپ نے کہاں سے خرید لی ہے

چمپا کے مندرجہ ذیل تین دوہے مشہور ہیں۔

ساہا ایک دن یوں ہتے جیتوں کھینچی اکاس
بھیو کھٹولن کو سمی ایک ایک نہہ پاس

مطلب: اے شاہ محمد، ایک دن وہ جوانی کے تھے کہ نظر آسمان پر تھی، یا ایک وقت یہ ہے کہ چارپائی پر پڑے ہوئے ہیں۔ یعنی ضعیفی آ گئی اور علاوہ اس کے مہاجرت بھی ہے

تاہ نہ ساہ بسارئے یاد ہا جیونت
ہم نکہ ان تم سرو سس کرپا کرو سومنت

مطلب: اے شاہ محمد، مجھ کو فراموش مت کر۔ میں اس امید سے زندہ ہوں کہ تم مثلِ ماہتاب موسم سرما کے ہو، اور میں مثل گُلِ نیلوفر کے پس مجھ پر مہربانی واجب ہے۔ ماہتابِ موسمِ سرما نہایت صاف و روشن ہوتا ہے، اور گُلِ نیلوفر کو شگفتہ کرتا ہے۔ ۵

بر ہا اُساس جرت اب نبہ بکت ین نا ہنہ
منون سراوت تن نپت پرت جای ۂ ماتہہ

مطلب: مغیبتِ شوہر میں آزاد عورت غلیانِ مہاجرت (دردِ ہجر) سے دم بدم گرم کھینچ کر جلتی ہے مگر وہ دمِ گرم کا کھینچنا اور جلنا اس کا اس کو ایسا تسکین دِہ ہے کہ گویا نیم سوختہ آبِ سرد تالاب میں غوطہ زن ہو کر فی الجملہ تسکین پائے۔ (ماثر الکرام صفحہ ۳۵۵)

۷۔ سیّد نظام الدین مدہنا یک بلگرامی

"سیّد نظام الدین تخلص بہ مدہنایک بن سیّد علاء الدین، بن سیّد حمزہ بلگرامی قدس سرہٗ شہرۂ روزگار و در موسیقیِ ہندی یگانۂ ادوار است در عصرِ خود ممتاز و مکرم می زیست وصفتِ مروت وسخاوت بہ مرتبۂ کمال داشت۔ وبہار و خلقِ حاتمی وجودِ حاتمی رنگی تازہ بخشید و در صحبتِ نکتہ سنجی و لطیفہ گوئی میر مجلسی بہ او مسلم شد۔

آخر طبعِ شریفش بہ علومِ ہندی مائل گشت و در شہر بنارس کہ بناءِ اس است کتب سنسکرت وبھاکا کسب نمودہ مہارتِ عظیم پیدا کرد۔ ودر موسیقیِ ہندی از علم نادوتال و سنگیت سازِ یکتائی نواخت و مشق و مدققِ این فن و نایکِ وقت شد از ینجا ست کہ مدہنایک تخلص می کند۔"

(مآثر الکرام موسوم بہ سروِ آزاد، دفتر ثانی صفحہ ۲۵۶)

ہوشیار جنگ ہوش بلگرامی نے ماہ نامہ نگار لکھنؤ میں مدہنایک بلگرامی کے عنوان سے جو مضمون لکھا تھا اُس میں اُس مشہور واقعہ کا ذکر ہے کہ تان سین مدہنایک کی موسیقی کی تعریف سُن کر اُسے ملنے بلگرام آیا تھا۔ جب وہ بستی کے باہر ایک کوئیں پر دم لینے کو ٹھہرا تو وہاں کچھ عورتیں پانی بھر رہی تھیں۔ ایک نوجوان عورت نے اپنا گھڑا کنوئیں میں ڈالا تو "بڑک بڑک" کی بے ہنگم آواز آنے لگی اور گھڑا پانی میں نہ ڈوبا۔ عورت کو غصہ آگیا اور جھلا کر بولی کہ۔ یہ کیا بے وقت کا راگ الاپتا ہے، اور غصہ میں آکر گھڑا پھوڑ ڈالا۔ تان سین نے اُس عورت کے متعلق پوچھا تو معلوم ہوا کہ مدہنایک کے گھر کی لونڈی ہے۔ اس واقعہ سے مدہنایک کی موسیقی دانی پر اہم روشنی پڑتی ہے۔

مدہنایک ہندی زبان کے مشہور شاعر تھے۔ فارسی اور سنسکرت میں بھی کامل تھے۔ فنِ موسیقی میں ماہر تھے۔ مدہنایک تخلص تھا۔ فنِ موسیقی میں ان کی دو کتابیں ہیں۔ "نادچندرکا" اور "مدہنایک سنگار"۔ ہندی زبان میں یادگار ہیں۔ آج کل بعض بعض گاؤں کے لوگ اُن کا نام تعظیماً لیتے ہیں۔ یکم رمضان المبارک سنہ ۱۰۹۹ھ مطابق سنہ ۱۶۸۷ء میں وفات پائی۔ (قاموس المشاہیر جلد دوم صفحہ ۲۶۲)

نمونہ کلام

کبت ۔ نین برنن (دربیان چشم)

کاری کجراری انیاری جگ موہنی کون تن بیچ تاری ات ترل تریری ہیں
جیسی مین ساوک جاوک جل بھیر یا پھر کیں سو کیسہوں رہت نہ گھیری ہیں
لال مدہنایک سو میر دمن موہنی کون پٹ پنجری پنجر رہت نہ ہیری ہیں
سالو کی سدھار سو بھا ہیا دھکار ایسی مین کی کہلونا کدہوں نین پیاری تیری ہیں

مطلب: چشم سیاہ۔ سرمہ آلود۔ نوک دار۔ مردم فریب کی بیاضِ سرخ میں مردمکِ چشم اس خوبی سے متحرک ہیں کہ گویا مچھلیوں کے بچے آبِ سرخ میں شوخی سے حرکت اور تفریح کرتے ہوں۔ مدھنایک شاعر کہتا ہے کہ یہ آنکھیں نقاب کے قفس میں بھی باز نہیں آتیں۔ میری طرف دیکھتی اور دل کو فریفتہ کرتی ہیں مزید برآں آپ چشم پوشی سے پھرنے کے نقاب کی کچھ اس میں

جو خوبی ہے اُس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ بہرحال اے نازنین تیری آنکھیں حُسنِ مجسم کا بازیچہ ہیں۔ (تذکرہ طورِ کلیم صفحہ ۱۱، ۱۲)

چند کی سیامتا برنن (در بیانِ داغِ سیاہ ماہتاب)

کبت۔

کوؤ کہے چند کی مرکنک انک دیکھیت کوؤ کہی چھایا چھت بھُوتل پرکاس کی
کوؤ کہے اندھکار پیو ہی سو دیکھیت کوؤ کہی کالمان کلنک انیاس کی
مدھ کہئ سار سر لیبوں کرتار سب تاہی کی سنواری بھاماں کانھ کی بلاس کی
تاون ہین چھاتی چھید پری ہیں بھپاکر کی وار پار دیکھئیت نیلتا اکاس کی

مطلب: چاند میں جو سیاہ داغ نظر آتے ہیں، اُن کی ماہیت کی نسبت شاعر نے تخیل کے کرشمے دکھا کر اپنی قادر الکلامی کا ثبوت دیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ چاند کے سیاہ داغوں کی نسبت بعض کا بیان یہ ہے کہ ارابہ سوار ہی ماہتاب میں جو آہو بیٹھے سیاہ ہیں یہ اُن کی سیاہی ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ زمین کا سایہ جو ماہتاب پر پڑتا ہے اُس کی سیاہی ہے اور کئی لوگ یہ کہتے ہیں کہ ماہتاب فاسق و فاجر ہے۔ یہ اس کے عیب کی سیاہی بلا تکلف ہے مدہنا یک شاعر کہتا ہے کہ خالق نے ماہتاب کا خلاصۂ نور و خوبی لے کر زینا مدنقاجس کو نسخراے ہندی ضرب المثل خوبی و خوب صورتی یہ کلام خود کہا کرتے ہیں، کو خلق کیا اور بوجہ نکل جانے خلاصۂ نور کے ماہتاب کے اندر سوراخ ہو گیا ہے، اس واسطے سیاہی آسمان کی کہ جو ماہتاب سے بالاتر ہے براہ سوراخ نظر آتی ہے۔ (از تذکرہ طور کلیم صفحہ ۱۳)

۸ - میر عبدالواحد حُسینی واسطی ذوقی بلگرامی

ذوقی صاحب شیخ صفی سائی پوری کے بعیتیانِ خاص سے تھے۔ فارسی اور ہندی دونوں زبانوں میں اُستادِ وقت تھے، بلگرام وطن تھا۔ فارسی میں شاہدی اور ہندی میں ذوقی و واحد تخلص فرماتے تھے۔ فارسی میں خواجہ حافظ شیرازی کے شاگرد تھے۔ بماہ رمضان ۱۰۱۷ھ، شب جمعہ خدا کو پیارے ہو گئے۔ نمونۂ کلام۔ دوہا ۵

برنون واجد کون پدہ کنٹھ کی دُت جوت
رَین اماوَس جاہ لکھ پُورَن ماشی ہوت

مطلب: واجد شاعر بیان کرتا ہے کہ میں عورات کی چمک اور روشنی کا کیا بیان کروں کہ جس کو دیکھ کر شبِ تاریک روشن ہوجاتی ہے۔ (طور کلیم صفحہ ۹۴)

دوہا

کئی بار پھر پھر کی رسناں پھر پھر کھات
پھر پھر نیکی لگت ہیں پھر پھرنے کی بات

مطلب:۔ مژدۂ مراجعتِ طالب کو چند مرتبہ بار بار بیان کیا، مگر زبان پھر پھر اسی کو کہے جاتی ہے۔ سچ ہے مواصلتِ طالب کا سخن بار بار اچھا معلوم ہوتا ہے۔ (طور کلیم صفحہ ۹۵)

۹ ۔ سید مبارک علی مبارک بلگرامی

نام سید مبارک علی۔ مبارک تخلص۔ وطن بلگرام۔ تاریخ ولادت ۱۵۸۳ عیسوی۔ آپ عربی۔ فارسی اور سنسکرت تینوں زبانوں کے فاضل تھے۔ آپ کی ہندی شاعری کے دو مجموعے "الک شتک" اور "تل شتک" شائع ہوچکے ہیں۔ علاوہ ازیں آپ کے اور بھی متفرق چھند ملتے ہیں۔ آپ کا ہندی کلام یہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ ہندی کے نہایت بلند پایہ اُستاد شاعر ہو گزرے ہیں۔ "الک شتک" میں زُلف کے متعلق سَو دوہے ہیں۔ اور "تل شتک" میں خال کے متعلق سَو دوہے۔ اِن دوہوں میں نادر تشبیہات، اور مضمون آفرینی کے ایسے لاجواب نمونے ملتے ہیں کہ پڑھنے والے پر وجد طاری ہوجاتا ہے۔ اور زبان سے بے اختیار واہ واہ نکلتی ہے۔ عربی۔ فارسی تشبیہات و مضامین کا ہندی تشبیہات و مضامین کے ساتھ امتزاج نہایت پُرکیف اور پُرلطف ہے۔ الغرض آپ کا ہندی کلام نہایت ارفع اور اعلیٰ ہے سطحی خیالات کا آپ کے یہاں نام تک نہیں۔ نمونۂ کلام۔

(انتخاب از الک شتک)

اَلک مبارک نیا بدن ۔ لٹک پری یوں صاف
خوشنویس منشی مدن ۔ لکھیو کا نچ پر قاف

مطلب: اے مبارک معشوق کے رخِ پرنور اس طرح صاف لٹک رہی ہے جس طرح
کام دیو (عشق کا دیوتا)، خوشنویس منشی کی طرح کانچ پر حرف قاف (ق) لکھ دے۔
سبحان اللہ۔ رُخِ نازک کے لئے کانچ اور بل کھائی ہوئی زلف کی تشبیہہ حرفِ قاف سے
یہ وہ نوادر ہیں جو آپ کے سوائے کسی اور ہندی شاعر کے یہاں نہیں ملتے۔ دوہا ہے
جگی مبارک نیا بدن اَلک روپ پائی ہوئی
منو چند کی گود میں رہی نسا سوئی

مطلب: اے مبارک معشوق کے رخِ زیبا کے اُجالے کے ساتھ ساتھ زلفِ سیاہ کا
اندھیرا اس طرح معلوم ہوتا ہے جیسے ماہِ عالم تاب کی آغوش میں شبِ تاریک محوِ خواب ہو۔
چاند کی گود میں اندھیری رات سوئی ہوئی ہے۔ یہ تخیل نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے سبحان اللہ

انتخاب از تل شتک ۔ دوہا ہے
من یوگی آسن کیو ۔ چبک گپھا میں جائے
رہیو سمادھی لگائے کے ۔ تل سِل دوار لائے

مطلب: دل کے یوگی نے چاہِ ذقن کی گپھا (غار) میں آسن جما لیا ہے۔ دروازے پر خالِ حسن
کی سِل (پتھر) رکھ کر اُسے بند کر دیا ہے تاکہ سمادھی یا مراقبہ میں کوئی مخل انداز نہ ہو۔

دوہا ہے

چبک سروپ سمند میں ۔ من جانیو تل ناؤ
ترن گیو ڈوبیو تہاں ۔ روپ قہر دریاؤ

مطلب: چاہِ ذقن کے دل فریب سمندر میں خال کو دل نے ایک کشتی خیال کر کے وہاں
تیرنے کا ارادہ کیا اور ڈوب گیا۔ حسن ایک طوفانی دریا ہے، جس میں ڈوبنے سے
کوئی نہیں بچ سکتا۔
کبت ہے

کنک برن بال نکن لست بجال موتن کی مال اُرسو ہین بھلی بھانتی ہے
چندن چڑھائی چاند و چند مکھی موہنی سی پرات ہی انہائے پگ دھرے مسکاتی ہے
جھنیری بچیتر سیام نیچ کے مبارک جو ڈھانک نکھ سکھ نے نپٹ سکچاتی ہے
چندرما لپیٹ کے سمیٹ کے نکھت مانو دن کو پرنام کئے رات چلی جاتی ہے

مطلب : سونے جیسا اُجیالا اور گورا چہرہ۔ بکھرے ہوئے بال۔ چمکتی ہوئی پیشانی۔ گلے میں موتیوں کی مالائیں بہت دلفریب معلوم ہوتی ہیں۔ علی الصباح نہا دھو کر، چندن جسم پر لگا کر، چاند جیسے دل کش چہرے والی، پاؤں دھرتی مسکراتی ہوئی چلی جا رہی ہے۔ کالے رنگ کے ڈوپٹے میں سر سے پاؤں تک جسم کو ڈھانپ کر حیا سے بدن چراتی ہوئی اس طرح جا رہی ہے جس طرح رات دن کو پرنام کرتی ہوئی چاند کو دامن میں لپیٹ کر لیے جا رہی ہو۔

۱۰۔ قطبن جائسی

ہندی میں سب سے پہلے مثنوی نگار قطبن تھے۔ یہ شیخ برہان کے شاگرد تھے۔ انھوں نے ۹۰۹ھ میں مرگاوتی نام کی ایک مثنوی تصنیف کی۔ اس مثنوی میں چندر نگر کے راج کمار اور کنچن نگر کی راج کماری مرگاوتی کا افسانۂ محبت نظم کیا گیا ہے۔ ناگری پرچارنی سبھا بنارس نے اپنی ۱۹۰۳ء کی رپورٹ میں اس تصنیف کی اہمیت خاص طور پر بیان کی ہے۔ اس کتاب کا اکثر حصہ سری رام چندر جی کی مناقب آرائی پر وقف ہے۔ خال خال ایسے شاعر گزرے ہیں جنھوں نے ملک محمد جائسی کی طرح عشقیہ افسانوں یا حکایات پر قلم اُٹھایا ہے۔ اس سلسلے میں اوّلیت کا سہرہ قطبن کے سر ہے۔ ناگری پرچارنی سبھا کے ایڈیٹر مسٹر سیام داس کا بیان ہے کہ "قطبن کا سرپرست حسین شاہ یا شیر شاہ سوری کا باپ ہے"۔ لیکن حافظ محمود شیرانی اس بیان کو غلط ثابت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"میرے خیال میں قطبن کا سرپرست علاءالدین حسین شاہ والئی بنگالہ ہوگا جس نے ۸۹۹ھ / ۱۴۹۳ء سے لے کر ۹۲۵ھ / ۱۵۱۶ء تک حکومت

کی ہے۔ یہ بادشاہ ہندی اور بنگالی کا سرگرم سرپرست تھا۔"
(پنجاب میں اردو صفحہ ۱۶۰)

قطبن اپنے مرشد شیخ بڈھن کے ذکر میں کہتے ہیں:

شیخ بڈھن جگ سچا پیر و · نام لیت ہوے سریر و
قطبن نام لئے پاد ھرے · سرپری دوہ جگ منہ رے
پاچھلے پاپ دھوئے سب گئے · جھکڑیں پڑانے اور سب نئے
نیچے بکتیا آج اوتارا · سب سوں بڑسوں پیر ہمارا
جیہ کو باٹ دکھائی ہووے · پہنچے ایک نمک میں سوئے

دوہا۔ سے

گر دینتر دکھائے دین ہے جو جل جانے کوئے
نمک ایک میں پہنچے جو ست بھاے سو ہوئے

قطبن حسین شاہ کے لئے کہتے ہیں سے

شاہ حسین آہے بڑ راجا · چھتر سنگھاسن ان کو چھا جا
پنڈت اور بدھ ونت سیانا · پڑھے پران ارتھ سب جانا
دھرم دو وستلی ان کو چھاجا · ہم سر چھپاہ جیو جگ راجا
دان دئے اوگنت نہ آوے · بلی او کرن نہ سر بر پاوے
راے بھپاں لوں گنند دکھویں · سیو اکرہیں یا سب جگ ایں

۱۱۔ شیخ برہان

ان کے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ ہندی ساہتیہ کا اتہاس از رام چندر شکل، اور رسالہ نگار لکھنؤ کا ہندی شاعری نمبر جنوری ۱۹۳۶ء کے صفحہ ۱۵ پر درج ہے کہ "قطبن جانسی کے استاد تھے۔"

۱۲۔ مخدوم برنادی

مخدوم بہاءالدین برنادی۔ برناوہ ضلع میرٹھ کے رہنے والے ہیں۔ ان کے ہندی اشعار قطعاً برج میں ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ دوآبہ میں برج زبان مستعمل تھی۔

(پنجاب میں اردو)

سید آل محمد نقوی مہر جائسی ایم۔ اے مرحوم کی قلمی بیاض سے مخدوم صاحب کی نسبت جو واقفیت بہم پہنچی، من وعن نقل کی جاتی ہے:-

"چودھویں صدی عیسوی کے آخری حصہ میں مخدوم صاحب سمنان سے جون پور ہو کر جائس پہنچے۔ چلہ کشی کی۔ ہندی میں شعر کہتے تھے۔ ان کی درگاہ جائس میں موجود ہے۔ ان سے کسی عورت نے کہا تھا "یا میر پوت بھیکھ دے۔" کلام اور مزید حالات نہیں مل سکے۔

۱۳۔ تاج بخش

پندرھویں صدی عیسوی کے آخر میں، مولانا سید حسین تاج بخش کا ہندی کلام پایا جاتا ہے۔ ان کو جو معافی یا جاگیر بادشاہ کی طرف سے ملی تھی وہ جائس کے محال میراں پور سیدان "موافی بیں سیون" کے نام سے کاغذاتِ دیہی میں درج ہے اور مشہورِ عام ہے۔ اس زمانے کی جائس کی ہندی شاعری آج تک لڑکوں کی زبان پر ہے۔

مولانا سید حسین تاج نقوی سیدانوی جائسی زمانۂ شاہانِ مشرقی جونپورہ و شاہانِ خاندان لودھی دہلی کے زمانے کے بزرگ ہیں۔ بھاشا میں آپ کی مشہور کتاب "نل دمینتی" تھی جس کا ترجمہ حسب فرمانِ خاص اکبرِ اعظم فیضی فیاض نے ۳۵ سنہ جلوس میں چار ماہ کی مدت میں کیا۔ اور اس کا نام "نل دمن" رکھا۔ علامہ شبلی نعمانی نے "تذکرہ شعر العجم" میں تذکرہ فیضی کے سلسلہ مثنوی نل دمن کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ملا عبدالقادر بدایونی جو فیضی کے متعلق بے نقط اڑاتے ہیں، اس پر بھی لکھ گئے ہیں کہ "الحق مثنویست کہ دریں سہ صد سال مثل آں بعد

از امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ در ہند کسے نگفتہ باشد"

مولانا سید حسین تاج بخش جائسی کا تذکرہ "مہرنامہ" بی بی پھول بنت۔ سید قاسم بن سید پیارے حسینی رئیس سکنہ سیدانہ جائس میں متواتر مقامات پر اور موصوف کے نام فرمانِ معافی جو نافذ ہوا تھا، اس کا حوالہ بھی ہے۔ "مہرنامہ" ۱۰۳۵ھ ہجری کا لکھا ہوا ہے۔ آپ کو جو جاگیر جائس میں ملی تھی۔ وہ اب تک "میدان پور سیدانہ" میں "مولانا سیون" کے نام سے موسوم ہے جو مولانا حسین کا امتدادِ زمانہ کی بنا پر تبدیل شدہ تلفظ ہے۔

"مل دمینتی" بھاشا کے آخر میں حسب ذیل دوہا ہے۔ رسم خط فارسی ہے، اور تحریر ۱۰۱۳ھ ہجری ہے۔ دوہا یہ ہے ؎

لکھا رہے برسن جو نہ مٹا سے کوئے
لکھن ہارا باہرا کہ گل گل مٹی ہوئے

مولانا صاحب موصوف نے "بارہ ماسہ" "ڈوہے" بھی کہے ہیں نمونہ ملاحظہ ہو ؎

جاکی بیسی دکھ بھرے اور جاگی سنگی رین
کن کن دکھن سے فاطمہؓ لال حسینؓ

تن گھائل من نڈھال رکت بھرے مکھ پر بال
بجھ بجھو ٹو لگی بھال تسیر زہراجی کو لال

مکہ ماں ڈھونڈھیوں مدینہ ماں ڈھونڈھیوں
کوئی نگریاں ماں ڈھونڈھیوں حسینؓ

چاچی پکاریں۔ نانی پکاریں سن رے حسن کی بہوا
سن رے جنگل کی ہرنی، ماٹی ملا تورا بندرا

(منقول از بیاض مہر جائسی)

۱۴۔ قاضی سیّد بڑے جائسی

آپ، مولانا سید حسینؒ تاج بخش کے بھائی تھے۔ ہندی شاعری اور دیگر علوم و فنون میں دستگاہِ کامل رکھتے تھے۔ "دُہا" کے چند شعر بطور نمونہ درج ذیل ہیں:-

راہ باٹ میں دادی رو دیں	بَن ماں رودیں ہرنیاں
آج حسینا دُکھ پڑا ہے	مکہ ماں رودیں مکنیاں
گھر کی نیاں دادی نکلیں	ایسی جلتی دھوپ میں
رو رو کافر سے پوچھیں	ہائے حسینا کہا ہوئے
تم تو ہو گی سبا کی دادی	تم سے بپا نہ کیا کروں
تمرے پوت کٹ گئے	کربل کے بَن ماں سو گئے

(منقول از بیاض جبر جائسی)

۱۵۔ سیّد منجھلے منجھن جائسی

آپ سید پیارہ حسینی رئیس سیدانہ جائس کے بیٹے اور مولانا سید حسین تاج بخش جائسی کے پوتے تھے۔ نویں صدی ہجری کے آخر میں آپ کی ولادت ہوئی۔ آپ کی مشہور تصنیف "مدھو مالتی" ہے۔ آپ ۹۸۳ھ ہجری میں بموجب فرمانِ اکبری بنام سید ملک پیارہ حسینی مورخہ ۹۸۳ھ ہجری کے ذریعہ ۹۰ روپے کے معافی دار تھے۔ پنڈت رام چندر شکل نے اپنے تذکرہ "ہندی ساہتیہ کا اتہاس" میں صوفی شعرا کے ماتحت صفحہ ۹۵ پر منجھن کا ذکر کیا ہے اور اُن کی کتاب "مدھو مالتی" کے متعلق لکھا ہے کہ:

"منجھن کی لکھی ہوئی (مدھو مالتی) کا صرف ایک جزو ملا ہے جس سے اُن کی نزاکتِ تخیل اور گہرے قلبی تاثرات کا پتہ چلتا ہے۔ اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ اُن کا ہندی ادب کا مطالعہ عمیق تھا۔ قطبن کی مرگاوتی کی طرح منجھن کی مدھو مالتی میں بھی پانچ چوپائیوں کے بعد ایک دوہا رکھا گیا ہے لیکن

مرگاوتی کی بہ نسبت مدھومالتی کی تخئیل زبردست اور تشریح بسیط، دلنشین اور دلچسپ ہے۔ جذباتِ قلبی اور منظر نویسی میں بھی آپ نمایاں نظر ہیں۔ مدھومالتی کی کہانی طویل ہے۔"

اتنا لکھ کر پنڈت شکل نے مدھومالتی کا قصہ کنیسر نگر کے راجہ سورج بھان کے بیٹے منوہر اور مدھومالتی کا عشقیہ ماجرا لکھا ہے۔

دراصل صوفیوں کے عقیدے میں یہ ساری کائنات ایک پُراسرار بندھن میں جکڑی ہوئی ہے۔ اس بندھن کا سہارا لے کر زندگی خالقِ محبت تک پہنچنے کا رستہ پا سکتی ہے۔ صوفی کو ہر چیز میں وہی جلوہ نظر آتا ہے۔ چنانچہ منجھن کہتے ہیں ؎

دیکھت ہی پہچانیو تو ہیں — ایہی رُوپ جیہی چھندر یو موہیں
ایہی رُوپ بُت اُہے چھپانا — ایہی رُوپ پارب ہر سِشٹی سمانا
ایہی رُوپ پرگٹے بہو بھیسا — ایہی روپ جگ رنک نریسا

صوفیوں کے عقیدے کے مطابق فرقتِ ایزدی اور ہجرِ خالقِ حقیقی کا بیان عبادت و ریاضت کا ایک خاص پہلو ہے۔ چنانچہ منجھن کہتے ہیں:

بِرہا اُنجن جن سارا — بِرہ وُرُوپ درپن سنسارا
کوٹی ماہیں بِرلا جگ کوئی — جاہی سریر بِرہ دُکھ ہوئی

دوہا

رتن کے ساگر ساگرہی گج موتو گج کوئی
چندن کے بن بن اُپجے بِرہ کو تن تن ہوئی

مدھومالتی کا سنِ تصنیف صحیح صحیح معلوم نہیں ہو سکا لیکن اس کا رسم الخط سمت ۱۵۵۰ بکرم اور سمبت ۱۵۹۵ بکرم کے درمیان معلوم ہوتا ہے۔ سمبت ۱۵۹۵ بکرم پدماوت کی لکھائی کا سمبت ہے۔

عثمان کی چتراولی میں مدھومالتی کا جو کیرکٹر ہے اُس میں بھی کنور کا نام منوہر ہے اور یہی نام مدھومالتی کی دست یاب کتاب میں بھی ملتا ہے۔ پدماوت کی تصنیف و شہرت سے

پہلے مدھو مالتی کی شہرت بہت تھی چنانچہ ہندی شاعر بنارسی داس نے سمبت ۱۶۶۰ بکرم میں اپنی عشقیہ زندگی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بازار جانا چھوڑ کر گھر میں مرگاوتی اور مدھو مالتی پڑھا کرتا تھا۔ جیسا کہ وہ کہتا ہے ؎

تب گھر میں بیٹھے رہیں ناہیں ہاٹ بجار — مدھو مالتی مرگاوتی پوتھی دوسے اُپکار

اس کے بعد دکھنی شاعر نصرتی نے بھی سمت ۱۷۰۰ بکرم میں مدھو مالتی کی طرز پر دکھنی زبان میں گلشنِ عشق کے نام سے مثنوی لکھی ہے۔ منجھن کا ایک دوہا از سنئے ؎

گوری اباد نہ کیجے کہ تھنا ہے جیتز بنگ
ہردو ن تھے سے کہت ہوں کہ جائس پیا کے سنگ

گوری اباد (غوریاباد)۔ تھنا (تھونہ)۔ ہردون (ہردون) جائس (جائس) یہ چاروں قدیم آبادیاں ہیں جن کے نام منجھن نے ایک دوہے میں جمع کئے ہیں۔

۱۶۔ منجھن

منجھن جائسی کا ذکر پہلے ہو چکا ہے وہ مدھو مالتی کے مصنف ہیں۔ لیکن کبت اور سوییا کے مصنف منجھن دوسرے شاعر ہیں۔ ان کے حالات اور کلام نایاب ہے۔ صرف شکل نے اپنے تذکرے میں یوں لکھا ہے:

"کبت سوییا کہنے والے ایک منجھن شاعر بھی ہوئے جن کا زمانہ منجھن جائسی سے پہلے خیال کرنا چاہیئے (ہندی ساہتیہ کا اتہاس از شکل صفحہ ۹۹)

۱۷۔ سید سمن جائسی

آپ گیارھویں صدی ہجری کے سیدانہ جائس کے نقوی سادات کے ایک بزرگ تھے، بھاشا میں پہیلیاں کہتے تھے۔ آج کل بھی آپ کا "دوہا" بہاوت لوگ محرم میں روتے ہیں۔ نمونہ کلام میں آپ کی ایک پہیلی اور ایک دوہا پیش کیا جاتا ہے۔

پہیلی :-

کچھے بڑے سہاونے۔ گدرے پر مٹھائین
سمن وہ بھل کون ہے۔ جو پاکے پرتہائین

دُہا

دریا پہ رکھا اک خواجہ۔ لو ہو بھرے دونوں ہاتھ ماں۔ اللہ لو ہو بھرے دونوں ہاتھ ماں
سر پہ بندھا لو ہو ماٹ سہرا۔ کنگنا بندھے دونوں ہاتھ ماں۔ اللہ کنگنا بندھے دونوں ہاتھ ماں

(منقول از بیاض مہر جائسی)

۱۸۔ ملک محمد جائسی

جائس اودھی بھاشا کے صوفی شعرا میں ملک محمد جائسی کو شہرتِ عام و بقائے دوام کا درجہ حاصل ہے۔ آپ کی ولادت، آپ کے والد احمد کبیر سے یہاں نوی صدی ہجری میں ہوئی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ کے والد بھی پہنچے ہوئے صوفی تھے، جن کا مکان ملکیانہ میں تھا۔ احمد کبیر صاحب اپنے مکان ہی میں اپنے شاگردوں کو تصوف کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ وہیں عبادت کرتے تھے، آپ کا مزار جائس میں مزار بین صدین سیدانہ دتبانہ آج تک موجود ہے۔

ملک محمد جائسی اپنے زمانے کے بہت بڑے صوفی۔ جائس کے معمولی زمیندار خاندان مخدوم اشرف جہانگیر رح سمہناتی شیخانہ جائش کے مُرید اور مہدی کے مُرید تھے۔ جن کا ذکر اُنھوں نے علی الترتیب پدماوت میں کیا ہے۔ پدماوت کا ایک نسخہ جو فارسی رسم الخط میں ہے، اُس میں ۸۵ برن رکھے گئے ہیں۔ تیسرا برن شیر شاہ کی تعریف میں ہے، اور چوتھا برن پیر سید اشرف مخدوم جہاں گیر کی تعریف میں۔ کہانی لکھنے کا سال ۹۴۷ھ لکھا ہے۔ اس کے بعد سنگلدیپ کی رانی پدمنی۔ چتوڑ گڑھ کے راجہ رتن سین اور دہلی کے سلطان علاء الدین کا قصہ شروع کر دیا ہے۔ پدماوت فارسی مثنوی کی طرز پر لکھی گئی ہے۔ دراصل قطبن اور ملک محمد جائسی وغیرہ نے محبت کی کہانیوں سے اثر ڈال کر ہند و مسلم اجنبیت کو مٹایا ہے۔

ہندوؤں کی کہانیاں اُن ہی کی بھاشا میں اور اُن ہی کے جذبات و مراسم کی

ترجمانی بہترین طریقے پر ملک محمد جائسی نے اپنی تصنیف پدماوت میں کی ہے۔ رام چندر شکل نے اس امر پر بہترین روشنی ڈالی ہے۔ ملک محمد جائسی شاعری کے علاوہ جوتش میں بھی دسترس رکھتے تھے۔ انھوں نے پدماوت میں لکھا ہے کہ ہماری شاعری کا تعلق ان گھرانوں سے ہے جن کی کتابیں اُن سے پہلے پائی جاتی تھیں۔

ملک محمد جائسی کے سات لڑکے تھے جو پیر کی بد دعا سے چھت کے نیچے دب کر ایک ساتھ مر گئے۔ البتہ ان کی لڑکیوں کی دستاویزات سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی نسل کئی پُشت تک بعد میں چلتی رہی ہے۔ ناگری پرچارنی سبھا بنارس نے اپنی ۱۹۳۱ء کی رپورٹ میں اس امر پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔

ملک صاحب کی تصانیف تعداد میں چودہ ہیں جن میں پدماوت، اکھراوت اور آخری کلام موجود ہیں۔ پوستی نامہ کے کچھ اشعار ملتے ہیں۔ باقی گیارہ تصانیف ایسی ہیں جن کے نام سے آخر نامہ کا لفظ شامل ہے۔ آخری کلام چوں کہ آخر میں دست یاب ہو سکا ہے اس لئے اس کا نام آخری کلام رکھ دیا گیا ہے۔ اس میں ملک صاحب نے کہا ہے۔ ع

جائس نگر مورا استھانوں

وفات: امیٹھی کے قریب منگرا کے بن میں آپ کی آواز سن کر شیر کے دھوکے میں بھیل کی گولی یا تیر سے جان گئی۔ راجہ صاحب امیٹھی ضلع سلطان پور نے دفن کرایا مقبرہ بنوایا۔ اب تک ان کی طرف سے قبر پر چراغ جلتا ہے۔ تاریخ وفات میں بہت اختلاف ہے قرینِ قیاس یہ ہے کہ ۹۹۹ھ میں وفات ہوئی۔

ملک صاحب نے اپنے آخری کلام میں موت کے بعد جو واقعات مرنے والے کو پیش آنے والے ہیں، اُن کا ذکر اپنے مذہب کے مطابق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت محمدؐ صاحب کے اہلِ بیت محشر میں شفاعت کریں گے۔

یہ سنسار سپن کر لیکھا	مانگت بدن نین بھر دیکھا
کا ہو سوں آج بھگ پسارا	حسنؓ حسینؓ کہو کو مارا
پن رسائے کے کہے گوسائیں	فاطمہؓ کا ڈھونڈ دو بنائیں

پن رسول کنہ آلیس ہوئی — فاطمہ کا سمجھاؤ دو سوئی

جو نبی بی جھاڑیں یہ دو کھو — تو میں کروں امت کے موکھو

صوفی رنگ محمد نے ساری کتھا مثنوی میں کہنے کے بعد آخر پر تصوف و عرفان کے جوہر یوں دکھائے ہیں ۔

تن چت اُر من راجہ کینھا — ہارے سنگل بدھی پدمنی چینھا

گورو سُوا جے ای پنتھ دکھاوا — بنُو نور جگت کو نرگن پاوا

ناگ متی یہ دُنیا دھندا — باپچا سوئی نہ ایہی چنت بندھا

زاگھو دُوت سوئی سیطانوں — مایا علاء الدین سلطانوں

پدماوت اگرچہ فارسی مثنوی کی طرز پر ہے لیکن اس میں شعر نگاری بہر میں اور شہرہ سوں رسوں کا بیان عین سنسکرت کی شاعری کے مطابق ہے ۔

۱۹ ۔ سلطان عبد اللہ قُطب شاہ گولکنڈہ

سلطان عبد اللہ قطب شاہ نام اور عبد اللہ تخلص تھا ۔ سنہ ۱۰۲۳ھ میں بمقام حیدر آباد (دکن) ولادت ہوئی ۔ سلطان محمد قطب شاہ کے آپ فرزند ارجمند تھے ۔ سنہ ۱۰۳۵ھ سے سنہ ۱۰۸۳ھ تک حکومت کی ۔ آپ کے دربار میں علم و فضل کا چرچا رہتا تھا ۔ آپ علم و فضل کے دل دادہ ، علم دوست ، ادب نواز ، شاعر پرور اور عظیم قابلیت کے مالک تھے ۔ عمارات کی تعمیر کا بڑا شوق تھا ۔ آپ کے زمانے میں علماء کا کافی مجمع حیدر آباد تھا ۔ آپ شیعہ اثنا عشری بادشاہ تھے اور اپنے مذہب کے پابند تھے ۔ تصنیف و تالیف کا بہت شوق تھا ۔ ملّا وجہی ، ملّا غواصی آپ کے دربار کے شاعر تھے ۔ نمونہ کلام ۔

جمن سیانی پہلیاں ہے پھول رنگ رنگ — نپٹ نازک اکیس بھی ایک آلا

نین تجھے بلقیس کہوں تو کیا عجب — ساج ہے بلقیس کا تجھ کو خطاب

(دانشنہ پائے)

٢٠- ملّا وجہی دکنی

یہ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے درباری شاعر تھے۔ نثر و نظم دونوں میں قادر تھے۔ آپ نے ١٠١٨ھ کی حدود میں ایک مثنوی لکھی ہے۔ اس میں مشتری کے ساتھ خود بادشاہ کے عشق کی حکایت بیان کی ہے۔ اس کا پہلا اور آخری شعر ملاحظہ ہو ؎

توں اوّل توں آخر توں قادر اہے	توں مالک توں باطن توں ظاہر اہے
تمام اس کیا دیس بارہ منے	سن اک ہزار ہور اٹھارہ منے

نمونۂ کلام ؎

طاقت نہیں دوری کی اب توں بیگی آمل رے پیارے
تجھ بن منجے جینا بہوت ہوتا ہے مشکل رے پیا
کھا بڑہ کیتی ہوں میں پانی آنجھو پیتی ہوں میں
تجھ سے بچھڑ جیتی ہوں میں کیا سخت ہے دل رے پیا

(ہماری زبان یکم ستمبر ١٩٦٠ء)

ایک ٹھائیں سہیلی ہو تد دل دو جے پر نہ دھرنا
اس پیو کوں اپنا کرنا اس پاپی جیوں کوں کھوٹے کر

دکھن سا نہیں ٹھار سنسار میں	پنج فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں
دکھن ملک کوں دھن عجب ساج ہے	کہ سب ملک سر ہور دکھن تاج ہے
دکھن ملک بھوتیچ خاصا اہے	تلنگانہ اس کا خلاصا اہے

(ادمغان ابوم محمد قلی قطب شاہ ۱۱ر جنوری ١٩٥٨ء صفحہ ١٠ و ١١)

۲۱۔ ملّا غواصی دکنی

ملّا غواصی گول کنڈہ کے رہنے والے اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کے درباری شاعر تھے۔ ملّا نصرتی نے گلشن عشق میں ان کا ذکر کیا ہے۔ اور میر حسن اپنے تذکرہ میں یوں فرماتے ہیں :۔

"غواصی تخلص در وقت جہانگیر بادشاہ (۱۰۱۴ ہجری تا ۱۰۳۷ھ) بود۔ طوطی نامہ نخشبی را نظم نمودہ است بزبان قدیم نصفے فارسی، نصفے ہندی بطور ریختہ کہانی۔ سرسری دیدہ بودیم۔ شعر آں نظم یاد نیست"۔

ان کو دربار کے دکنی شعرا میں ممتاز حیثیت حاصل تھی۔ ۱۰۴۵ھ میں سلطان محمد عادل شاہ نے ملک خوشنود کو ایلچی بنا کر گول کنڈہ بھیجا۔ اس کے جواب میں سلطان عبداللہ نے غواصی کو بیجاپور روانہ کیا۔ غواصی اپنی تصانیف کے اعتبار سے مشہور ہیں۔ فسانۂ سیف الملوک و بدیع الجمال۔ اس میں الف لیلیٰ کے قصے کو نثر فارسی سے نظم دکنی میں ترجمہ کیا ہے۔ یہ مثنوی ۱۰۳۵ھ میں ختم ہوئی، جس کا ذکر غواصی نے اس طرح کیا ہے۔ ؎

برس ایک ہزار ہور چالیس پو تو ہوئے تھے یو موتیاں پوردیا ہوں تو

اس مثنوی کا ابتدائی شعر ملاحظہ ہو۔ ؎

نہ آکار تجھ ہے نہ اکار توں نہ چون و چرا سوں دھرے کار توں

غواصی نے سلطان محمد قلی قطب شاہ کے عہد ہی میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن اس کی قدر ۱۶۲۶ء کے بعد عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں ہوئی۔ طوطی نامہ میں سلطان عبداللہ قطب شاہ کی مدح سرائی کا نمونہ دیکھئے۔ ؎

تجھے دیکھنے والے اگر پاؤں تے تو آسمان والے اُترا وے تے
کہ بے مثل رتبا تو ایسا چہ ہے غلط نہیں میری بات یو سچ ہے
کیا مجھ غواصی کو تونے نہال کردں کیوں میں شکرانے جگ اُجال

خوب صورت عورت کے حسن کا ذکر یوں کیا ہے ؎

بھرا نور اس کا اتھاہ نور یوں — اُبلتے تھے آسمان کے سمدور جیوں
سمن پُت ہری ادھک نار ون — سہیلی کنول سوں ہے نازک بدن
جو وسنے اُٹھے لوگ پاتال کے — کہ جیوں مونیاں ڈھال بیچ تھال کے
ستارے دیکھ اُس کا جھل نور سب — لئے ہاتھ شرمندہ ہو چور سب

۲۲ - سلطان محمد قلی قطب شاہ ثانی

یہ ابراہیم قطب شاہ کا بیٹا تھا۔ باپ کی وفات کے بعد جون ۱۵۸۱ء مطابق ماہ ربیع الثانی ۹۸۹ھ ہجری میں تخت نشین ہوا۔ اس نے نہایت اولوالعزمی کے ساتھ حکومت کی، اس کا پہلا کارنامہ حیدر آباد کی بنیاد ہے۔

مشہور ہے کہ بادشاہ نے ابتداءً شہر کا نام اپنی محبوبہ بھاگ متی کے نام پر بھاگ نگر رکھا تھا اور مشہد مقدس کے نمونے پر تعمیر کیا تھا، بعدہٗ اس نام کو حیدر آباد سے تبدیل کر دیا۔ اس کے دربار میں اہلِ علم و کمال کی خوب قدر تھی۔ اس علم دوست بادشاہ کو علم و ادب سے خاص رغبت تھی۔ "کلیات قطب شاہ" آج بھی کتب خانہ آصفیہ میں اس کی ادبی قابلیت کی یاد دلاتا ہے۔ جس میں ہندی۔ فارسی۔ دکنی زبان میں غزلیں موجود ہیں۔ ۳۱ سال نہایت کامیابی سے حکومت کی، اور ار جنوری ۱۶۱۲ء مطابق ۱۷ ذی قعدہ ۱۰۲۰ھ ہجری میں انتقال کیا۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ سلاطینِ دکن میں ممتاز ترین اور بہترین بادشاہ ہوا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

آدھار دے آدھار، اب تج بن نہیں کوئی یا علی رض
منج کو سنبھالن ہار اب تج بن نہیں کوئی یا علی
سب جگ گدا سلطان توں تو آتہراں کا بھان توں
میرا سو لیشتی واں توں تج بن نہیں کوئی یا علی رض

بندہ قطب شاہ داس ہیں بخشش منگوں تج پاس ہیں
پکڑیا ہوں تیری آس ہیں تج بن نہیں کوئی یا علی

تُو ہی جگ کا سامیا یا حفیظ　　تُو ہی جگ کو سر جائیا یا حفیظ
جو کوئی ہیں در ماندے اُن کوسار　　تُو ہی کرنے ہار دیا یا حفیظ
تیرے دوست کی باٹ کی گرد سے　　دے منج نین کو توتیا یا حفیظ

سکی تال دے منج ٹٹکنی کھڑی　　کہ ڈھال ڈھکنی کھیل کر ٹٹکنی کھڑی
جو ڈھال ڈھکنی کے کھیل کھیلن آئی دھن　　نہ سکھ بھو گڑی بھو کھیل سکتی کھڑی
محمد شاہ ہے اس زمانے کا شاعر　　نبی صدقے اس نیہہ بھبکنی کھڑی

بسنت کھیلیں عشق کی آ پیارا　　تمھیں ہیں چاند میں ہوں جوں ستارا
بسنت کھیلیں ہمن ہور ساجیاں نجھ　　کہ اسمان رنگ شفق پایا ہے سارا
نبی صدقے بسنت کھیلیا قطب شاہ　　رنگیلا ہو رہیا ترلوک سارا

دکھ ایک ہے ہر ٹیک کد ہن لاکھ چمن ہے
لکھ بھوت ہے ہر ٹھار و لے ٹیک رتن ہے
کس ٹھار ہیں وستا نہیں سب ٹھار ہے بھر پور
دیکھیں کو سکت کاں اُسے ہر ٹیک نین ہے

چلے چندنی میں جھ سکا پیو ہمارا　　ادن عکس دیپے جیوں سجھے اپارا
جنے سائیں عشق کا مد پیا ہے　　نہ کریے اسے ہور مستی اُتارا

مسلماں ریت کافر ریت کیا ریت لے نہ جانوں میں
کہ جگ کے لوگ ریتاں چھوڑ پکڑے ریت تج جیو

سنو لوگو میری پریم کی کہانی کہ پیلا ہے رنگ عاشقی کی نشانی
تمن عشق بھید پایا ہے منج بانے بالا کہ ہوتی رہوں تمن ہیم میں ہوں دوانی

محبت پیالہ پریاں لے کھڑیاں دسے یوں ان ہتاں میں جیوں سورچندر
مرا قطب تارا ہے تاراں میں نِھل تو منج پر فلک رنگ کا چتر چھایا

قطب بندا ہے نیرادو جگ میں یا محمدؐ دایم نظر رکھ اس پر اپنا ادک دیا کا

محمد قلی قطب شاہ قطب کے علاوہ معانی تخلص بھی کرتے تھے۔ ۵

معانی علیؓ دم تھے خوش ہے ہوا کہو مطرباں کو بجاؤ کماچ

منج عشق گرمی آگ کا یک چنگی ہے سورج
اُس آگ کے شعلہ کا دھواں سات گگن ہے
اس کے سو پرت پنت میں چل سیں سوں قطب
تج کوں سو مددگار حسینؓ ہور حسنؓ ہے

۲۴۔ مُلّا قطبی

مُلّا قطبی سلطان عبد اللہ قطب شاہ کے معاصر ہیں۔ انھوں نے ۱۰۴۵ھ ہجری میں تحفۃ النصائح کا دکنی میں ترجمہ کیا ہے۔ لُطف یہ کہ بحر وہی رکھی ہے اور شعر بشعر ترجمہ کیا ہے۔ آغاز یوں ہوتا ہے ؎

بولوں صفت میں بے گنت اُس خالق جن و بشر

سر دھیا کر آسماں رکھیا	سورج ستارے ہور چندر

قطبی نے رازی تخلص بھی استعمال کیا ہے ؎

قطبی دھریا اُمید یو	لایا ہوں سب صاحب نظر
بندہ یاں ہیں سب کمتر بندا	رازی تخلص قطب کا
تحفہ کیا دکنی زباں	شہ کی رضا سیں دھر

د ، بھیو کے سینہ کے بھیتر	مسکین درویشاں کو رکھ
تج سوں برائی جو کرے	تس ساتھ توں احسان کر
زحمت جو آوے تج اوپر	کسی آدمی سے کہہ نکو
سارے تیرے دکھ درد سوں	رکھے چھپا دل کے بھیتر

۲۴ - طبعی دکنی

طبعی گولکنڈہ کے رہنے والے سلطان عبداللہ قطب شاہ کے ہم عصر ہیں۔ آپ نے ایک ضخیم مثنوی لکھی جس میں بہرام اور گل اندام کا افسانہ مذکور ہے۔ آپ . . . خواجہ بندہ نواز سید محمد گیسو دراز کی اولاد سے تھے۔ آپ ۱۰۶۳ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ مثنوی کا آغاز یوں ہوتا ہے ؎

الٰہی بچن کا مجھے تاب دے	مری جیب کو تیغ کی آب دے

آخر میں تاریخِ تصنیف اس طرح لکھی ہے ؎

اتھا سال تاریخ کا خوب نیک	سنہ یک ہزار اور شتاد و ایک
اگر کاغذ گگن کا ہوے دھورا	صفت تیری نھوسے تو بھی پورا

لگا کر طبع کی موتیاں سوں ڈورا
بچن کا جگ میں مار یا ڈھنڈورا

۲۵ - ابن نشاطی

ابن نشاطی گولکنڈہ کا باشندہ اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کا درباری شاعر تھا۔ اس نے دو کتابیں لکھیں۔ "پھول بن" اور "طوطی نامہ"۔ پھول بن کی نسبت نشاطی نے یوں کہا ہے۔

صفا وار اس کی دیکھہ ہر ایک جن ہیں | رکھیا ہوں ناوں پھول بن ہیں
اتھاہ تاریخ لایا توں یہ گلزار | اگیارہ سو کواں کم تھے ہیں پر چار

ابتدا اس شعر سے ہوئی ہے۔

خداوندا تجھے ہے جم خدائی | ہمیشہ تجکوں ساجے کبریائی

۲۶ - شاہی

ان کا نام شاہ قلی خان اور تخلص شاہی تھا۔ حیدرآباد کے رہنے والے اور قطب شاہی لشکر میں ملازم تھے۔ رفتہ رفتہ تانا شاہ کے مصاحب ہو گئے۔ مرثیہ خوب کہتے تھے۔ ان کا ایک شعر مشہور ہے۔

ملنا تمن کا غیر سے کوئی جھوٹ کوئی سچ کہے
کس کس کا منہ موندوں سجن کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

۲۷ - ابراہیم عادل شاہ ثانی

اس نے ۹۸۸ھ سے ۱۰۳۷ھ تک حکومت کی ہے۔ ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں میں اس کو ایک ممتاز درجہ حاصل ہے۔ اس نے اپنے زمانہ میں علم و ہنر کو پھیلانے میں جو سعی کی ہے، وہ آپ اپنی نظیر ہے۔ اس کے دربار میں بڑے بڑے اہل کمال جمع تھے۔ موسیقی میں اسے بے حد مہارت حاصل تھی۔ خاص کر ہندی میں ایسا کمال پیدا کیا تھا کہ اس عہد کے تمام گویے اسے "جگت گورو"

کہا کرتے تھے۔ اس نے علمِ موسیقی میں ایک کتاب لکھی تھی جس میں مسرودِ ہندی کے قواعد و ضوابط قلمبند کئے تھے۔ اس کا نام "نورس نامہ" رکھا تھا۔ یہ کتاب نظم دکنی میں تھی۔ افسوس کہ کلام نہیں مل سکا۔

اردو ئے قدیم صفحہ ۷۸

۳۸ - شاہ سید علی الحسینی محمد جیو گانو دھنی گجراتی

آپ سید احمد کبیر رفاعی کی اولاد سے ہیں اور سید عبدالرحیم کے پوتے ہیں۔ ۱۴ ربیع الاول ۹۷۳ھ کو انتقال کیا۔ اور احمد آباد گجرات میں متصل روضہ شاہ غربی میں مدفون ہیں۔ ہندی کے شاعر ہیں۔ کتاب چشتیہ میں لکھا ہے کہ مخدوم بہاء الدین برناوی جب بسبیل سیاحت گجرات تشریف لے گئے تو شاہ علی جیو کے مہمان رہے۔ شاہ صاحب نے اپنا ہندی کلام سنایا۔ اور اپنا ایک رسالہ جو نکات موحدانہ پر مشتمل تھا ہدیہ دیا۔

شاہ علی جیو کے کلام کو ان کی زندگی میں ان کے مرید شیخ حبیب اللہ نے ایک مختصر دیباچہ کے ساتھ مدون کیا ہے اور اس کا نام "جواہر الاسرار" رکھا ہے۔ آپ کا کلام موحدانہ نکات در رموز پر مشتمل ہے۔ ملاحظہ ہو ۔

اپنے بھاو جو لیا یا لور ہے ۔ سو کیوں بھیں کچھو بھی چھو لے ہے

نر کھنڈ ہو رہے اسمرا ہے ۔ سب پیو جہت بھیں بتیا ہو ا ہے

ہوں نتوں دونوں ناتوں اسی کے ۔ آہیں لے سب بھیں جیسی کے

سر کا اچھر ہو مند ر ماری ۔ ہو رہے اس منہ ندیاں ہاری

مانک موتی سکھ سنگارا ۔ اسے سب بھیں پیا کا سارا

کبھیں سو ہو وے اندھیاری راتا ۔ سانجھ تجلی کر لی وے دھاتا

ہوکہ دیوارا ئیں ساری ۔ لاکہ جوت دکھاوے بھارن

رن بھر دلی کھیلے میرے ۔ بھیں کئے ہیں میرے تیرے

اپر کھ نار ہو آپیں آیا ۔ دیکھو بھیں اونا ری لیا یا

ایک سمندوہ سات کہاوے — دھنوس بادل مینہہ ہو آوے
نہیں سمندر کر بوند دکھالے — ندیاں نالے ہوکر چالے

(پنجاب میں اُردو صفحہ ۱۶۳)

آپے کھیلوں آپ کھلاؤں — آپے آپس لے کل آؤں
مکھ پر بال بکھیر سو ساتھی — چھپ کر ہوئے رات سنگھاتی
دلی سنبھال بکھرے کیا — دن ہو آدے سورج بھیا
اپنی ایسی بوجھی سارو — بوجھی تھی ان بوجھیا دادو

(رسالہ اُردو جلد ہفتم لمحات اردوئے قدیم صفحہ ۱۷۱)

۲۹ - شیخ خوب محمد چشتی

یہ گُجرات کے رہنے والے ہیں اور شیخ کمال محمد سیستانی کے مرید ہیں۔ آپ نے ۹۸۶ھ میں تصوف کی ایک مثنوی "خوب ترنگ" تصنیف کی۔ اس مثنوی کی تاریخ شعر ذیل کے دونوں مصرعوں سے الگ برآمد ہوتی ہے بلکہ ہر مصرع سے دوہری تاریخیں نکلتی ہیں۔ ؎

خوب محمد کئے بچار — چودہ گھاٹ اور س برس ہزار

نمونہ کلام جو دیباچہ سے لیا گیا ہے ملاحظہ ہو۔ ؎

خوب کہے گا خوب ترنگ — منتیں بجھو نہ کیجو ننگ
یوں انکار نہ کیجو دیکھ — جا یو ناں تج یوں من لیکھ
مت بوجھیں اپنا جیو کرواد — اس کا کیا بوجھے برباد
جو بے قدر کنتیں نہیں پائے — جوہر تو کیا جھناں نکوائے
یہ تو جان منا تج تہڑئے — جے مقصود تجے یوں کوئے
پن اتنا کہوں گود بچھائے — مت وان سمجھے بول پرائے

(پنجاب میں اُردو صفحہ ۱۷۱)

۳۰ ۔ احمدؔ دکنی

یہ محمد قلی قطب شاہ کے زمانے میں ہوئے ہیں اور قلی قطب شاہ کے درباری شاعر ہیں۔ بادشاہ کے حکم سے "لیلیٰ مجنوں" نام سے ایک کتاب لکھی

نمونۂ کلام

مثنوی لیلیٰ مجنوں کے ابتدائی اشعار دیکھئے:۔

اس اللہ کے ناؤں سوں سب جگت — جو دانی دیاونت اُس کی صفت
مہربان سب اللہ کو جسم قرار — جو جگ کا دھنی ہور پروردگار
جو دُنیا میں کافر مسلماں کوں — منگے من سو بخشے بہو ہاں سوں
رحیمی سوں رحمت کرے سو رحیم — کریمی کے سب گن دھرے سو کریم
گنہ گار کے پاپ بھنجن کرے — گنہ بخش بخشش سوں پرسن کرے
جو احمدؔ کرے آس دھربن سنگار — سواب شہ تھے پائے تیں سنگار

(پنجاب میں اُردو صفحہ ۱۷۱)

۳۱ ۔ شیخ عثمان

آپ کی تاریخ ولادت تحقیق سے نہیں کہی جا سکتی، صرف اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ آپ بادشاہ جہاں گیر کے عہد میں ہوئے ہیں۔ وطن غازی پور تھا۔ والد کا نام شیخ حسن۔ کاشی ناگری پرچارنی سبھا نے آپ کی ایک مثنوی شائع کی ہے جس کا نام چترا ولی ہے۔ یہ کتاب اپنی شاعرانہ فضیلت کے ہندی ادب میں ایک امتیازی درجہ رکھتی ہے۔ اس کا سنِ تصنیف ۱۶۱۳ء ہے۔ چترا ولی دوہوں اور چوپائیوں میں لکھی گئی ہے۔ ایک جگہ عثمان صاحب اپنے سفر کا حال لکھتے ہیں:۔

جن پچھوں دیس کیں پیا! — بہل ہیں گا سو دیس مُلتانا

دیکھیسی سندھی لوگ سوائیں | مہی راون سب سیوہیں سائیں
ہیر سی ٹھٹھا نگر سہاوا | دہنگ ہرن سیویں گنجاوا
حاجی سنگ دل گیئو مدینا | کعبہ گئے جو صاف نہ سینا
دکھن دیس کو جے پگ دھارا | چیلاتاک سو النگ پہارا

دوہا

اُوین جا ہی کٹا چھ سر ماریران ہر لین
اُدھر بچن تت گھن دووا تی سینچ جیئو دین

مطلب :۔ محبوب کی آنکھیں دُزدیدہ نگاہی کے تیروں سے رشتۂ حیات منقطع کر دیتی ہیں، لیکن لب لعلیں سے نکلے ہوئے مسیحا نفس بول امرت پلاکر دوبارہ زندگی عطا کرتے ہیں۔

دوہا

کون بھروسہ دیہہ کا۔ جھاڑ ہو جتن اُپائے
کاگد کی جس پُتری پانی پڑے گھُل جائے

مطلب :۔ جسم فانی کا کیا اعتبار ہے، اس کے بچاؤ کے لئے تدبیریں سوچنا بے سود ہے، اس کی مثال تو اُس کاغذ کی پتلی سے ملتی جلتی ہے جو پانی پڑتے ہی گل کر نیست و نابود ہو جاتی ہے۔

دوہا

کہاں سوں بکرم سکندھی، کہاں سوں راجہ بھوج
ہم ہم کرت ہیرا ئی گئے۔ ملا نہ کھوجے کھوج

مطلب :۔ بکرماجیت اور راجہ بھوج جیسے جلیل القدر اور عظیم الشان بادشاہ اب کہاں ہیں وہ سب ہم ہم کرتے (غرور و تکبر میں مست) دُنیا سے چلتے بنے اور آج بعد تلاش اُن کا نشان تک نہیں ملتا۔

۳۳ - مولانا محمد افضل جھنجھانوی یا پانی پتی یا غازیپور

افضل کی جائے سکونت سے متعلق بہت اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ حافظ محمود شیرانی نے اپنی تصنیف "پنجاب میں اردو" میں ان کا وطن جھنجھانہ لکھا ہے۔ علی قلی خاں والہ نے ان کو پانی پت کا باشندہ بتایا ہے۔ لیکن ڈاکٹر محمد انصار اللہ نے افضل کو غازی پوری لکھا ہے۔ تفصیل ملاحظہ ہو ہماری زبان یکم مئی ۱۹۷۱ء صفحہ ۳)

میرٹھ کے قریب جھنجھانہ ایک پرانی بستی ہے جو عہدِ ماضی میں ایک مردم خیز قصبہ تھا۔ محمد افضل اس سرزمین میں پیدا ہوئے۔ ان کے حالات قطعاً تاریکی میں ہیں۔ بس اسی قدر جانتے ہیں کہ آپ نے ایک بکٹ کہانی یعنی "بارہ ماسہ" لکھا ہے۔ (پنجاب میں اردو۔ صفحہ ۱۷۹)

میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں:-

"محمد افضل۔ افضل تخلص۔ از قدیم است کدام ہندو بچہ گوپال نام بود کہ بر و عاشق شد۔ حسبِ حالِ خود بارہ ماسہ عرف "بکٹ کہانی گفتہ"

علی قلی خاں والہ کا بیان ہے کہ محمد افضل پانی پت کے باشندہ ہیں جو فضائلِ علم و کمالاتِ ظاہری و باطنی سے آراستہ اور عشق و فقر کی چاشنی سے شیریں کام تھے۔ ہندی اور فارسی میں نہایت اعلیٰ شعر کہتے تھے معلمی ان کا پیشہ تھا اور طلبہ کی ایک کثیر تعداد ان کے حلقۂ درس میں داخل تھی۔

نمونہ کلام بارہ ماسہ سے

سنو سکھیو بکٹ میری کہانی ۔۔۔ بھئی ہوں عشق کے غم سوں دوانی
نہ مجھ کو بھوک دن نہ نیند راتا ۔۔۔ برہوں کی آگ میں سینہ جراتا
اری جس شخص کو یہ دیولاگا ۔۔۔ سیانان دیکھ اس کو دور بھاگا

ساون

چترا ساون بجا مارو نکارا — سجن بن کون ہے ساتھی ہمارا
گھٹا کاری اوپر چھاتی سوں آہی — برہیوں کی نوج نے کینی چراہی
اری جب کوک کویل ہیں سوناہی — تمام بدن میں آگ لاہی

بھادوں

سکھی بھادوں نپٹ بھوتی پریری — تمام تن بدن میرا جری ری
سیہ بادر بھاروں اور پہایئی — لیا مجھ گھیر ہے آنجھوں نبایئی
پیا پردیس جا ہمکوں بسارا — نجانوں کیا گنہ دیکھا ہمارا

اسوج

سنوں سکھیو کہ رت اسوج آہی — پیارے کی خبر اب لگ نیاہی
کہو کیسی جیوں پیہر با بجہ ناری — جنہی ہدوتی کتی ہی عمر ساری
لکھوں پتیاں ارے لیجے کاگ لے جا — سلونی سانوری سندر پیاپا
سکھی اسوج رت جلتی رہی ری — پیا بن برہنی جلتی رہی ری

(پنجاب میں اردو صفحہ ۱۷۹)

۳۳۔ شیخ بہاء الدین برناوی خاتم التارکین

آپ مخدوم شیخ فرید الدین برناوی مہاجر مکہ، متوفی ۱۰۸۷ھ کے پوتے اور جانشین ہیں۔ مسلمانان ہندوستان میں صرف دو شخص فن موسیقی میں یگانۂ روزگار مانے گئے ہیں۔ امیر خسرو اور مخدوم بہاء الدین۔ امیر خسرو اس کا دیباچہ ہیں اور مخدوم اس کا تتمہ۔

مخدوم کے حالات اب تک گوشۂ گمنامی میں رہے ہیں۔ فقیر اللہ نے راگ درپن میں البتہ ان کا ذکر کیا ہے۔ مولانا حافظ محمود شیرانی کتاب چشتیہ کے حوالے سے ان کے حالات یوں لکھتے ہیں:-

"قاضی عارف برنادی نے حرف شناسی اور ہجا خوانی کرائی۔ ملّا انور رہتکی سے کتابی تعلیم حاصل کی۔ بعد میں شیخ اللہ داد آپ کے معلم تھے۔ مولوی میراں سیّد عبدالشکور سے تیمناً شرحِ عقاید پڑھی۔ جدّ امجد کے مکہ معظمہ جانے کے بعد تمام دنیاوی اشیاء مثلاً جاگیر اقربات۔ انعامات۔ وظائف۔ اثاث البیت۔ اجناس و متاع۔ ہتھیار۔ مویشی۔ گھوڑے وغیرہ کو ترک کر دیا۔ اس بنا پر آپ خاتم التارکین کہلائے۔ سفر کے بڑے شائق تھے، اکبری و جہانگیری اُمراء سے رسم و راہ تھی۔ اِن دونوں بادشاہوں سے ملاقات کی ہے موسیقی سے ان کا تعلق عشق کی حد تک تھا۔ جگری۔ خیال۔ چٹکلہ قول۔ ترانہ۔ سادرہ۔ دُھر پد لیشن پد وغیرہ میں انھوں نے اشعار لکھے ہیں۔ یوں تو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، لیکن ہندی میں زیادہ لکھتے تھے۔ ساز خیال۔ ساز کھٹ رس کے موجد ہیں۔ انھوں نے گم نام رہنا پسند کیا، اس لئے کوئی تخلص اختیار نہ کیا۔ چنانچہ ان کا کلام دوسروں کے نام سے مشہور ہو گیا۔"

نمونۂ کلام

کاہے اے بدرا ماں برست کاہے تھی ناہن گرجت کاہے نہ جھر لاوت
کاہے تھی بر کھا رُت نیوت برمن من چیتوت کاہے تھی ناں گھور گھوُ ستاوت

ان نینن کا یہی لیکھ ، ہوں تجھ دیکھوں تو منہہ دیکھ

خیال ؎

کیسیں کی سُمروں توہ من جیچپ لو کہوں کہو ڈولی
ادونیک یک یاد کرت رہے یا ہے کاج بنولی

سادرہ۔

اے اے بھائی جتیا مصاف سیاہن سرتاج   جس رہی تو ملانت نامے راج

خیال برائے شفا۔

بھا اکہ گورو کھیمو چیت نہ دھری — جنین انیرادھ ایسپرادھی کرے

بارش بند ہونے کے لئے۔

اب من مانیوری بدرانیکی بھانت جرجرۂ آئیو

نیکی ہیں گھٹا لی آتو نیکھیں گرنج سنائیو

نیکھیں نیکھیں نین تو نہیں ہلس جھڑ لائیو — (پنجاب میں اُردو صفحہ ۱۷۶)

۳۴۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی

آپ کے والد کا اسمٰعیل ہے اور شیخ محمد بن شیخ عارف بن شیخ احمد عبدالحق چشتی صابری کے مرید ہیں اور صاحب تصنیفاتِ کثیرہ ہیں۔ ان کے مکتوبات مولانا خضر بدہن بن جونپوری نے جمع کئے ہیں۔ ۹۴۵ھ ہجری میں وفات پائی۔ وہ ہندی کے بلند پایہ شاعر ہیں۔ "الکھ داس" تخلص کرتے تھے۔

نمونہ کلام۔ سرود در پردۂ پوربی

دہن کارن پی آپ سنوارا — بن دہن سکھی کنت کنھارا

شہ کھیلے دہن مانہیں ایواں — پاس پھول منہ اپجے جیواں

کیوں نہ کھیلوں پیخ سنگ ملیتا — مج کارن تیں اپنا کیتا

الکھ داس آکھے سن سوئی — سوئی پاک ارتھ پہن سوئی

سلوک

ایک تھیں ہم اننت بھیلی آپی آپ بیاہی

سہجے سہجے کیا سہنو براتما ما یا م سسر اینوائی

دوہا

ایک اکیلا آپ سو جس تھیں سنسار

آتمہ نیاتہ تھول سوں سبھی ایک اکار

سبد

جان اجان جاک کھیلے بھاگ　　کنت بلیا لیوں ہر بے لاک

عقیدہ

انکھ و اس آنکھے سن لوئے　　دُوتی دُوتی کہو مت بھائی کوئے

سلوک

اپا نانشت پرانا نشت نانشت کنجت جکترا

پدیہ باچیا منونانشت تستر دیوہی اکل بیتا

سبد

جل تھیں اپنا بلبلا جل ہی مانہہ بلائے　　تیسا یہ سنسار سبھ مولتہہ جائے سمائے

دوہا

آپا گنوائیں پی ملے پی کھوئے سبھ جائے　　اکتھ کتھا ہے پریم کی جو کوئی بوجھ پائے

(پنجاب میں اردو صفحہ ۱۶۱)

۲۵۔ رحیم

عبدالرحیم خان خاناں نام۔ رحیم تخلص۔ شہنشاہ اکبر کے وزیر اعظم بیرم خاں کے فرزند ارجمند۔ ولادت ۱۷ دسمبر ۱۵۵۶ء مطابق ۱۴ صفر ۹۶۴ھ۔ چار برس کا سن تھا کہ بیرم خاں قتل ہو گیا۔ جوان ہونے پر اکبر نے فوج میں عہدہ دیا۔ آپ ۱۵۸۴ء میں گجرات کو بطور سردار فوج کے ساتھ گئے۔ جب گجرات کا معاملہ ختم ہوا، تو اعلیٰ عہدہ دار فوج بنا دئے گئے۔ ۱۵۸۹ء میں ٹوڈرمل کے مرنے کے بعد وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ ۱۰۰۸ھ مطابق ۱۵۹۹ء میں آپ کی بیٹی جانی بیگم شہزادہ دانیال کو بیاہی گئی۔ آپ عربی۔ فارسی سنسکرت اور برج بھاشا کے عالم تھے شاعر بھی تھے اور ریختہ گوئی بھی۔ جہانگیر کے عہد میں بھی اکیس سال خدمت کی۔ ۱۰۳۶ھ کے قریب انتقال ہوا۔ آپ نے واقعات بابری کا ترجمہ ترکی سے فارسی میں کیا۔

برج بھاشا کے ایک سو دوہے لکھے جن کو "رحیمن ننتک" کے نام سے سورج نارائن ساکن جبلپور صدر بازار نے جمع کر کے ۱۸۳۱ء میں وینکٹیشور پریس سے طبع کرایا ہے کسی دوہے میں تخلص رحیم اور کہیں رحیمن ہے۔ (قاموس المشاہیر جلد دوم صفحہ ۶۱)

سنسکرت میں آپ نے علم نجوم کی ایک کتاب "کھیٹ کوتکم" لکھی ہے۔ جس میں بادشاہوں کے لئے شکار کھیلنے کے مہورت دیئے گئے ہیں۔ عہد جہانگیری کی فتوحات میں آپ کا سب سے بڑا کارنامہ تسخیر دکن ہے لیکن اس جنگ زرگری میں جو شاہجہان کی بغاوت کے نام سے مشہور ہے خان خاناں کو سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ جہانگیر، بلکہ یوں کہئے کہ نورجہان کی خفگی سے جاگیر ضبط ہو گئی۔ اور گوناگوں مصائب و شدائد سے دوچار ہونا پڑا۔ چنانچہ ایک دوہے میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

یہ رحیم در در پھریں مانگ مدھوکری کھائیں

یارو یاری چھوڑ دو اب رحیم وہ ناہیں

آپ کی ادب پروری اور شاعر نوازی آج تک زبان زد خاص و عام ہے۔ فارسی غزل کا بادشاہ نظیری۔ ہندی کا مشہور شاعر گنگ کوی آپ ہی کے پروردہ تھے تلسی داس بھی آپ سے کافی میل جول رکھتے تھے۔ آپ کی شاعری اخلاقیات اور علمی مذاق سے مملو ہے۔ چھوٹے چھوٹے دوہوں میں نہایت وسیع مضامین بھر دیئے ہیں۔ آپ کی تصانیف متعدد ہیں۔ رحیم ست سئی۔ (۲) برے نائکا بھید۔ (۳) راس پنچا دھیائی (۴) شرنگار سورٹھ (۵) مدناشٹک۔ (۶) دیوان فارسی۔ (۷) واقعات بابری کا فارسی ترجمہ۔ (۸) کھیٹ کوتکم۔ ان میں سے بروے نائکا بھید اور کھیٹ کوتکم مکمل ملتی ہیں۔ ہندی مندر پریاگ نے ایک کتاب موسوم بہ "رحیم" میں آپ کے جملہ ہندی کلام کا مجموعہ شائع کیا ہے

نمونہ کلام ہندی

تروور پھل نہیں کھاتے ہیں سرور پیئیں نہ پان

کہہ رحیم پر کاج ہت سمپتی سنچیں سجان

کہے رحیم سمپتی سگے بنت بہت بہو ریت | بپت کسوٹی جو کسے تیہی سانچے میت

جال پرے جل جات بہہ تج مینن کو موہ | رحمن مچھلی نیر کو تؤنہ چھاڑت چھوہ

جو رحیم او چھے بڑے تو اتی ہی اترائے | پیادا سے فرزین بھیو ٹیڑھو ٹیڑھو جائے

اب رحیم مشکل پڑی گاڑھے دو کام | سانچے سے تو جگ نہیں جھوٹے ملے نہ رام

پریتم چھب نینن بسی، پر چھب کہاں سمائے
بھری سرائے رحیم لکھ آپ پتھک پھر جائے

رحیم کا کلام ہندی ادب میں نہایت احترام و وقار رکھتا ہے۔ اوپر کی چند مثالوں سے ظاہر ہے کہ آپ تمثیلیہ دوہوں کے لکھنے میں کیسی قدرت کاملہ کے مالک تھے۔

رحیم خان خاناں کرشن پریم میں مست ہو کر کہتے ہیں، ؎

کمل دل نینن کی اُنمانی

بسرت ناہیں سکھی موہن تے	مند مند مسکانی
بسورہا کی بس کری مدھرتا	سدھا پگی پدرانی
انو دن شری بندرابن برج تے	آون آون جانی
اب رحیم چیتے مند طرت چلے	سکل شیام کی جانی

(اخبار سناتن دھرم پرچارک امرتسر ۳۰ ستمبر ۱۹۶۵ء)

۳۶۔ رس خان یا رس کھان

یہ دہلی کے پٹھان تھے۔ خود کو شاہی خاندان سے بتاتے تھے۔ بعض لوگ سید ابراہیم پہانی والے ہی کو رس کھان کہتے ہیں۔ آپ سمبت ۱۶۴۰ بکرمی مطابق

۱۵۸۳ء میں پیدا ہوئے۔ مُبارک کا سالِ ولادت بھی یہی ہے مُسلمان ہونے کے
باوجود آپ شری کرشن جی مہاراج کے پرستار تھے اور گوسوامی بٹھل ناتھ کے ۲۵۲
ممتاز شاگردوں میں آپ بھی ایک تھے۔ ان ویشنووں کے ذکر میں آپ کے حالات
بھی مذکور ہیں۔ شباب میں عشق کی لطیف فنوں سے بہرہ اندوز ہو چکے تھے۔ اس لئے
عشق و عاشقی کے جذبات کی ترجمانی بہت خوش اسلوبی سے کرتے تھے۔ آپ کی
تصنیف سے دو کتابیں "سُبحان رس کھان" اور "پریم باٹکا" مشہور ہیں۔ اوّل الذکر
میں ۱۲۹ چھند اور آخر الذکر میں ۵۲ دوہے ہیں۔

نمونہ کلام از پریم باٹکا

دوہا

دمپتی سُکھ اور وشے رس، پوجا نشٹھا دھیان
ان تے پرے بکھانیئے شُدھ پریم رس کھان

دوہا

کلنترّ بندھو سُت ان میں سہج سنیہہ
شُدھ پریم ان میں نہیں کتھ کتھا سبھی یہہ

دوہا

اَتی سُوچھم کومل اَتی ہی اَتی پتیرو اَتی دُور
پریم کٹھن سب تیں سدا نت اک رس بھرپور

انتخاب از سُجان رس

چھند

مانس ہوں تو وہی رس کھان بسوں برج گوکل گاؤں کے گوارن
جو پشو ہوں تو کہا بس میرو چروں نت نند کی دھینو مجھارن
پاہن ہوں تو وہی گری کو جو دھریو کر چھتر پُرندر دھارن
جو کھگ ہوں تو بسیرو کروں مل کالندی کول کدمب کی ڈارن

مطلب :- اے رس کھان، اگر تو انسان ہے تو برج اور گوکل کے گوالوں میں جا کر رہ۔
اگر تو حیوان ہے تو ہمیشہ نند کی گئووں میں جا کر اُن کے ساتھ گھاس چر۔
اگر تو پتھر ہے تو اُس پہاڑ پہ جا جس کو کرشن جی نے ہاتھ پر اُٹھا لیا تھا۔ اور
اگر تو پرندہ ہے تو جمنا کے کنارے اُگے ہوئے کدمب کے درختوں کی قطار پر اپنا آشیانہ بنا۔
کتنے دل کش، کتنے صادقانہ اور کتنے عقیدت مندانہ جذبات ہیں اور کیسی پیاری زبان ہے۔

سوَیّا

سیس گنیس مہیس دنیس سُریس ہو جاہی نرنتر گاویں
جا ہی آنادی اننت اکھنڈ اچھید ابھید سُوید بتاویں
جا ہی ہیئے لکھ آنند ہو جڑ موڑھ ہیئے رس کھان کہاویں
تا ہی اہیر کی چھوہریاں چھچھیاں بھر چھاچھ پہ ناچ نچاویں

مطلب :- شیش ناگ۔ گنیش۔ مہادیو۔ سورج اور اندر، یہ سب دیوتا لگاتار جس کی عظمت
کے گیت گاتے ہیں۔ جس کو وید میں ازلی۔ ابدی۔ لاتجزّی اور لافانی لکھا ہے۔
جس کو اپنے دل میں بسا کر میرے جیسے جاہل بھی کیفیت کا خزانہ (رس کی کان) بن سکتے
ہیں۔ کتنا تعجب ہے کہ اُس کو اہیروں کی لڑکیاں (گوپیاں) محبت اور پریم کے جادو سے ایک
چلّو بھر چھاچھ پہ ناچ نچاتی ہیں۔

نوٹ : رس خان کے زمرہ میں علی خان۔ شیخ نبی۔ میر احمد۔ تاج خان اور پیرزادی بی بی کے
نام بھی شامل کئے جا سکتے ہیں۔ (پنجاب میں اُردو صفحہ ۱۲۰)

۳۷۔ قادر بخش

قادر بخش پہانی، ضلع ہردوئی کے رہنے والے اور سید ابراہیم کے شاگرد تھے۔
ان کا سالِ ولادت سمبت ۱۶۳۵ بکرم مطابق ۱۵۷۸ عیسوی مانا جاتا ہے۔ لیکن ان کی
شاعری کا زمانہ سمبت ۱۶۶۰ بکرم مطابق ۱۶۰۳ء کے قریب سمجھنا چاہئے۔ ان کی تصنیف
تو کوئی ملتی نہیں، البتہ متفرق اشعار ملتے ہیں۔ ہندی کے اچھے شاعر تھے، ان کا

مندرجہ ذیل کبت زبان زد عوام ہے۔

گن کو نہ پوچھے کوؤ، اوگن کی بات پوچھیں
کہا بھیو دئی کلی کال یوں کھرانوں ہے
پوتھی او پران گیان ٹھٹھن میں ڈار دیت
چگل چبائن کو مان ٹھہرانوں ہے
قادر کہت یا سو کچھ کہی دے کو ناہیں
جگت کی ریت دیکھی چپ من مانوں ہے
کھولی دیکھو سب، اور سوں بھانتی بھانتی
گن نہ ہرانوں گن ناہک ہیرانوں ہے

(ہندی ساہتیہ کا اتہاس از شکل صفحہ ۲۲۱)

۳۸ - حضرت شاہ برہان الدین راز الٰہی

آپ کا اسم گرامی شیخ برھان الدین اور لقب راز الٰہی ہے۔ مگر عام طور پر آپ برہان الدین اولیاء کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ حضرت شیخ کبیر محمد بن علی صدیقی گجراتی کے فرزند ہیں۔ آپ کے جد بزرگوار کا وطن بھڑوچ (گجرات) تھا۔ ان کے انتقال کے بعد آپ کے والد میاں شیخ کبیر محمد صوبہ خاندیس میں آکر سکونت پذیر ہو گئے۔ آپ کی ولادت ۹۹۸ھ میں صوبہ خاندیش کے پرگنہ بوڈڑ کے ایک موضع راچھی میں ہوئی۔ عربی فارسی کی تعلیم اپنے عم بزرگوار کی خدمت میں رہ کر حاصل کی۔ اس کے بعد شیخ علیم اللہ سے حدیث و فقہ اور سلوک کی تکمیل کی اور دوسرے علوم متداولہ میں بھی فاضل و کامل ہوئے۔ ظاہری تعلیم کے ساتھ ساتھ باطنی تعلیم بھی حضرت ملک حسین بینانی و حضرت شیخ عیسیٰ جنداللہ قدس سرہٗ سے حاصل کی۔ حضرت ارشاد و ہدایت کے ساتھ درس و تدریس کا شغل بھی جاری رکھتے تھے۔ سماع کا بھی شوق تھا۔ آپ بڑے عابد و زاہد و مرتاض تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ جو خدا تک پہنچائے وہ دین ہے اور جو خدا سے

بازر کھے، وہ دُنیا ہے۔ آپ فارسی اور ہندی میں عارفانہ وصوفیانہ شعر کہتے تھے۔ آخر ۸۵ سال کی عمر میں ۹۸۳ھ کو وصال ہوا۔

آپ کی تصانیف میں شرح توصیف اللہ۔ وصیت نامہ اور شرح پیم کہانی یادگار ہیں۔ کتب خانہ خانقاہ رازِ الٰہی میں ان کے مخطوطے موجود ہیں۔ آپ کو ہندی میں کافی عبور تھا۔ شرح پیم کہانی ہندی دوہوں کی ایک جامع شرح ہے۔ اس کے علاوہ رازِ الٰہی کی معرفت میں ڈوبی ہوئی مثنوی "برہان رازِ الٰہی" بھی تصوف کا شاہکار سمجھی جاتی ہے۔ (ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، دسمبر ۱۹۵۵ صفحہ ۴۵۶)

۳۹۔ حضرت شاہ عیسٰی جنداللہؒ

دسویں صدی ہجری کے نصف اول میں سیاسی انقلاب کے باعث سندھ کے اکثر علماء و فضلاء اپنے وطنِ مالوف کو خیرباد کہہ کر ہندوستان کے مختلف گوشوں میں ہجرت کر گئے۔ ان میں ایک بزرگ نام ور خاندان حضرت شیخ قاسمؒ کا بھی تھا جو احمد آباد در ایلچ پور ہوتا ہوا برہان پور کی سرزمین میں اقامت پذیر ہوا۔ حضرت شاہ عیسٰی شیخ قاسم کے خلف الصدق تھے۔

آپ کا نام شیخ عیسٰی، ابوالبرکات کنیت۔ جنداللہ علی العرفاء مسیح الاولیاءؒ لقب اور جندی تخلص ہے۔ آپ کی ولادت ۵ ذی الحجہ، یوم یکشنبہ ۹۶۲ھ مطابق ۱۰ اکتوبر ۱۵۵۴ء کو ہوئی۔ ابتدائی تعلیم ان کے والد کے زیر سایہ ہوئی۔ ۹ سال کی عمر میں کلام اللہ حفظ کر لیا۔ پھر تفسیر، حدیث و فقہ وغیرہ کی تعلیم اپنے عمِ محترم شیخ طاہر محدث سے حاصل کی۔ علومِ ظاہری حاصل کرنے کے بعد شیخ محمد عارف کی بیعت میں آکر دولت سرمدی سے فیضیاب ہوئے۔ ۵ ارشوال ۱۰۳۱ھ مطابق ۱۳ اگست ۱۶۲۲ء میں جانِ عزیز جان آفرین کے سپرد کر دی۔ آپ جامع کمالات، متقی، پرہیزگار، جید عالم اور توحید کے دل دادہ تھے۔ آپ کی وفات پر ایک عقیدت کیش نے ہندی میں ایک مرثیہ لکھا ہے۔ تلاش کے باوجود مرثیہ کے مصنف کا نام اور حالات

زندگی معلوم نہیں ہو سکے۔ اُس مرثیہ کا نادر مخطوطہ کتب خانہ درگاہِ رازِ الٰہی برہانپور میں محفوظ ہے۔ جس میں ۴۴ بند ہیں اور ہر بند عموماً پانچ اشعار اور ایک دوہے پر مشتمل ہے۔ اشعار کی کل تعداد ۲۲۴، اور دوہوں کی تعداد ۴۶ ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ؎

حسین شاہ مہا گُرگیانے — جا کے کت کنوں نہیں جانے
نبیئن میں جوں نبی ہمارے — یوں ولین میں حسین پیارے
حُکم کیا ہر سرگ بنا دو — بُرنہیں اک ٹھور ملا دو
جگ بھیو سب جگ کو چیرو — بُرنہیں تن کیو بسیرو
کشمیر اور دلی آگرے — جگ نگر دکن او سگرے
کہت گئے ہیں سب سیانے — امر بھئے تے مرہی جانے

یہ طویل مرثیہ ذیل کے بند پر ختم ہوتا ہے ؎

کیا کوئی جانے گُرُکے باتا — لے دو یک پیہ کے رنگ راتا
وا کے کت واہی نہیں جانے — اور کوئی کیا تا او پچھانے
مور کھ لوگ لکھن مہو ہیا — معراج لکھین کہیں مرثیا
مرثیہ کیوں کہیو جائے — کور سلتا جاء سمند سمائے
کور سلتا ہر سمند سمانے — جیوں مصری بہل جا پچھانے

(از مجلّہ معارف اعظم گڑھ جلد ۹ نمبر ۳ ماہ ستمبر سنہ ۱۹۵۶ء)

۴۰۔ میر سیّد دوست محمد برہان پوری

"پیم کہانی"، جیسی مشہور ہندی نظم کے خالق میر سیّد دوست محمد برہان پوری حضرت میر ابو العلا اکبر آبادی کے خلیفہ تھے۔ میر دوست محمد برہان پور (مدھیہ پردیش) کے ایک خدا رسیدہ بزرگ تھے جو ایک مدت تک یو۔پی۔ بہار۔ بنگال کے صوبوں میں سیر و سیاحت کرتے رہے۔ سنہ ۱۰۹۰ھ میں بمقام برہان پور وصال ہوا۔ بعض مورخین و محققین نے

"پیم کہانی" کا مصنف شیخ برہان الدین راز الٰہی کو لکھا ہے جو غلط ہے۔ راز الٰہی نے "پیم کہانی" کی شرح لکھی ہے، وہ اس کے مصنف نہیں ہیں بلکہ شارح ہیں۔ شیخ سید دوست محمد کے مزار کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض اورنگ آباد (دکن) اور بعض الٰہ آباد (یو۔پی) میں بتاتے ہیں، لیکن دراصل ان کا مزار برہان پور (مدھیہ پردیش) میں ہے۔ نمونہ کلام از "پیم کہانی"

دوہا

پیم کہانی کہت ہوں سُنیو سکھی تم آئے
پیو ڈھونڈن ہوں گئے آئے آپ گنوائے

پیم کہانی سو سُنے جو تن من دھن دے ہار
اپنے پیو پر اور نیک نہ لاوے بار

پیم نگر میں آئی سکھی بس بدھ بھیو کون
شبد یہ لیں ہے جو پانی میں لون

سوئے تھے سکھ چین سوں گھر اپنے پاؤں پسار
موہن مو ہر جگانے کے لئے پھر او دوار کی دوار

ملنے کیسے جاؤں گگر یا بھاری موہن ہٹ باٹ
دو ہیئے در کٹھن ہیں کھینچت ہیں بن جات

پیم گلی اتی سانکری پیؤ بن کچھو نہ سمائے
تن من جھور جو اس کو ئے ایا جائے

(ماہنامہ سب رس بابت فروری مارچ ۱۹۵۸ صفحہ ۹)

۱۴۳ - بایزید انصاری

اس شخص نے ایک فرقہ جلالی کی بنیاد ڈالی تھی۔ بموجب بیان مصنف "دبستان المذاہب" کے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۵۲۶ء میں جالندھر (جو پنجاب میں واقع ہے) میں پیدا ہوا تھا۔ اس مقام میں فقط یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ یہ مصنف "دبستان المذاہب" اور "اخوان درویزہ" جو مصنف "مخزن افغانی" کا ہے۔ بیان کرتے ہیں کہ بایزید انصاری مذکور سے اول تصنیف پشتو زبان میں جاری ہوئی۔ اور ہندی۔ فارسی۔ عربی میں بھی اس کی تصنیفات ہیں۔ بات یہ ہے کہ اس نے ۔ ۔ ۔ ہندی میں واسطے توضیح اپنے مسائل ہندوؤں کے واسطے اور فارسی میں ایرانیوں کے لئے اور پشتو میں افغانوں کے واسطے کتابیں تصنیف کی تھیں۔ سوائے اور تصنیفات کے ایک کتاب "خیر البیان" اس نے تصنیف کی ہے۔

لوگ اس کتاب کو کتابِ الہامی سمجھتے ہیں۔ ذیل کے دوہے اس کے ہیں ۔

گھڑی گھڑی گھڑیال پکارے بریت گئی اور وہ لب ہی ہے
سو سو کہا اچیت جاگ چپ ہو سے چلی آج کی کال نیا وجیو رہے
گنجر من میت دی تو ہارے کا من کنک کلیس ڈی نرنبار ئے
ہر بھگت تن شون یہ پٹی تو پانے اور رام بھجن میں دیہہ گلے تو گائیے
دو دیپک بال محل میں سو یتے ماری سے کر بینہ جگت نہیں جو تے
سوندھا تیل لگائے پان سکھ کھائیں گے بنا بھگت کینہا جائیں گے

(نقل از تذکرہ تاریخ شعرائے اردو طبقات الشعرا
مطبوعہ مطبع الالعلوم، مدرسہ دہلی سنہ ۱۸۴۸ء
مولفہ مولوی کریم دہلوی صفحہ ۲۴ - ۲۵)

۴۲ - جان محمد

شاہ جان محمدؐ فقیر، مصنف "پریم لیلا"۔ قلی خاں کی فہرست میں ایک کتاب قلمی جلد کی موجود ہے۔ (تذکرہ طبقات شعرائے ہند ۳۳)

۴۳ - درویش گجراتی

شاہ علی نام، گجرات وطن، درویش تخلص، یہ مصنف ایک کتاب "دوہرہ" کا ہے۔ جس میں مضامینِ صوفیانہ مندرج ہیں۔ اور ایک کتاب اس نے "صندل سندگار" تصنیف کی ہے۔ یہ ایک قسم کوک شاستر کی ہے۔
(تذکرہ طبقات شعرائے ہند۔ صفحہ ۱۸۴)۔

۴۴ - سید ہاشم بیجاپوری

سید شاہ ہاشم علوی شیخ وجیہ الدین گجراتی کے بھتیجے اور شیخ برہان الدین کے فرزند

تھے۔ ابراہیم عادل شاہ جگت گورو (۹۸۸ھ تا ۱۰۳۵ھ) کے زمانہ میں بیجاپور میں تشریف لائے اور محمد عادل شاہ (۱۰۳۵ھ تا ۱۰۷۰ھ) کے زمانہ میں ۹ رمضان ۱۰۵۹ھ کو انتقال کیا۔ شاہ مراد بن شاہ جلال نے جو آپ کے مرید خاص تھے، آپ کے اذکار و اشغال اور ہندی ابیات و اقوال جمع کئے اور اس مجموعے کا نام "مقصود العاشقین" رکھا۔ کتاب مذکور سے چند اقوال ہم نقل کرتے ہیں ؎

۱ ہاشم جی کی سنیئے بات جس نے رکھی باسی بھات
اُکا جاوے ہاتے ہات

۲۔ باپ کے اُتنا دیوے سو پوت باپ نہیں دیوے سو سپوت
باپ کا دِیا جو چھینے سو کپوت

۳۔ دنیا چھوڑی شیخ کہائے یہ حجاب تجھ بھوے نائے
دینی شنیچی سوں یک میدان پیلے جھوٹے دوجے شیطان

(اردوئے قدیم صفحہ ۲۵)

۴۵۔ شاہ نظام الدین

شاہ نظام الدین "شاہ ہاشم" کے ایک مرید خاص تھے صاحب مقصود العاشقین نے ان کا بھی ایک ہندی دوہا نقل کیا ہے

نظام بندگی کرے تو کیا ہووے اول جس کا نہیں دل صفا
جامہ بھونڈے میں ڈب رہا اُسے خوشبو لگائے تو کیا نفا

(اردوئے قدیم صفحہ ۲۶)

۴۶۔ ابراہیم عادل شاہ

ابراہیم عادل شاہ کو موسیقی میں بے حد مہارت حاصل تھی۔ خاص سرود ہندی میں ایسا کمال پیدا کیا تھا کہ اُس عہد کے تمام گویّے اُسے جگت گورو

کہا کرتے تھے۔ اُس نے علمِ موسیقی میں ایک کتاب لکھی تھی جس میں سرود ہندی کے قواعدُ ضوابط قلم بند کئے تھے اور اس کا نام "نورس نامہ" رکھا تھا۔ یہ کتاب نظم دکنی (جو ہندی کی ایک شاخ ہے) میں تھی۔ ملا ظہوری نے فارسی میں اس پر دیباچہ لکھا تھا جو اس وقت بھی موجود ہے اور "سہ نثر ظہوری" کے نام سے مشہور ہے۔

(اُردوئے قدیم صفحہ ۷۸)

نمونۂ کلام

جھنن جھنن جھن موتی خاں کی تانت گا جے

تال برد ننگ بھیہ۔ سوں نورس باجے

اِس جگ میں وہ کچھ لیجئے　　ایک تنبور ایک کامن کیجے

(ماہنامہ آجکل دہلی کا موسیقی نمبر اگست ۱۹۵۶ء صفحہ ۶۳)

آئیں مل رے پیارے سجن　　نول لال دال رجھبن

یا قوتی ہرو بجر نی گھنی　　پانی پیک رس بیچ دھنی

ادھر سیپی ڈھال موتی بچن　　زہرا مشتری تخشاوی چند بدن

(ماہنامہ آجکل دہلی کا موسیقی نمبر اگست ۱۹۵۶ء صفحہ ۸۲)

۴۷۔ رستمی

رستمی کا نام کمال خاں اور اس کے والد کا نام اسمعیل خاں ہے۔ اس نے ۱۰۵۹ھ میں "خاور نامہ" کا ترجمہ فارسی سے نظم دکنی میں کیا ہے۔ یہ کتاب شاہ نامہ فردوسی کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ اس میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السّلام کے محاربات مذکور ہیں۔ بلوم بارٹ نے "خاور نامہ" کی ابتدا اور اختتام کے حسب ذیل ابیات نقل کئے ہیں:-

آغاز:-　　اول جب کیا لو کتاب ابتدا　　بند یا بات میں نقش نام خدا

اٹھے ایک صاحب آپر مہو ر تلیں　　جو سبھتی پراس کی گواہیں ہیں

خاتمہ

خاور نامہ دکنی کہتا ہوں نام　　ہوا خاوراں پر قصّہ سب تمام
اس او پر بہت گذرے گا روزگار　　اچھے گا یو دُنیا میں روزگار

(اُردوئے قدیم صفحہ ۸۳-۸۴)

نوٹ:۔ شاہ نوراللہ۔ مرزا مقیم۔ مرزا دولت شاہ اور حکیم آتشی اکثر فارسی گو تھے۔ اور ہندی شعر بھی کہتے تھے یہ سب علی عادل شاہ کے زمانے میں ہوئے۔ دربار عادل شاہی کے شعراء کی تعداد اگرچہ سینکڑوں سے متجاوز ہوگی، مگر تذکرہ نویسوں کی بے اتفاقی سے اُن کے نام تک ناپید ہو گئے۔

(اُردوئے قدیم صفحہ ۸۰)

۸۰۔ نصرتی

نصرتی کا نام شیخ نصرت اور وطن بیجاپور ہے۔ اُن کے آباؤ اجداد بیجاپور میں فوجی ملازم تھے۔ نصرتی نے محمد عادل شاہ (۱۰۳۰ ہجری تا ۱۰۶۷ ہجری) کے زمانے میں دربار تک رسائی حاصل کی۔ نصرتی کی تصنیفات سے تین مثنویاں ہیں۔ علی نامہ گلشنِ عشق۔ گلدستۂ عشق۔ ۱۰۸۱ھ ہجری میں وفات پائی۔ مثنوی علی نامہ کا آغاز حسب ذیل بیت سے ہوتا ہے۔ ؎

سراسر اُس مسکت دار کوں　　کہ آدھار ہے ان نہ آدھار کوں

مثنوی گلشنِ عشق کی ابتدا یوں کی ہے ؎

صفت اُس کی قدرت کی اوّل سراؤں
دیر یا جس نے یو گلشنِ عشق تاؤں

(اردوئے قدیم صفحہ ۸۴)

نصرتی نے "علی عادل شاہ" کے زمانۂ شہزادگی کی تعریف یوں کی ہے۔ ؎

رنگی تب نکلی منج اُوپر تھے پلی ۔۔ سکی شاخ جب بار دھرتے چلی
مرا شاہ بوجک رہے جو بری ۔۔ وہ شہزادگی ہیں اتھا مشتری
نین بان لاگی ہے کاری منجے ۔۔ لگے چٹ پٹ رات ساری منجے
پیاری آدک پیار ہور لطف سوں ۔۔ آوہ نصرتی کر پکاری منجے
انگو جل بھری منج نین ہے بدل ۔۔ ہیرا ہر انجھو ہے سورج کے پچل
نوے چاند سا نہہ جو بالا اتھا ۔۔ چرنت بد رون دن اُجالا اُتھان

(اُردو شہ پارے۔ صفحہ ۵۲-۵۶)

۴۹۔ ہاشمی

ان کا نام سید میراں اور وطن بیجاپور رہے۔ سید شاہ ہاشم علوی کے مُرید تھے اور اسی مناسبت سے ہاشمی تخلص کرتے تھے ۱۰۵۶ھ میں آپ کا انتقال ہُوا ہے آپ نے یوسف زلیخا کا افسانہ منظوم کیا ہے۔

نمونہ از یوسف زلیخا

ثنا احمد اس کون سزاوار ہے ۔۔ سگل عشق جس کا یو وستار ہے
یہی غلغلہ ہور ہیا ٹھار ٹھار ۔۔ زلیخا ہر ایک رہ جاتی ہے بہار
پڑی ایسی دی ہے پچیل ہور چپور ۔۔ نے ڈر ہے وہ عورت جلم کی ڈھنڈور
نی ڈر لاج ہٹری چھپر سر کو کھول ۔۔ قبیلے کو سب اپنے لاتی ہے بول
چلن تر تو اس سے سیج نین کسے ۔۔ اول دیو بر صمنگ نی بنی کی اسے

۵۰۔ شیخ سعدی کاکوری یا دکنی

بعض تذکرہ نویسوں نے ان کو شیخ سعدی شیرازی اور بعض نے شیخ سعدی دکنی بتایا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ نہ شیرازی ہیں نہ دکنی، بلکہ شمالی ہندوستان کے باشندے ہیں۔ شہنشاہ اکبر (۹۶۳ھ تا ۱۰۱۴ھ) کے معاصر تھے۔ ۱۰۰۲ھ

ہیں ان کا انتقال ہوا ہے۔ ملّا نظام الدین کا بیان ہے کہ یہ کاکوری کے رہنے والے تھے۔ (طبقاتِ اکبری۔ صفحہ ۲۹۵)

ملا عبدالقادر بدایونی نے بھی اپنی تاریخ کے صفحہ ۲۸۶ پر ان کا ذکر کیا ہے۔ اور بختاور خاں نے لکھا ہے کہ:۔

"طبع موزوں داشتے و بزبانِ فارسی و ہندی شعرے نیکو گفتے"

نکات الشعراء سے ان کے مندرجہ ذیل ابیات منقول ہیں:

ہمن تمن کو دل دیا، تم دل لیا اور دکھ دیا
ہم یہ کیا، تم وہ کیا، ایسی بھلی یہ پریت ہے

دو نین کی کھپر کہوں اور دو انجھواس ہیں بھریں
پیشِ سنگ کو نیت پھروں پیاسا نہ جائے میت ہے

تذکرہ میر حسن صفحہ ۸۷ پر بھی ان کے حالات مندرج ہیں۔

۱۶۔ شاہ میران جی

شمس العشاق شاہ میراں جی بیجاپوری اولیاء کبار سے ہیں۔ خواجہ کمال الدین بیابانی کے خلیفہ تھے۔ خواجہ صاحب نے شیخ جمال الدین مغربی سے خلافت حاصل کی تھی۔ شیخ جمال الدین، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے خلفاء سے تھے۔

حضرت میراں جی نے بارہ حج کئے اور یوسف عادل شاہ کے عہد میں آکر بیجاپور میں سکونت اختیار کی۔ ۲۵ شوال سنہ ۹۰۲ھ کو انتقال کیا۔ آپ کا گنبد حصار بیجاپور سے باہر شاہ پور میں ایک ٹیلہ پر واقع ہے۔ (اردوئے قدیم صفحہ ۸۱)

نمونہ کلام

اس کارن تجھ کو دل دن	اور تیرا نام لیوں
تجھ بن نا کون جانے	اور پوری صفت پچھانے
ہے تیرا انت نہ پار	کس مو کہوں کروں اُچار

سب حال تجھ پر بہنا   رَ اکھے نیوں رہنا

دوہا

نا اُس روپ نا اُس ریکھ نا اُس تھان مکان
نوگنا گن ونتا کرو اکس مکھ کروں بکھان

صفتنا کروز ہیں اللہ کیری جے پوری پورن پور
فنا در قدرت انگیکاروں نیڑے نا دُور

(رسالہ اُردو جلد ہفتم)

۵۲ - شیخ برہان الدین جانم

شاہ برہان الدین جانم شاہ میراں جی کے بیٹے اور خلیفہ تھے۔ باپ کی تعلیم و تربیت سے وہ بہت جلد ایک جیّد عالم اور بہت بڑے صوفی بن گئے۔ سنہ ۹۹۹ ہجری میں وفات پائی۔ ان کی تصنیفات یہ ہیں۔ (۱) سکھ سہیلا۔ (۲) منفعت الایمان۔ (۳) ارشاد نامہ (۴) دوہے اور غزلیں۔

ڈاکٹر عبد الحق سکریٹری انجمن ترقی اردو نے خطبات الحق حصہ دوم میں ان کا ہندی کلام پیش کیا ہے۔ ؎

دوہا

نینہہ کا پینا مجھ لولا گا۔   لوگ دیوانی دیکھ ہنسیں
جگ کی ہانسی کیا جج ہوئے   کہو سر یجن کہاں بسیں

دوہا

تیں بھی میرالاڑ چلا یا کبھو نہ ہوا ادواس
آپ سند یہ توڑ گنوا ہیں تیرا ہی منج آس

یہ سب بولوں ہندی بول   پُن تو انو جہ مجھ میتی کھول
اوُنہ راکھے ہندی بول   مانی تو چکھ دیکھیں کھول

ہندی بول کیا وکھان	جس کے پرساد تھا منج گیان
جے ہودیں گیان بچاری	تا دیکھیں بھا کا گجری

(خطبات عبدالحق صفحہ ۳۶ مورخہ ۲۲ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء)

۵۳ - امین

گجرات کا درباری شاعر ہے۔ سکندر منجھو نے اس کا نام ملک امین کمال لکھا ہے۔ سلطان بہادر (سنہ ۹۳۲ھ تا ۹۴۳ھ) اور محمود شاہ ثانی (سنہ ۹۴۳ ہجری تا سنہ ۹۶۱ ہجری) کے ندیمان خاص سے تھا۔ لطائف اور بدیہہ گوئی کے حکایات مراۃ سکندری میں مذکور ہیں۔ گجرات کا مشہور بزرگ شاہ عالم سراج الدین سید محمد حسینی (سنہ ۸۸۰ھ) سے اس کو خاص ارادت تھی۔ اس نے بہرام گور اور حسن بانو کے حسن و عشق کا قصہ نظم کرنا شروع کیا تھا۔ جو نصف سے زیادہ انجام پا کر ناتمام رہ گیا تھا۔ لیکن بعد میں ایک دوسرے شاعر جس کا تخلص دولت ہے نے اسے تمام کیا۔ ابتدا اس کی حسب ذیل شعر سے ہوتی ہے ؎

الہی جہان کا کرن ہار توں
غریبوں بیچیوں کا او دھار توں

(اُردوئے قدیم صفحہ ۴۸ - ۴۹)

۵۴ - ندیم

ندیم نواب شاہی دور کا ایک گمنام مرثیہ گو ہے۔ جس کے حالات کسی تذکرے میں نہیں ملتے۔ "اڈنبرا" کی لائبریری میں اس کی بیاض موجود ہے جس ذکر ڈاکٹر محی الدین زور قادری نے "ورد شہ پارے" جلد اول میں کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ:

"یہ مرثیہ خاص طرز کے مرثیوں سے ہے۔ قدیم شاعر بعض وقات غزلیں بھی اسی نوعیت کی لکھتے تھے۔ زبان نہایت پاکیزہ ہے اور ساتھ ہی

مرثیہ بھی پُر اثر ہے"۔ مرثیہ ملاحظہ ہو ؎

ہے ہے اصغر ابن احسن سُونا تیرا پالنا
رو رو بانو کرتی ہے بَین۔ سُونا تیرا پالنا

تھا تُو شہ کا من کا چاؤ۔ مجھ دکھیا کے من کا بھاؤ
کاری ہے مج دل پہ گھاؤ۔ سُونا تیرا پالنا

تھل تج پر ایسا گھات مج کوں بھی لیجا تا سات
اصغر مج سوں کر کچھ بات۔ سُونا تیرا پالنا

کیوں کر دیکھا نیر اُمکھ، تج پر بھاری برم دکھ
جینے کا اب کیا ہے سُکھ۔ سُونا تیرا پالنا

تج بن جوگن کا کر بھیس، راکھ لگا موں کھولے کیس
تج کو ڈھونڈوں دیس بدیس۔ سُونا تیرا پالنا

دُکھ کی کفنی پہنوں تن غم کی دھونی جالوں من
تُج بن ہو گو کھسر ہے بن۔ سُونا تیرا پالنا

(اڈنبرا بیاض مرثیہ نمبر ۱۴۳ - اُردو شہ پارے صفحہ ۳۰۹)

۵۵۔ سیدن

قطب شاہی دور کے اس مرثیہ گو کے ذکر سے بھی تذکرے خالی نظر آتے ہیں۔ ٹھیٹھ دکنی زبان میں اس کی ایک بیاض "اڈنبرا" لائبریری میں محفوظ ہے "ایک نئی طرح کی شادی" کے عنوان سے بالکل نئی طرز کا مرثیہ ہے۔ موت کو شادی کی صورت میں پیش کرنا انتہائی رجائیت ہے۔

مرثیہ

ماہ محرم میں دیکھو چندرا ہو ماں آیا
تارے گگن کے گوندکر سہرا جو شہ کوں لائیا

کنگنا ستم کا باندھ کر دوکھ اُبٹنا کون لگا

حسرت کی چوکی کے اُوپر انجھوان سے تن نہایا

دولا عینا پھر تر تنگ سر ڈال کھنا نور کا

سارے براتی ساتھ لے دولھن کو بیاہنے دھایا

سیدن ستّا شہ کا بید بیداں تر کرے لال

نینوں کی مشکاں اٹک سوں بھر بھر کے نت چھڑکایا

(بیاض مرثیہ نمبر ۱۲۲) اُردو دستہ پائے صفحہ ۳۱۲)

۵۶ - نامعلوم الاسم

انڈیا آفس لائبریری لنڈن کی جو فہرست کُتب " بلوم ہارٹ " نے ترتیب دی ہے اس میں ایک ہندی نظم کا ذکر ہے جس کے لکھنے والے کا نام اور حالات کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ " بلوم ہارٹ " نے صرف اتنا لکھا ہے کہ:

" ایک اسلامی الٰہیات کی نظم دکھنی زبان میں ہے جس میں ہندی الفاظ زیادہ ہیں "

انڈیا آفس کا یہ نسخہ ۵ جلوس محمد شاہ کا لکھا ہوا ہے۔ کتاب تصوف میں لکھی گئی ہے عنوانات قائم کئے گئے ہیں اور ہر عنوان " چو لے " اور دوہرہ کے تحت لکھا گیا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

چولے

ات اچرج کہوں ایک پہیلی	جیو نہیں ہوئی جو سی سنبھلی
پوچھا تاں کیونکر کٹ آیا	کون کون یہ بھبکھ بھر آیا
" لاتعین " ذات کہاوے	جی کی بات کہی نہ جاوے
ڈبکی دے لی غوطہ کھاوے	پیر پیمبر تو نہیں پاوے
مہا اگم سمندر کہایا	جا کو پار نہ کنہوں پایا

جو سو بودھی ڈبکی کھاوے ‏ مر مرجئے تو مالک پاوے
ڈبکی لے لے جسم گنواوے ‏ واکے تھاہ نہ کبھوں پاوے

دوہرہ

تان ات الہ رنجن کبھی مان کے کچھو ات ‏ کویکی سیابا ئیا سم سمر چھپات

(رسالہ معارف اعظم گڑھ جلد ۲۶ شمارہ ۱ صفحہ ۲۷-۲۸)

۵۷۔ رحیم

یہ ایک درویش منش ہندی شاعر رحیم خان خاناں کا ہم عصر اور ہم زبان ہے۔ حالات پردۂ اخفا میں ہیں۔ طبقات الشعراء صفحہ ۷۵ سے ایک شعر اس کا ملا ہے جو ہدیۂ ناظرین ہے۔

رتی بھر دات نہیں ہیانہ مجھ کو چین دن اتنا
سکھی بھری بھری پیتا بتاری ساجے کو

۵۸۔ سلطان حسین شرقی

یہ جون پور کے شرقی خاندان کا آخری بادشاہ تھا۔ فنِ موسیقی میں ایسا ماہر تھا کہ کسی گویے کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ اسے بارہ راگنیوں کا موجد بتایا جاتا ہے۔ جن میں سے گور سیام۔ ملار سیام اور بھوپال سیام وغیرہ مشہور ہیں۔ چار توڑیاں اور ایک اساوری بھی اس نے ایجاد کی تھی جو جونپوری توڑی اور جونپوری اساوری سے مشہور ہیں۔ بعض کے نزدیک خیال بھی اس کی اختراع ہے۔ چنانچہ واجد علی شاہ اسے دھرپد کی جگہ خیال ہی کا نایک مانتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس نے بہت سے خیال لکھے ہیں۔ اس نے ۱۹ سال حکومت کی۔ ۴ برس معزول رہا۔ اور ۹۰۵ھ مطابق ۱۴۹۹ء میں مرگیا۔

(آجکل دہلی موسیقی نمبر اگست ۱۹۵۶ء صفحہ ۳۲)

۵۹۔ سلطان مظفر گجراتی

یہ سلطان محمود بیگڑہ والیِ گجرات کا بیٹا اور وہاں کا آٹھواں بادشاہ تھا۔ علم و فضل اور عدل و انصاف کی صفتیں قدرت نے عطا کی تھیں، اس لئے رعایا میں بہت مقبول تھا۔ اس نے علم موسیقی میں پوری مہارت حاصل کی تھی۔ خوش آواز بھی بہت تھا ہر ساز کے بجانے پر قدرت تھی۔ اس کے عہد کے استاد اس کی شاگردی پر فخر کرتے تھے اور تمام فنونِ موسیقی میں کامل مانتے تھے۔ اس نے اپنی سرپرستی سے گجرات کو موسیقی کا مخزن بنا دیا تھا۔ ۵۶ سال کی عمر میں ۲ جمادی الآخر ۹۳۲ھ مطابق ۱۵۲۶ء کو انتقال کیا۔

(ماہنامہ آجکل دہلی کا موسیقی نمبر اگست ۱۹۵۶ء صفحہ ۱۰۳)

۶۰۔ سلطان بہادر

سلطان مظفر کا بیٹا سلطان بہادر والیِ گجرات بھی موسیقی کا مربّی تھا۔ نائک بخشو اور نائک بیجو اس کے درباری موسیقار تھے

۶۱۔ سلطان محمود ثانی

سلطان مظفر کے پوتے سلطان محمود ثانی ۹۶۱ھ مطابق ۱۵۵۴ء کے وزیر دریا خان نے بھی فن کی بڑی قدر و منزلت کی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے عہدِ وزارت (۹۴۵ھ تا ۹۶۱ھ) مطابق (۱۵۳۸ء تا ۱۵۵۴ء) میں احمد آباد کے در و دیوار سے نغموں کی صدا آنے لگی اور گھر گھر گانے بجانے کا چرچا ہو گیا۔ اس کے دربار کے کلاونتوں میں سے ۔ بہ ذیل کا ذکر مرأت سکندری میں کیا گیا ہے۔ ۱۔ نائک بھنو۔ اس کا نغمہ نائک گوپال کی طرح مردہ ہڈیوں میں روح پھونکتا تھا۔ ۲۔ نائک حسینی۔ یہ نائک بخشو کا بھتیجا تھا اور اپنے عہد کا بہت بڑا گویا مانا جاتا تھا۔ ۳۔ رنگ خاں۔ ۴۔ ملھی۔ یہ دونوں نائک جیتر کے بیٹے تھے۔

(ماہنامہ آجکل دہلی کا موسیقی نمبر اگست ۱۹۵۶ء صفحہ ۱۰۳-۱۰۴)

۶۲۔ نائک بخشو

اس نے راجہ مان والئے گوالیر سے تربیت پائی تھی۔ عام طور پر گویئے کم از کم دو مل کر اچھا گاتے ہیں لیکن یہ تنہا اچھا گاتا تھا اور ٹیپ نہایت بلند اٹھاتا تھا۔ الاپ میں انوکھے طرز کا مالک تھا۔ اس نے دھرپد کو درجۂ کمال پر پہنچا دیا تھا۔ گانے میں یہ اثر تھا کہ جنگلی ہرن سر جھکا کر اس کے سامنے کھڑے ہو جاتے تھے اور یہ پہچان کے لئے

اُن کے گلے میں مالا ڈال آتا تھا۔ راجہ مان کے بعد کچھ دن راجہ بکرماجیت کے پاس رہا جب اُس کا مُلک ہاتھ سے نکل گیا تو راجہ کیرت والیٔ کالنجر کے پاس چلا گیا اور کچھ دن وہاں گزارے۔ سُلطان بہادر گجراتی نے اس کے کمال کا چرچا سُن کر راجہ کیرت سے مانگ لیا اور اپنی ملازمت میں داخل کرکے بہت مسرور ہوا۔

نائک بخشو نے بھی بہت تصرفات کئے ہیں۔ چناں چہ توڑی میں دیسکار کو داخل کر کے سُلطان بہادر گجراتی کے نام پر "بہادری توڑی" نام رکھا۔

اسی طرح کانہڑے میں سیام میں داخل کر کے "نائکی کانہڑا" نام رکھا۔ اور کلیان میں تصرف کر کے "نائکی کلیان" مشہور کیا۔ بقول صادق علی خاں۔ "آج تک ہندوستانی گویّوں کا دارومدار بخشو اور تان سین کی تصنیفات پر ہے"

(ماہنامہ آج کل دہلی کا موسیقی نمبر اگست سنہ ۱۹۵۶ء صفحہ ۱۰)

یہ خیال نائک بخشی کا ہے۔ راگ ٹوری اور تال تین تال ہے ؎

استائی

بر مہر سنی سے مانگت ہوں ودّیا ادک سر رس نر رس کیجیے جگت گنین کو ترسوں۔

انترہ

ردّھ سدّھ کے داتا۔ راگ شوبہت ہے۔ بخشو کو ن دیوی دیا نی اپنے کو ریسوں۔

(ماہنامہ شاعر بمبئی کا قومی یک جہتی نمبر سنہ ۱۹۷۴ء صفحہ ۲۲۵)

(از مقالہ، عظمت حسین خاں میکش)

۶۳۔ نائک بیجو

یہ اپنے عہد کے کلاونتوں کا سردار مانا جاتا ہے اور بیجو باورا کے نام سے مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے لوہاروں کی بھٹی جھونک جھونک کر گزر کی، اور فن سیکھتا رہا تا آں کہ ماہر موسیقی بن گیا۔

اس کے گانے کے اثر کا اندازہ اس سے کیجیے کہ جس زمانے میں ہمایوں نے

گجرات کو تسخیر کرنے کا ارادہ کیا اور شہر مانڈو مفتوح ہوا تو منگل کے دن بادشاہ نے لال کپڑے پہن کر قتلِ عام کا حکم دے دیا۔ اس ہنگامے میں نائک بیجو جو سلطان بہادر کا مقرب تھا ایک مغل کے ہاتھ پڑ گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اسے قتل کر دے۔ نائک نے کہا کہ میرے مار ڈالنے سے تجھے کیا فائدہ پہنچے گا۔ میں اپنے برابر سونا تول کر دے دوں گا کیوں کہ میں سلطان بہادر کا مقرب ہوں۔

مغل اپنی پگڑی سے اس کے ہاتھ باندھ کر الگ بیٹھ گیا۔ اتفاقاً ایک راجہ جو ہمایوں کے ساتھ تھا اور بیجو کو جانتا تھا اُدھر سے گزرا اور بیجو کو مغل سے چھڑا کر اپنے ساتھ لے گیا۔ مغل تلوار کھینچ کر شور مچاتا پیچھے ہو لیا۔ یہاں تک کہ دونوں بادشاہ کے حضور میں پہنچ گئے۔ بادشاہ اس وقت بڑے غضب میں تھا مغل نے شور مچایا کہ میرا قیدی جو سلطان بہادر کا مقرب ہے، اس ہندو راجہ سے مجھے دلا دیجئے۔ اس دوران میں خوشحال بیگ تورچی جو اکثر سلطان بہادر کے پاس جایا کرتا تھا اور بیجو کو پہچانتا تھا کہنے لگا یہ کلاونت گویوں کا بادشاہ ہے۔

ہمایوں نے اُس کی طرف غصے سے دیکھا۔ اس نے پھر وہی لفظ دہرائے اور کہنے لگا "قربان جاؤں، لوگ کہتے ہیں کہ اس زمانے میں اس کا ثانی موجود نہیں۔"

بادشاہ کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ بیجو کو حکم ہوا کہ کچھ گائے۔ بیجو فارسی نغموں میں بڑی مہارت رکھتا تھا۔ فوراً گانے لگا۔ بادشاہ پر بڑا اثر ہوا اور اس کے مزاج میں فوراً تغیر ہو گیا۔ غضب رحم سے بدل گیا اور سرخ لباس اُتار کر ہرا خلعت پہن لیا اور بیجو کو خلعتِ خاصہ دے کر فرمایا کہ جو چاہے گا پائے گا۔ اس نے عرض کیا کہ میرے بہت سے عزیز و اقربا گرفتار ہیں اللہ کی رہائی کا حکم ہو جائے۔ بادشاہ نے منظور کر لیا اور خاصے کا ترکش بیجو کی کمر میں باندھ کر اور خاصے کا گھوڑا دے کر چند مقرب ہمراہ کر کے فرمایا کہ بیجو جس کسی کو چھڑانا چاہے، وہ چھوڑ دیا جائے۔ بیجو نے بہت سے اپنے شناسا چھڑا لیے۔ ہمایوں نے اسے اپنا مقرب خاص بنایا اور انعام و اکرام سے نوازنے لگا۔ بیجو جو انعام پاتا اُس مغل کو دے دیتا اور کہتا کہ اس نے میری جان بخشی کی تھی۔ کچھ مدت کے بعد

بیجو بھاگ کر سلطان بہادر کے پاس چلا گیا۔ سلطان بہادر نے اُسے دیکھ کر کہا کہ میں نے اپنی کھوئی ہوئی دولت پائی۔ ہمایوں کو معلوم ہوا کہ بیجو بھاگ گیا ہے، تو اس نے افسوس کی راہ سے کہا کہ بدنصیب تھا جو بھاگ گیا، اگر ہماری حضور میں رہ جاتا تو اتنا پاتا کہ سلطان بہادر کو بھول جاتا۔

(ماہنامہ آج کل دہلی کا موسیقی نمبر اگست ۱۹۵۶ء صفحہ ۵۴)

بیجو نہایت ہی مشہور نائک اور کامل گائک ہوئے ہیں۔ یہ میاں تان سین کے ہم عصر تھے۔
(شاعر بمبئی کا قومی یکجہتی نمبر سنہ ۱۹۷۴ء صفحہ ۲۲۵)

بیجو نائک راگ نٹ اور جھپ تال میں کہتے ہیں ؎

دو یا دھر گنین سوں کہا اب کچھو گن بیرہا کی لڑائی لریئے
انترہ ۱ جو کچھو آئے سو گائے سنایئے، ناہیں تو گنین کے چرن پر پیئے
(ماہنامہ شاعر بمبئی کا قومی یکجہتی نمبر سنہ ۱۹۷۴ء صفحہ ۲۲۶)

۴۹۔ سلطان باز بہادر

اس کا اصل نام ملک بایزید تھا۔ شجاع خاں اپنے باپ کی بجائے سنہ ۹۶۲ھ مطابق ۱۵۵۵ء) میں حاکم مالوہ ہوا۔ تخت نشین ہونے پر باز بہادر کا لقب اختیار کیا اور مالوے کے چند مشہور شہروں پر جو اس وقت تک خود مختار تھے قبضہ کر لیا۔ وہ اپنے وقت کی ایک شاعرہ روپ متی پر عاشق تھا۔ اس کے عشق کی کہانی نے اس قدر شہرت پکڑی کہ اس کے بعد تک یہ قصہ گیتوں میں گایا جاتا رہا۔ اس نے ۷ برس حکومت کی۔

باز بہادر کے عہد میں مالوہ فن موسیقی کا گھر بن گیا تھا۔ خود باز بہادر اس فن میں بڑا استاد شمار کیا جاتا تھا۔ ابوالفضل فیضی نے آئین اکبری میں لکھا ہے کہ گویندگی میں اس کا نظیر وہاں موجود نہ تھا۔ اس کے گانے کا خاص طرز تھا جسے باز خانی کہتے ہیں۔ اس کی محبوبہ بیوی روپ متی بھی علم موسیقی میں کمال رکھتی تھی۔ اس نے سنہ ۹۶۸ھ میں اپنے شوہر

کی لشکرِ اکبری سے شکست کے بعد خودکشی کر لی۔

(ماہنامہ آجکل دہلی کا موسیقی نمبر اگست ۱۹۵۶ء صفحہ ۱۰۵)

۶۵-۶۶۔ چاند خاں اور سورج خاں

یہ دونوں بھائی گوالیر کے باشندے تھے اور اکبر کے عہد میں میاں تان سین کے ساتھ تان ملاتے تھے فرق صرف یہ تھا کہ چاند خاں رات کے کل راگ اور راگنیاں گایا کرتا اور بسس (چاند تخلص کرتا تھا۔ اور سورج خاں دن کے کل راگ اور راگنیاں گاتا تھا۔ اُس کا تخلص روی (سورج) تھا۔ یہ دونوں بڑے زبردست گویے شمار کئے جاتے تھے اور تان سین کی طرح گندھرب کا درجہ حاصل کر چکے تھے

ان کے ریاض کا اندازہ اس بات سے کیجیے کہ چاند خاں نے بارہ برس تک اپنے بیٹے کو ایک استہائی کی تعلیم دی۔ اُس کی بیوی نے یہ دیکھ کر سمجھا کہ چاند خاں بیٹے کو سکھانا نہیں چاہتا۔ ٹال مٹول کر رہا ہے۔ اس پر وہ جھلائی اور باپ بیٹے دونوں کو بُرا بھلا کہا۔ چاند خاں نے دوسری استہائی شروع کرا دی مگر ساتھ ہی بیوی سے کہا کہ یہ تم نے بیٹے سے دشمنی کی ہے، اب یہ درجۂ کمال کو نہیں پہنچ سکتا۔

(ماہنامہ آجکل دہلی کا موسیقی نمبر اگست ۱۹۵۶ء صفحہ ۱۰۶)

۶۷-۶۸-۶۹۔ تان ترنگ خاں بلاس خاں صورت خاں

میاں تان سین کے تین بیٹے تھے۔ بلاس خاں۔ صورت خاں اور تان ترنگ خاں۔ یوں تو تینوں اپنے فن میں ماہر تھے لیکن تان ترنگ خاں ان سب میں ممتاز تھا۔ ابوالفضل نے دربارِ اکبری کے گویّوں میں اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ بھی گندھرب کے درجے تک پہنچ گیا تھا۔ بلاس خاں کی نکالی ہوئی توڑی بلاس خانی توڑی کے نام سے مشہور ہے۔

(ماہنامہ آجکل کا موسیقی نمبر اگست ۱۹۵۶ء
صفحہ ۱۰۶)

۷۱۰ ۔ مرزا عاقل ۔ ذوالقرنین ارمنی

مرزا عاقل ۔ باقر خاں کا بیٹا اور میاں تان سین کا شاگرد تھا ۔ اس نے بھی گندھرب کا درجہ حاصل کر دیا تھا ۔ ذوالقرنین فرنگی ارمنی اس کا شاگرد ہے جو اپنے عہد کا ممتاز موسیقی دان ۔ شہرہ آفاق گویا اور عہدِ شاہ جہاں کے منصب داروں میں شامل تھا ۔

(ماہنامہ آجکل دہلی کا موسیقی نمبر اگست ۱۹۵۶ء صفحہ ۱۰۶)

۷۲ ۔ لعل کلاونت

گوالیر کا رہنے والا اور اکبر کے مقرب گویوں میں تھا ۔ بچپن سے اکبر کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس کی زیرِ تربیت جوان ہو کر ماہرِ فن بنا ۔ اکبر جو راگ اور راگنی ہندی زبان کی سنتا ، اُسے یاد کرا دیا کرتا تھا ۔ ۷۰ برس کی عمر پا کر ۲ رجب ۱۰۱۷ھ مطابق ۱۶۰۸ء کو مر گیا ۔ اس کی ایک منظورِ نظر باندی تھی جس کے ہاتھ سے وہ مدام افیون کھایا کرتا تھا ۔ اس نے آقا کے مرنے کے بعد افیون کھا کر خودکشی کر لی ۔

(ماہنامہ آجکل دہلی کا موسیقی نمبر اگست ۱۹۵۶ء صفحہ ۱۰۶)

۷۳ ۔ نائک چرجو

یہ گوالیار کا باشندہ اور اکبری دربار کا مشہور موسیقار تھا ۔ اپنے علم و فضل کے کمال کی بنا پر نائک شمار کیا جاتا ہے ۔ یہ چار ستنوں میں سے دو کو کام میں لا سکتا تھا ۔ اس کا بیٹا پربین خاں بھی اکبر کے دربار کا متوسل تھا ، اور بین بجانے میں کمال رکھتا تھا ۔

(ماہنامہ آج کل دہلی کا موسیقی نمبر ۔ اگست ۱۹۵۶ء)

۴۶،۴۵ ۔ سبحان خاں بچتر خاں

اس کا اصلی خطاب سرعان خاں تھا جو کثرتِ استعمال سے سبحان خاں ہو گیا ہے ۔ یہ بھی گوالیر کا باشندہ اور اکبر کا درباری گویا تھا ۔ اس نے سفرِ بیت اللہ بھی کیا تھا اور مدینہ منورہ میں اپنا نغمیہ کلام پڑھ کر وہاں کے اہلِ ذوق سے بڑی داد حاصل کی تھی ۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے کسی بادشاہ کی فرمائش پر دیپک راگ گایا بھی تھا ۔

اس کا بھائی بچتر خاں بھی اکبری دربار کا گویا تھا ۔

(ماہنامہ آج کل دہلی کا موسیقی نمبر اگست ۱۹۵۶ء صفحہ ۱۰)

جناب عظمت حسین خاں سبکش اپنے مضمون " موسیقی اور قومی یک جہتی " میں سبحان خاں کی نسبت یوں رقم طراز ہیں :-

" حاجی سبحان خاں جو پہلے سبحان سنگھ تھے اکبر کے درباری گائکوں میں خاص مقام رکھتے تھے ، یہی بزرگ آگرہ والے آفتابِ موسیقی استاد فیاض خاں اور استاد ولایت حسین خاں کے جدِ اعلیٰ بھی تھے ۔ موسیقی کے تعلق سے اس خاندان نے آگرہ کا نام روشن کیا ہے حاجی سبحان کی چیز دیکھئے اس کا راگ جوگ ہے اور تال چوتالہ ہے ۔

استائی : پرتھم من اللہ جن ا رچو نور پاک نبی جی پہ کر ایمان اے سبحان

انترہ : ولیئن من شاہ مردانِ طاہر من سید امام من حسنین

دین من کلمہ کتاب من قرآن

سبحان خاں کی دوسری استائی دیکھئے ، راگ لنگ دھن ہے اور تال جھپ تال ۔

استائی : آج انجن ویو ر آدھ کا نین کو دھنش کیو سین کو

انترہ : رین مرگ مین کل لجت کھنجن دیکھا دمکت چنچل چپل شام سکھ دن کو

(ماہنامہ شاعر بمبئی کا قومی یک جہتی نمبر ۱۹۷۲ء صفحہ ۲۲۵)

۷۶۔ لعل خاں کلاونت

یہ بلاس خاں (پسر تان سین) کا داماد اور شاہجہانی دربار کے موسیقاروں میں سرآمد و ممتاز تھا۔ تان سین کا انداز اُس کے شاگردوں سے سیکھا اور اُس کے دھرپد خود اُسی کی روش سے بے نظیر گائے۔ یکم رجب ۱۰۴۷ھ مطابق ۱۶۳۷ء کو شاہجہان نے "گن سمدر خاں" خطاب دیا۔ اس کے چار بیٹے تھے جو گانے میں اس کے ساتھ رہتے تھے۔ گن سمندر خاں نے ربیع الثانی ۱۰۶۲ھ مطابق ۱۶۵۲ء میں بمقام آگرہ انتقال کیا۔

(ماہنامہ آج کل دہلی کا موسیقی نمبر اگست ۱۹۵۶ء صفحہ ۱۰)

۷۷۔ خوش حال خاں

گن سمدر خاں کا بیٹا اور بلاس خاں (پسر تان سین) کا نواسا تھا۔ اپنے بھائیوں میں بہترین گویا تھا۔ شاہجہاں کو اس کا نغمہ بہت بھاتا تھا۔ فہم و سلیقہ اور فراست کا مالک تھا، اور شاہجہاں کے نام سے اپنی تصنیفات کیا کرتا تھا۔

(ماہنامہ آج کل دہلی کا موسیقی نمبر اگست ۱۹۵۶ء صفحہ ۱۰)

۷۸۔ تان سین

تان سین کا اصلی نام ترلوچن داس تھا۔ ذات کے "گوڑ برہمن" تھے۔ ان کے والد مکرند پانڈے کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ یہ گوالیار کے رہنے والے تھے۔ موضع بھینٹ تان سین کی جائے ولادت ہے۔ جہاں اُن کے والد کا سکونتی مکان تھا۔ اب کچھ وہاں سر راہ تان سین کے نام کی ایک چھوٹی سی اکہری مڑھی بنی ہوئی ہے، جس کے اوپر گنبد ہے اور سامنے برآمدے میں ایک گھنٹی آویزاں ہے راہ گیر اس کو بجا کر وہاں سے گزرنا اپنی سعادت سمجھتے ہیں۔ مقامی باشندوں کا کہنا ہے

کہ تان سین اس مڑھی میں بیٹھ کر گایا کرتے تھے۔ مکرند پانڈے کے کوئی اولاد نہ تھی۔ آخر پیر محمد غوث گوالیاری کی دعا سے تان سین کی ولادت ہوئی۔ یہ ۵ سال کے تھے، جب ان کے والدان کو پیر موصوف کی خدمت میں لائے۔ پیر صاحب نے اپنا پس خوردہ تان سین کو کھلا دیا۔ تان سین کے باپ نے کہا کہ یہ ہمارے دین سے نکل گیا۔ اب آپ ہی کی خدمت میں رہے گا۔ چناں چہ تان سین ان کے پاس رہنے لگا۔

تان سین کی تاریخ ولادت کے بارے میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض نے سمت ۱۵۸۸ بکرم جو ۱۵۳۱ء اور ۹۳۸ ہجری کے مطابق ہے۔ سال ولادت لکھا ہے اور بعض نے اپنی تحقیقات کی بنا پر ۱۵۲۰ء بتایا ہے۔ لیکن قاضی دھول پوری نے اپنے مضمون "تان سین" میں ان کا سال ولادت ۹۳۱ھ مطابق ۱۵۲۴ عیسوی مطابق سمت ۱۵۸۲ بکرمی مانا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ہمارے خاندان میں سینہ بسینہ اقوال اور بزرگوں کے مخطوطات کی بنا پر یہی سال درست ہے۔

(ماہنامہ آج کل دہلی کا موسیقی نمبر اگست ۱۹۵۶ء صفحہ ۸۹)

۹۳۵ ہجری (۱۵۲۸ء) میں حضرت شیخ غلام غوث نے اس کی تعلیم شروع کرا دی اور پیار سے ان کا نام "توڑی" تجویز کیا۔ توری یوں کہ ایک راگنی کا نام ہے اس لئے خوش عقیدہ لوگ کہتے ہیں کہ اس نام میں تان سین کے آئندہ باکمال گویا ہونے کی طرف اشارہ مضمر ہے۔ چناں چہ دس سال کی عمر ہی میں تان سین کو گانے کا بہت شوق ہو چکا تھا۔ پیر صاحب نے ۱۵۳۲ء میں راجہ مان سنگھ کے قائم کئے ہوئے کالج ودّیالیہ گوالیار میں داخل کرا دیا۔ تان سین چار پانچ سال میں اس مدرسے سے فارغ التحصیل ہو گئے۔ بعد ازاں بخشو گویا کی لڑکی سے موسیقی کے جملہ نکات سیکھ کر ماہر فن ہو گئے۔ ۱۵۳۸ء میں پیر صاحب نے ان کو اپنا خلیفہ بنا دیا۔ تان سین اب جہاں اوّل درجے کے نائک تھے، وہاں درویش کامل ہونے کی سند بھی ان کو مل گئی، اور رفتہ رفتہ پیر صاحب کی اجازت سے سلطان محمود گجراتی کے دربار میں جگہ مل گئی۔ لیکن یہ بھیر

واپس گوالیار آ گئے۔ آج تک گجرات کے علاقے میں مسلمان گویّے اور قوّال تان سین کو پیروں کی طرح مانتے ہیں، اور اس کی نیاز دلواتے ہیں۔ اور ہندو گویّے اس کی تصویر سامنے رکھ کر پوجا کرتے ہیں۔ تان سین بابا ہری داس کے پاس بھی رہے۔ باباجی نے بچوں کی طرح دیکھ بھال کی اور دل سے گانے کی تعلیم دی۔ باباجی سے رخصت حاصل کر کے حاکم بنگال کے دربار میں گئے، اور وہاں سے راجہ رام چند ریواں نریش نے اپنے دربار میں بلا لیا۔ پھر ۹۷۰ھ میں تان سین کو اکبر نے اپنے دربار میں داخل کر لیا تادم مرگ یہیں رہے۔ آپ دربارِ اکبری کے گویّوں میں بہت ممتاز تھے۔ کہتے ہیں آپ سے اچھا گویّا ہندوستان میں آج تک نہیں ہوا۔

مورخین نے آپ کی تاریخِ وفات ۹۹۷ھ مطابق ۱۵۸۸ء لکھی ہے۔ لیکن صحیح تاریخِ وفات معلوم نہیں۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے تان سین کی رحلت ۱۵۸۸ء بتائی ہے۔ سیر المتاخرین میں صفحہ ۱۴۳ پر طباطبائی صاحب لکھتے ہیں کہ "در سال سی و چہارم جلوس رخت ہستی بر بست۔"

"مرآۃ السلاطین" میں منشی گوکل پرشاد لکھتے ہیں:

"چونتیسویں سال جلوس کو اس دائرہ پُر شور سے میاں تان سین ناساز ہو کر مقامِ اعلیٰ کو سدھارے۔"

اکبر نامہ میں تان سین کی وفات اکبر کے عہدِ حکومت میں ۲۶ / اپریل ۱۵۸۹ء میں ہوئی لکھی ہے۔

(اکبر نامہ حصہ سوم صفحہ ۸۹۶)

نمونۂ کلام

دھرپد راگ بھیرو۔ موسم بہار

سگھن بن چھائیو درم بیلی مادھو بھون   اتی پرکاش بدن بدن پُشپ رنگ لائیو
گوکل کیر کپوت کھنجن رہنی آنند کر   چھوں اور رنگ جھمر لائیو
سپت سُرن تین گرام اکیس مورچھنا   رکت بکت لاگ ڈاٹ کر دکھائیں
تان سین کہے سنو شاہ اکبر   پرتھم راگ بھیرو میں گائیو

(آجکل موسیقی نمبر، اگست ۱۹۵۶ء صفحہ ۹۲)

مندرجہ ذیل اشعار سے تان سین کے برہمن خاندان سے ہونے پر روشنی پڑتی ہے۔ ؎

جے جے کر پوچھا دھولا گرشہ کی رانی نے

پان ر پارم دھوجا نار بیل بھیٹ بھوانی نے

نیل جھلیں ارگھیا انبر نے چڑھاوت اکوپانی نے

تان سین یہ پرسار انگشت دیجے بدھا دربانی نے

برھما وید پڑھے نیرے دوار شنکر دھیان سمانی نے

بیربل دنش برہمن اوتار تان سین نرودانی نے

(اکبری دربار کے ہندی کوی صفحہ ۱۰۱-۱۰۲)

مندرجہ ذیل اشعار میں تان سین نے اپنے گورو کی تعریف کی ہے ؎

برہم گت اپرم پار نہ پاؤں

پرتھوی پار پاتال پھرا اور گگن دوڑھاؤں

جو لو نہ ہوئے شبد رشٹ تمھاری من اچھا پھل پاؤں

تیرتھ پریاگ سرسوتی ترنبی سب تیرتھ ہو کر گورو دواچاؤں

بھاگیرتی گومتی اور گنگا تان سین گاوے ہری دوار جاؤں

(اکبری دربار کے ہندی کوی از ڈاکٹر سرجو پرشاد اگروال صفحہ ۱۴۱)

سنگیت کلا کے وکاس میں گنیش جی کی استتی کرتے ہوئے تان سین یوں کہتے ہیں ؎

اے گن راجہ مہاراجہ گجانن جے ودیا جگدیش!

سیت سُر سو گاؤں بجاؤں سب راگ راگنی ہیتر ودھ جو شت شاستر چھتیس

بائیس شرت اکیس مورچھنا انچاس کوٹ تان آوے جگدیش

تان سین کو دیجے چھ راگ چھتیس راگنی تال لے سنگت مے سو ہو دے

میاں تان سین کی ایک اور رچنا دیکھئے ؎

استائی :- آدیس گن کو آدیس گرو کو آدیس ان کو جن ہم جنائے

انترہ : آدیس انبیا کو آدیس اولیا کو آدیس تان سین نایک سجائیے
(ماہنامہ شاعر بمبئی کا قومی یکجہتی نمبر ۴، ۱۹۷ء صفحہ ۲۲۸)

۷۹۔ شہنشاہ اکبر

ہندوستان کا شہنشاہ، نام ابوالفتح جلال الدین محمد، ہمایوں کا بڑا لڑکا تھا۔ سندھ کے صوبے میں امر کوٹ کے مقام پر ۱۵ اکتوبر ۱۵۴۲ء مطابق ۹۴۹ھ میں پیدا ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ہمایوں نے شیر شاہ سے شکست کھا کر رانا پرشاد کے یہاں پناہ لی تھی۔ ہمایوں کے مرنے کے بعد اکبر کالانور ضلع گورداس پور (پنجاب) میں تھا، جہاں وہ شاہی حکم سے سکندر شاہ سور کو شوالک پہاڑ سے نکالنے کے لئے متعین کیا گیا تھا۔ جب اس واقعہ جانکاہ کی خبر پہنچی، بیرم خاں اور دوسرے سرداروں نے جو وہاں موجود تھے، جمعہ کے دن ۱۴ فروری ۱۵۵۶ء مطابق ۲ ربیع الثانی ۹۶۳ھ اکبر کو جس کی عمر اس وقت ۱۳ سال ۹ ماہ کی تھی، بادشاہ مشتہر کر دیا۔ اس نے اپنی سلطنت کو گجرات۔ بنگال۔ کشمیر اور سندھ تک وسعت دی۔ اٹک ۔ آگرہ۔ الہ آباد کے قلعوں کے علاوہ دوسری فوجی عمارتیں بنوائیں۔ فتح پور سیکری کے شہر کو آباد کیا۔ اس کا قیام زیادہ تر وہیں رہتا تھا۔ ۵۱ برس نو ماہ کی سلطنت کرنے کے بعد ۶۴ برس گیارہ ماہ کی عمر میں ۱۶ اکتوبر ۱۶۰۵ء مطابق ۱۳ جمادی الثانی ۱۰۱۴ھ بدھ کے دن وفات پائی۔ نواح آگرہ میں دفن ہوا۔ جہانگیر نے عالی شان مقبرہ بنوا دیا۔ اکبر کے وزیر ابوالفضل نے اکبر نامے میں اس کے زمانے کی مفصل تاریخ لکھی ہے۔

اکبر نے اپنے عہد میں ہندو سرداروں کو فوجی اور دیوانی عہدے دیے۔ اس کا دربار علماء و فضلا کا مرجع تھا۔ چناں چہ اکبری نورتن آج تک مشہور ہیں۔ اس کے حکم سے بہت سی کتابیں تصنیف و تالیف اور ترجمہ ہوئیں۔ ہندی سنسکرت کی متعدد کتب کے تراجم فارسی میں کئے گئے۔ اس نے ایک دارالترجمہ قائم کیا۔ جس میں ہندو مسلم اور دوسرے اہل قلم کو اس کام کے لئے مقرر کیا۔ اور ملک الشعراء ابوالفضل فیضی

کو اس کا صدر بنایا۔ دار الترجمہ کے اکثر ارکین سنسکرت کے ماہر تھے۔ ان ماہرین نے سنسکرت کی متعدد کتابوں کو فارسی کا لباس پہنایا۔ چناں چہ نقیب خان۔ ملّا عبد القادر بدایونی اور سلطان حاجی تھانیسری نے مل کر مہا بھارت کا ترجمہ فارسی میں "رزم نامہ" کے نام سے کیا۔ رامائن کا ترجمہ بدایونی نے چھ سال کی جانفشانی کے بعد ۹۹۹ھ میں مکمل کیا۔ فیضی نے قصۂ نل دمن کا ترجمہ پانچ ماہ کی قلیل مدت میں فارسی میں کیا۔ سنسکرت کی ایک کتاب "لیلاوتی" جو ریاضی کی مشہور کتاب ہے اس کا ترجمہ بھی اکبر نے فارسی میں کرایا۔ سنسکرت کے علاوہ ہندی ادب کی طرف بھی اکبر نے بڑی توجہ کی۔ اس نے ہندی ادب کی بیش بہا کتابوں اور ادب پاروں کو فارسی میں ڈھالا۔ اکبر خود بھی اس زبان کو روزمرّہ گفتگو میں استعمال کرتا تھا اور اس زبان میں شعر بھی کہتا تھا۔ چناں چہ ابو الفضل نے اپنی تصنیف اکبر نامہ میں جا بجا اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اکبر نے سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ بھی بدایونی اور خواجہ حسین مروی سے فارسی میں کرایا۔ اور مولانا شاہ محمد شاہ آبادی سے تاریخ کشمیر "راج ترنگنی" کا ترجمہ کرایا۔ علاوہ ازیں کلیلہ دمنہ کا ترجمہ ابو الفضل سے، ہرنش پران کا ترجمہ مولانا شیری سے۔ اتھروید کا ترجمہ بدایونی سے۔ یوگ وشسٹ کا ترجمہ نقیب خاں ملّا شاہ اور ابو الفضل سے۔ ہیش مہانند کا ترجمہ ابو الفضل سے اور تاجک کا ترجمہ مکمل خاں گجراتی سے کرایا۔ ترجمہ کا سب سے زیادہ کام ملا عبد القادر بدایونی نے کیا۔ اس لئے اکبر انھیں ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا تھا۔

اکبر کی ایک توجہ عموماً بھارت ورش تھی۔ دوسرے اس کی زندگی کا ابتدائی دور ایسے ماحول میں گزرا جس سے اس کی محبت اور رغبت ہندو مذہب سے بڑھ گئی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہندی زبان میں محض رغبت ہی نہیں رکھتا تھا بلکہ اپنے جذبات و احساسات کا اظہار بھی ہندی اشعار میں کرتا تھا۔ ابو الفضل نے اکبر نامہ میں لکھا ہے کہ اکبر کا رجحان فارسی اور ہندی شاعری کی طرف بدرجۂ اتم تھا۔ اور شعر فہمی کے لئے وہ ایک ناقد کی حیثیت رکھتا تھا۔

نمونہ کلام

جاکو حسن ہے جگت میں جگت سراہے جاہی
تاکو جیون سپھل ہے کہت اکبر ساہی

ساہی اکبر ایک سمے چلے کانھ ونود دِلوکن بال ہیں
آہٹ تیں ابلا نرکھیو چکی چوں کی چلی گری آتُر چال ہیں
تیوں بل بینی سُدھاری دھری سُبھگی چھبی یوں للتا اُر والا ہیں
چھنپک چارُو کمان چڑھاوت کا جیو لئے آہی بال ہیں

(اکبری دربار کے ہندی کوی صفحہ ۳۰)

اکبر کی نازک خیالی ملاحظہ ہو کہ نایکا نے آہٹ ہی سے کرشن کو پہچان لیا، اور چونک کر عاجزانہ انداز سے چلنے لگی، لیکن کرشن نے اس کی بینی (کلائی) پکڑ ہی لی۔ اُس وقت کا نظارہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کامدیو چھنپک کے کمان پر سرپ وپی بانوں کو چڑھا رہا ہو۔ یہاں اکبر نے سکھی کے سُندر چھنپک، ورن شریر کی تشبیہہ کمان سے، اور کلائی کی تشبیہہ سانپ سے دے کر اپنی نازک خیالی اور بلند پروازی کا ثبوت دیا ہے۔

مندرجہ ذیل چھند میں اکبر نے تشبیہہ اور استعارہ کے رنگ میں نایکا کی سُندرتا دکھائی ہے:

ساہ اکبر بال کی باہنہ اچت گہی چلی بھیتر بھونے
سُندری دوارہی درشٹ لگائے کے بھاگی ہیے کو بھرم باد گونے
چونکت سی سب اور و لوکت سنک سکوچ رہی مکھ مونے
یوں چھبی نین چھبیلی کی چھاجت مانو بچھوہ پرے مرگ چھونے

(اکبری دربار کے ہندی کوی۔ صفحہ ۳۱)

اکبر نے ہندی کلام میں کئی جگہ اپنا نام اکبر شاہ اور بعض جگہ شاہ اکبر بیان کیا ہے

اکبر کا کلام مطبوعہ کتابوں اور غیر مطبوعہ مخطوطات میں محفوظ ہے۔ ناگری پرچارنی سبھا کاسی کی تحویل میں مخطوطہ کے صفحہ ۶۲ پر پہلا چھند ملاحظہ ہو ے

سندر روپ انوپ بنیہ کلنجن انگ سبھے سبجھائی
کنجن چھنب نگن چھر کی سب جوبن سنگ لئے رسنائی
سیس کو انبھہ کرے ہوتی ان جو کٹی کچ سے ٹپائی
دلیشی رہیو بیت بساہ اکبر سنبھو کو یہ جن ناگن آئی

ذیل کا چھند سنگیت راگ کلپدرم حصہ پہلا صفحہ ۳۷۵ سے درج کیا جاتا ہے:

بدن ڈھانپ پوڑی بیلاپٹ پہرے سیس رہو ہے پیاری
جب ہی گھونگھٹ پر نیا رو کرت پی ایے مانو جیت لچاری
آرس پیاری پہرے پیتم پرم وچتر ہماری
ساہ اکبر نہور کرت لئے ہے اُٹھ چل ہنس بول ہوں باری

(اکبری دربار کے ہندی کوی صفحہ ۳۱)

بیربل کی موت پر اکبر نے جو سورٹھے لکھے ہیں، اُن کا نمونہ بھی دیکھیے ے

دِین جان سب دین ایک دُرایو دستہ دُکھ
سو اب ہم کو دین کچھ نہیں راکھیو بیربر
پیتھل سو مجلس گئی تان سین سو راگ
ہنس بو - رم بو - بول بو گیو بیربر ساتھ

(اکبری دربار کے ہندی کوی صفحہ ۸۹)

۸۰ - سلیم شاہ سوری

شیر شاہ سوری کا بیٹا سلیم شاہ سوری اپنے باپ کی طرح ادب پرور، شاعر نواز اور علم دوست ہونے کے ساتھ ساتھ ہندی شاعر بھی تھا۔ چناں چہ اُس کی ہندی شاعری کا نمونہ مندرجہ ذیل چھند سے ظاہر ہوتا ہے ے

اے جیتے دن من مل گئے نی لے پی لے بن ہو کو تیتے دن میرے آن لیکھے
اور جو نپٹ واکے تن سے تن کے سُکھ کو ایک چھن بھر جایت ہن کہے کب دیکھے
نہ پیا لے پانی بیٹھا تی نہ آن کیسنو میری ایک بھئی ہو ہی ہے رکھے میکھے
سلیم شاہ پی اے جی کو نا سمجھت جو بن جات پریکھے

(اکبری دربار کے ہندی کوی صفحہ ۲۹)

سلیم شاہ سُوری کے دربار میں ہندی کوی موجود رہتے تھے۔ چناں اس کے مشہور درباری کوی نرہری نے مندرجہ ذیل دوہے میں دُعائے خیر کا اظہار یوں کیا ہے:

پرتھم جینی جگدیش کنہہ کراؤں کوت رج نیموں
جس نرملی تھر جیو ے چھتر پتی شاہ سلیموں

(اکبری دربار کے ہندی صفحہ ۲۹)

مندرجہ بالا دوہا اس بات کی شہادت ہے کہ اکبر سے پہلے بھی مسلمان بادشاہوں کے درباروں میں ہندی کوی موجود تھے اور وظیفے پاتے تھے۔ چناں چہ ہمایوں کے درباری کویوں میں کچھ ایسے فارسی کے مسلمان کوی بھی تھے جو فارسی کے علاوہ ہندی میں بھی شعر کہتے تھے، اور ہندی گیتوں کو بڑے پریم سے اپنے سوامی کے سامنے گاتے تھے۔ ان میں شیخ عبداللہ بلگرامی اور شیخ گدائی دہلوی قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ ان کا ہندی کلام نایاب ہے۔

(اکبری دربار کے ہندی کوی۔ صفحہ ۲۷)

بیجاپور کا حکمران ابراہیم عادل شاہ جب تخت نشین ہوا تو اُس نے سلطنت کے سارے حساب کتاب کو فارسی کی بجائے ہندی میں رکھنے کا حکم جاری کیا۔ اُس کے دربار میں ہندی شعرا اور ہندی مصنفین کا خاص طور پر قدر تھا۔ وہ خود بھی ہندی میں شعر کہتا تھا۔ اس کی تصنیف نورس نامہ اس بات کی دلیل ہے۔

(اکبری دربار کے ہندی کوی صفحہ ۲۵)

سُلطان جلال الدین خلجی کا درباری ماحول بھی ادبی اور لسانی تھا۔ اُس کے دربار میں

علما و فضلا کا ایک خاص اجتماع تھا۔ اسی طرح محمد تغلق جو خود فارسی اور ہندی کا کامیاب شاعر تھا) نے اپنے دربار میں اہلِ علم و اہلِ قلم جمع کر رکھے تھے۔

سلطان فیروز نے تین محل بنوائے تھے۔ انگوری محل۔ لکڑی کا محل۔ سادہ محل۔ ان میں پہلا محل محض علم دوست اور شعرا حضرات کے لیے وقف تھا۔ سلطان سکندر لودھی خود بھی ہندی میں شعر کہتا تھا۔ اُس نے ودیا کے پرچار کے لئے کئی ودیالیہ کھولے تھے۔

(اکبری دربار کے ہندی کوی صفحہ ۲۳)

ان اقتباسات سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان بادشاہوں کے دل میں ہندی زبان کی ترقی کا شوق بدرجہ اُتم موجود تھا اور اس زبان سے اُنھیں دلی اُنس تھا۔

۸۱۔ تاج بیگم

تاج بیگم شہنشاہ اکبر کی کرشن بھگت بیوی تھی جس نے گوردھن کے مندر میں پران دیئے۔ برج بھاشا کے مُسلم شعرا میں اس کا درجہ کافی بلند ہے۔ اگرچہ سورداس نے بھگوان کرشن کی یاد میں گوپیوں کی لفظی تصویریں نہایت خوبصورتی سے کھینچی ہیں۔ لیکن برج بھومی کی بیٹیوں کی محبت کو شعر میں ڈھالنے کا کام تاج ہی نے کیا ہے۔ ان کے دل کا تالاب کرشن پریم سے بھرپور تھا اس لیے انھیں اپنی بات کہتے ہچکچاہٹ نہیں ہوتی۔ مثلاً ؎

شُنو دل جانی میرے دل کی کہانی | تیرے ہاتھ ہوں بکانی، بدنامی بھی سہوں گی میں
دیو پُوجا ٹھانی، اور نماز ہوں بھلانی | تجے کلمہ قرانی۔ سارے گُنن گہوں گی میں
سانولا سلونا سرتاج سر کلہ دار | تیرے نیہہ داغ میں نداغ ہو دھووں گی میں
نند کے کمار قُربان تیری صورت پہ | ہوں تو مغلانی، ہندوانی ہو رہوں گی میں

حیرانی کی بات ہے کہ متھرا سے آگرہ بہت قریب ہونے کے باوجود متھرا کے دہات میں شاہجہان کی بیگم ممتاز محل سے زیادہ تاج بیگم کا چرچا ہے۔ اور سادہ لوح دہاتی آگرے کے تاج محل کو تاج بیگم ہی کا مقبرہ سمجھتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ مشہور کرشن بھگت گوسوامی

بٹھل ناتھ جی کی چیلی تھیں۔ اُن کے لکھے ہوئے گیت ویشنوی سمپردائے کے مندروں میں بڑے شوق سے گائے جاتے ہیں۔ اس سمپردائے کے ایک پرانے گرنتھ "بھاوسندھو" میں "تاج بیگم کے حالات درج ہیں اور لکھا ہے کہ وہ مغل بادشاہ اکبر کی بیگمات میں سے ایک تھیں۔

کہا جاتا ہے کہ راجہ بیربل کی بیٹی "شوبھاوتی" اور "رائے برندابن داس" کی بیٹی "تاج بیگم کی سہیلیاں تھیں۔ ان دونوں لڑکیوں کو سوامی وٹھل ناتھ جی سے بڑی عقیدت تھی اور ان ہی کے ذریعے "تاج بیگم بھی نند کے فرزند پر فریفتہ ہوگئیں۔ تاج نے شوبھاوتی سے فرمائش کی کہ وہ گوسوامی جی سے اُسے ایک تعویذ منگا دے، جس کے اثر سے بادشاہ اُن کے بس میں رہے۔ شوبھاوتی نے اپنی سہیلی کے پاسِ خاطر سے گوسوامی جی کو خط لکھا۔ اُنھوں نے ایک کاغذ پر وہ لکھ بھیجا اور حکم دیا کہ بیگم اسے تعویذ بنا کر گلے میں ڈال لے دوہا یہ تھا:

کو من۔ ٹو من۔ ٹاٹکا یہ سب چھاڑوی دھوئی
پیا کہے سو کیجیے، آپ ہی بس میں ہوئی

ترجمہ:۔ لالچ اور فریب کو اپنے دل سے دھو ڈالو اور اپنے شوہر کی اطاعت کرو۔ وہ خود ہی تمھارے بس میں آجائے گا۔

"تاج بیگم نے تعویذ گلے میں پہن لیا۔ دوسری بیگمات نے اکبر سے شکایت کی کہ "تاج جادو ٹونے کرتی ہے۔ اس پر اکبر نے اُن کی موجودگی میں تعویذ کھلوایا اور جب دوہا پڑھا تو سب عش عش کر اٹھے۔ یاد رہے کہ اکبر خود ہندی شعر کہتے تھے۔ اس کے بعد اکبر کے دل میں نہ صرف تاج کی محبت بڑھی، بلکہ گوسوامی جی کے تئیں اُن کی عقیدت میں اضافہ ہوگیا۔

اس واقعہ کے بعد اکبر نے تاج بیگم کی یہ درخواست منظور کر لی کہ اُسے گوسوامی وٹھل ناتھ جی کو اپنا گورو بنانے کی اجازت دے دی جائے۔ اسی زمانہ میں اکبر خود بھی گوکل آیا، اور گوسوامی سے ملا۔ یہ بھی مشہور ہے کہ آخری مرتبہ تاج اکبر کے ساتھ بھگوان کے درشن کو گئیں

اور وہاں اُنھوں نے پران تیاگ دیئے۔ "بھاؤ سندھو" میں لکھا ہے کہ تاج کی موت پر اکبر نے کہا:

"ہر چیز جہاں کی تھی وہیں جا پہنچی۔ تاج اسی لئے مجھے یہاں لائی تھی۔
لہٰذا تاج کے جنت سدھارنے پر مجھے صدمہ نہیں ہوا"

کہتے ہیں کہ جب ناتھ جی کے مندر میں تاج کی موت ہوئی، وہ ہولی کا دن تھا۔ اور اُس وقت تاج ہی کا ایک گیت "آئے ڈھب باجن لاگے ہولی" گایا جا رہا تھا۔

گوردھن وہ بستی ہے جو گوردھن پربت پر آباد ہے۔ یہ پربت بھگوان کرشن نے اُنگلی پر اُٹھا کر طوفان سے لوگوں کی رکھشا کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ جب تاج اکبر کے ساتھ گوردھن کے لئے روانہ ہوئیں اُس وقت اُنھوں نے لکھا ؎

پریتم بسے پہاڑ پر میں جمنا کے تیر	اب کو ملنو کٹھن ہے پاؤں پڑی زنجیر
اگر آگرے میں ہوں گری پر بسیں نا تھ	توڑ زنجیریں رسی ہوں میں پریتم کے ساتھ
اتنا کہہ دھرنی گری لین سکھی اُٹھائے	پریم پیالے پریم سے سینچی دھیر دھرائے

(اخبار ویر بھارت جالندھر کا گوردگوبند سنگھ نمبر ۱۲ جنوری ۱۹۵۴ء)

تاج بیگم کا کرشن بھگتی میں ڈوبا ہوا کلام ملاحظہ ہو ؎

شیل بھو شیلا سب رنگ میں رنگیلا۔ بڑا چت کا اڑیلا۔ کہوں دیوتوں سے نیارا ہے
مالا گلے سوہے ناک موتی سیت سوہے کان۔ کنڈل من موہے لال مکٹ سر دھارا ہے
دُشٹ جن مارے سب سنت جو اُبھارے تاج۔ چت میں نہارو پرن پریتی کرن دارا ہے
نند جیو کا پیارا جن کنس پچھارا۔ وہ برندابن والا کرشن صاحب ہمارا ہے

گنیش جی کی استتی دیکھئے ؎

گنپتی گن سرتاج

گنپتی گن سرتاج ہے ہے۔ تمھیں نماؤں سیس
گیان دیو پورن ہمیں۔ جانیں گے شت ایش

دھرو سے پر ہلاد گج گراہ سے اہلیہ بوپی — شیوری اور گیدھ وبھیشن جنت تارے ہیں
پاپی آجامل سُور تلسی رَیداس کہوں — نانک ۔ ملوک تاج ہری کے پیارے ہیں
دھنا ۔ نام دیو داوٗ دسد نا قصائی جانا — گنگا ۔ کبیر ۔ میراں سین اُدھارے ہیں
جگت کو جیون جہان بیچ نام سُنیو — رادھا کے بلبھ ۔ کرشن بلبھ ہمارے ہیں

(ہندی کے مسلم ساہتیہ کار از پرمانند پانچال صفحہ ۷۵-۵۶)

۸۲۔ وحید خاں

وحید خاں بھی کرشن بھگت شاعر ہوئے ہیں۔ ان کے حالات پردۂ اخفا میں ہیں۔ صرف تین ہندی شعر باوجود تلاش کے دستیاب ہو سکے ہیں جو ہدیۂ ناظرین ہیں ؎

وحید خاں من موہن شیام سُند رکی منوہر مورتی کو دیکھ کر کہتے ہیں ؎

سُندر سُجان پر مند مُسکان پر — بانسری کی تان پر ٹھوان اٹھگی رہے
مورتی بسال پر کنچن کی مال پر — کھنجن سی چال پر کھورن کھگی رہے
بھونہیں بکسال پر نین پر سانو رہے بدن پر — نند کے نندن پر لگن لگی رہے

(دانیار ستانتن دھرم پرچارک امرتسر ۳ ستمبر ۱۹۲۵ء صفحہ ۵)

۸۳۔ شہزادہ دانیال

دانیال بادشاہ اکبر کا تیسرا لڑکا تھا، اور راجہ بہاری مل کچھواہہ کی لڑکی کے بطن سے ۲ر دسمبر ۱۵۷۲ء کو بمقام اجمیر پیدا ہوا۔ ایک مشہور درویش شیخ دانیال کی نسبت سے اس کا نام دانیال رکھا گیا۔ اپنے بھائی سلطان مراد کے انتقال کے بعد اکبر نے اس کو ایک تربیت یافتہ فوج دے کر نظام شاہی سلطنت کے فتح کرنے کے واسطے دکن کو روانہ کیا۔ چناں چہ احمد نگر ۱۶۰۰ء میں فتح ہو گیا۔ لیکن دانیال کی کثرتِ شراب نوشی نے اس کی صحت کو خراب کر دیا تھا۔ ۸ر اپریل ۱۶۰۵ء یکم ذی الحجہ ۱۰۱۳ ہجری بعمر ۳۳ سال برہان پور میں اس نے انتقال کیا۔ اس واقعہ سے اکبر کو سخت صدمہ

ہوا، اور اس کا اثر اس کی تندرستی پر پڑنے لگا اور تھوڑے ہی عرصے کے بعد وہ بھی اس دنیا سے چل بسا۔ بعض مورخین کا قول ہے کہ شہزادہ دانیال ۱۰۱۳ھ؁ ۱۶۰۴ء میں اپنے باپ سے چھ مہینے پہلے راہیِ ملکِ عدم ہوا۔ (قاموس المشاہیر جلد اول صفحہ ۲۳۴)

شہزادہ دانیال رحیم خان خاناں کا داماد تھا۔ اکبر نے اس کی تعلیم و تربیت کا کام ہندو پنڈتوں کی زیرِ نگرانی انجام دیا۔ دانیال کو ہندی زبان سے خاص محبت تھی۔ وہ خود بھی ہندی میں شعر کہتا تھا۔ خان خاناں اور دانیال میں گہرے تعلقات تھے۔ ہندی کے مشہور شاعر گنگ بھی خان خاناں کی وساطت سے دانیال کے دربار میں داخل ہو گئے۔ چنانچہ گنگ نے دانیال کی بہادری اور فیاضی کی تعریف اپنے اشعار میں اکثر جگہ کی ہے ؎

دَہلیتی دَری گئے دَریا اُسری گئے دَوئے دان شاہ جو کے رِشت ہیں
کہے کوی گنگ ہے سُہت دُر دَمدا دُیس دیکھی دیکھی اوم ہرشت ہیں

(اکبری دربار کے ہندی کوی صفحہ ۱۲۱)

افسوس کہ دانیال کا نمونۂ کلام دست یاب نہیں ہو سکا۔

۸۴۔ شیخ دانیال چشتی

شیخ دانیال چشتی اکبر بادشاہ کے عہد میں صاحبِ کشف و کرامات بزرگ گزرے ہیں۔ ہندی کے زبردست شاعر تھے۔ اکبر کا تیسرا لڑکا دانیال ان ہی کی دعا سے پیدا ہوا تھا۔ افسوس ہے کہ آپ کا کلام دست بردِ زمانہ کی نذر ہو گیا۔ صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ:

"شیخ دانیال چشتی نویں صدی ہجری میں پیدا ہوتے ہیں، اور ایک سو گیارہ برس کی عمر پا کر ۹۹۴ھ؁ میں رحلت کرتے ہیں۔ ہندی کے اعلیٰ شاعر تھے۔"

(پنجاب میں اردو۔ صفحہ ۱۱۶)

۸۵۔ کبیر

کبیر کے نامِ نامی سے کون واقف نہیں۔ آپ ہندوستان کے اُن عارف باللہ

لوگوں سے ہیں، جنھوں نے عرفان و تصوف اور حقائق و معارف کے دریا بہا دئے۔
آپ کی ولادت کے صحیح حالات معلوم نہیں، البتہ سنِ ولادت ۱۴۵۵ء بتایا جاتا ہے۔
یہ مشہور ہے کہ آپ کسی برہمنی بیوہ کے لڑکے تھے۔ آپ کی والدہ آپکو بنارس کے کسی تالاب پر چھوڑ گئی تھی۔ نورا نامی جولاہا آپ کو وہاں سے اٹھا کر ... گھر لے آیا اور اپنی بیوی نعمان کی گود میں دے دیا۔ اُس نے انتہائی محبت کے ساتھ آپ کی پرورش کی۔

جب آپ نے ہوش سنبھالا تو آپ کو گورو دھارن کرنے کا خیال آیا۔ ان دنوں شری راما نند جی ایک مشہور مہاتما تھے۔ وہ کسی غیر ہندو یا نیچ ذات کے کسی آدمی کو اپنا چیلا نہیں بناتے تھے۔ کبیر صاحب نے اپنی کمال حکمتِ عملی سے اُن کو اپنا گورو بنا لیا۔ نرالی قسم کے چیلے کا گورو پر اتنا گہرا روحانی اثر پڑا کہ اس کے دل سے ذات پات کا فضول وہم دور ہو گیا اور پریم بھگتی کا دائرہ لامحدود نظر آنے لگا۔

کبیر صاحب کسی مذہب یا فرقے سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ مذہبی فتنے اور تہذیبی اختلاف کو مٹانے اور بنی نوع انسان کے درمیان اندرونی وحدت دکھانے کے لئے آپ نے نہایت سرگرمی سے پرچار کیا، اس لئے ہر مذہب اور ہر ملت کا آدمی یکساں طور پر آپ کی عزت و تکریم کرتا اور اپنے دل میں آپ کے لئے عقیدت رکھتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ آپ کا چہرہ نہایت پُر جلال اور منور تھا۔ ہر شخص آپ کا دیدار کرتے ہی عزت اور ادب کے لئے جھک جاتا تھا۔ ہندی نورتن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی بیوی کا نام لوئی تھا۔ لڑکے کا نام کمال اور لڑکی کا نام کمالی تھا۔

صاحبِ مخزن الاصفیا نے صفحہ ۴۴۶ پر کبیر صاحب کے متعلق لکھا ہے کہ وہ شیخ تقی کے مرید تھے اور خلیفہ تھے۔ لیکن رام چندر شکل نے "ہندی ساہتیہ کا اتہاس" کے صفحہ ۷۶ پر لکھا ہے کہ:

"شیخ تقی چاہے کبیر کے گورو نہ رہے ہوں لیکن اُن کے ست سنگ سے اُنھوں نے بہت سی باتیں سیکھی ہیں۔ شیخ تقی کا نام کبیر نے یہاں بھی لیا ہے اُس احترام کے ساتھ نہیں لیا جس سے گورو کا نام لیا جاتا ہے جیسے ع

گھٹ گھٹ ہے اونا شی سُن ہو تقی تم شیخ"

یہ ضرور ہے کہ کبیر نے مسلمان فقیروں کا ست سنگ کیا تھا۔ یہ بات خود اُن کے بیان سے ظاہر ہے۔ وہ جھون پور مانک پور وغیرہ مقامات پر گئے جو مسلمان فقرا کے مشہور مقامات ہیں۔ مثلاً ؎

مانک، پور ہی کبیر بسیرو ۔۔۔ مدحتی شلنو شیخ تقی کبیرو
اوجی سنو جون پور تھانا ۔۔۔ جھونسی سُنی پیرن پیرن مانا

لُطف یہ ہے کہ فقرا کی باتیں سُن کر بھی کبیر اپنی ہی بات سب کو ماننے کے لئے کہتے ہیں۔ مثلاً ؎

شیخ اکروی سکروی تم مان ہو بچن ہمارا
آونت او جگ دیکھ ہو ڈیٹھ پسارا

آخری وقت آپ منگیر چلے گئے اور وہاں انتقال کیا۔ ان کے مرنے ہندو مسلمانوں کے درمیان اُن کی نعش کے متعلق جھگڑا پیدا ہو گیا۔ ہندو اُسے جلانا چاہتے تھے اور مسلمان دفن کرنا۔ آخر جب نعش سے کپڑا اُٹھایا تو سوائے چند پھولوں کے کچھ موجود نہ تھا۔ مسلمان آدھے پھول اُٹھا لائے، اور منگیر میں روضہ تعمیر کرایا۔ باقی آدھے پھول ہندو اُٹھا لائے اور بنارس میں سمادھی ہوائی جو اب کبیر پورہ کے نام سے مشہور ہے۔

(رسالہ اودم دہلی کا بھگت مال نمبر جنوری ۱۹۶۰ء صفحہ ۷۶)

کبیر کے سن وفات کا تعین اندازاً ۱۵۱۸ء مطابق ۹۲۴ھ ہو سکا ہے۔

(ہماری زبان۔ ۱۵ مئی ۱۹۷۲ء)

نمونہ کلام

تیرتھ برت کر جگ مُوا ٹھنڈے پانی نہائے
ست نام جانے بنا کال بھگن جگ کھائے
نہائے دھوئے کیا بھیا جو من کا میل نہ جائے
مین سدا جل میں رہے، دھوئے باس نہ جائے

جیوت سمجھے، جیوت بوجھے، جیوت مکتی نواسا
جیوت کرم کی پھانسی نہ کاٹی مُوئے موکش کی آسا

جیوں نینوں میں پوتلی تیوں خالق گھٹ ماہیں
مُورکھ لوگ نہ جان ہیں، باہر ڈھونڈن جاہیں

جیوں تل ماہیں تیل ہے، جیوں چقمک میں آگ
تیرا پریتم تجھ میں جاگ سکے تو جاگ

جا کارن جگ ڈھونڈیا سو تو گھٹ ہی ماہیں
پردہ دیا بھرم کا تا تے سوجھے ناہیں

پاوک روپی رام ہے گھٹ گھٹ رہیا سمائے
چت چقمک لاگے نہیں تا تے بجھ بجھ جائے

چڑی چونچ بھر لے گئی ندی نہ گھٹیو نیر
دان دیئے دھن نہ گھٹے کہہ گئے بھگت کبیر

مانگن مرن سمان ہے مت کوئی مانگے بھیک
مانگن سے مرنا بھلا یہ ست گرو کی سیکھ

○

۸۶۔ کمال

یہ کبیر صاحب کے فرزندِ ارجمند تھے۔ باپ کی طرح یہ بھی روحانی دولت سے مالا مال اور ترک وتجرید میں باکمال تھے۔

ایک دفعہ کبیر صاحب اور شیخ تقی گنگا کے کنارے بیٹھے تھے۔ سامنے کی طرف سے ایک لڑکا بہتا ہوا نظر آیا۔ شیخ نے کہا لڑکا بہت خوبصورت ہے۔ مگر مُردہ ہے۔ کبیر صاحب نے کہا، کس رستے سے ہو گیا اور کہاں ہے۔ مطلب یہ کہ رُوح کس راہ سے نکلی اور کہاں ہے شیخ نے کہا۔ مجھ کو خبر نہیں، آپ ہی فرمائیے۔ کبیر صاحب نے کہا، یہ نہ کہیں گیا . . . اور نہ کہیں سے آیا ہے۔ شیخ نے کہا اگر ایسا ہے تو اسے بلائیے۔ کبیر صاحب مسکرائے۔ بہتی ہوئی لاش کی طرف خیال کی دھار کو ڈالا وہ ان کی قریب آگئی۔ کبیر جی نے اُسے غور سے دیکھا اور کان میں شبد پھونکا۔ لڑکے میں حرکت آگئی اور اس سے رونے . . . کی آواز پیدا ہوئی۔ شیخ نے کہا یہ تو آپ نے کمال کر دیا۔ کبیر صاحب بولے یہ خود کمال ہے۔ کمال کوشش سے نہیں ملتا۔ کبیر صاحب لڑکے کو ساتھ لے آئے اور مائی لوئی کے حوالے کیا۔ اُنھوں نے اس کی پرورش کی۔ اُس کا نام کمال مشہور ہو گیا۔ اپنے آپ کو یہ کبیر کا لڑکا ہی کہا کرتے تھے۔

کمال صاحب ابھی بچے ہی تھے، ان کو دھوتی باندھنی نہیں آتی تھی۔ ہمیشہ کُھل جایا کرتی تھی۔ ایک دن کبیر صاحب نے فرمایا۔ بیٹے دھوتی کس کر باندھ لو۔ کمال نے پوچھا سچ مچ کس کر باندھوں؟ کبیر صاحب نے کہا ہاں! ایسی کس کر باندھو کہ پھر نہ کھلے۔ کمال نے مضبوطی کے ساتھ دھوتی باندھ لی، اور گھر سے باہر رہ کر تجرد کے عالم میں زندگی گزارنے لگا۔

ایک مرتبہ دورہ کرتے ہوئے کمال صاحب گوالیار میں کسی مہاجن کے ہاں ٹھہرے۔ اس نے بہت سا مال وزر نذر کیا، مگر کمال صاحب نے قبول نہ کیا۔ جب یہ سو گئے تو مہاجن نے ایک ہیرا اُن کی پگڑی میں باندھ دیا۔ یہ بے خود تھے۔ ان کو اس کا خیال تک

نہ ہوا۔ آخر اسی حالت میں گھومتے ہوئے کاشی پہنچے۔ جب سو رہے تھے تو کبیر صاحب کی نظر پگڑی کے پیچ کی طرف گئی۔ دیکھا تو اس میں ہیرا بندھا ہوا تھا۔ اُس وقت کبیر جی کے مُنہ سے یہ دوہا نکل گیا ؎

نام صاحب کا بیچ کر گھر لے آیا مال ۔۔۔ بُوڈا بنس کبیر کا جنمے پوت کمال

کمال صاحب کو بھی ہیرا دیکھ کر تعجب ہوا۔ آخر مہاجن نے جو اُن کے ساتھ کبیر صاحب کے درشن کو آیا تھا، اپنی غلطی کا اقرار کیا اور کبیر صاحب کو بھی اطمینان ہو گیا۔

کمال صاحب کا نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

اجر۔ امر۔ اوناسی صاحب نردیہی کیوں آیا
اتنی سمجھ بُوجھ نہیں، مُورکھ آئے جائے سو مایا

گانٹھ کھلی نہیں جڑ چیتن کی گیان کتھے بے انتا
ست است کی خبر نہ پائی نہ جانے سنت اسنتا

سُکھ نہیں دولت مال خزانہ، سُکھ نہیں باد بوادی
سُکھ ہے سادھ سنت کی پُوجی، لاگی من سمادھی

من درپن بیچ مورت دیکھا دیکھا سکل لیارا
آپا آپ جان سب جانا، جانا سارا سارا

گیانی گیان کتھے نس باہر ہو توانی گیانی
نج من کی کچھ شدھ نہیں واکو آٹھ پہر اکھیانی

ساکھی سُن لی مرم نہ پایا کھلی نہ آنکھ ہیئے کی
سُکھ آنند نیک نہیں ملیا دِھرگ نر جنم جیئے کی

راجہ دُکھی، دُکھی بن باسی، دُکھی رنگ بیرہی
گورو کرپا سے سادھ سُکھی بھیئے من چنچل کو جیتی

رام نام بِھج نِس دِن بندے اور بھرم پاکھنڈا
باہر کے پٹ دے مرے پیارے کھُلے سکل برہمنڈا

داس کمال کبیر کا بالک گورو کا نج کر پیارا
شبد بھید کی جوت جگی جب پایا ست کرتارا

(رسالہ مارتنڈ۔ دہلی۔ مئی ۱۹۶۱ء صفحہ ۳۸ و ۳۹)

۷۸۔ نابھاجی

نابھاجی جنم سے اندھے تھے۔ ان کا بچپن تھا کہ ان کا باپ غریبی سے تنگ آکر بھیک مانگنے کے لئے گھر سے نکلا۔ لیکن رستے میں مر گیا۔ ماں نے بے دردی سے ناکارہ سمجھ کر نابھاجی کو جنگل میں ڈال دیا۔ یہ بے چارہ بے کسی کے عالم میں ایک جگہ بیٹھا ہوا تھا۔ اتفاق سے دو سادھو کیلہہ جی اور اگر سین جی اُدھر سے گزرے۔ بچے کو یوں بیٹھا دیکھ کر پوچھنے لگے۔ تو کون ہے؟۔ بچے نے جواب دیا تم کیا پوچھتے ہو۔ جسم تو فانی ہے فنا ہو کر عناصر اپنے اپنے مقام پر چلے جائیں گے۔ اس لئے میں تمھیں کیا بتاؤں کہ میں کون ہوں۔ اور اگر روح کی نسبت آپ کا سوال ہے تو اس کی کوئی ذات پات یا نام یا صورت نہیں اس لئے کیا جواب دیا جائے۔

یہ جواب سُن کر سادھو حیران رہ گئے۔ اُس کو اپنے ساتھ لے لیا۔ بستی میں اگر لوگوں سے

اُس کی قومیت کا حال دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ قوم کا ڈوم ہے۔ سادھو وشنو مہا تما تھے، پھر بھی بچے کو اپنے ساتھ لے لیا۔ اور چلتے بنے۔ راہ میں اُنھوں نے بغور دیکھا تو معلوم ہوا کہ اُس کی آنکھوں کے پپوٹے ملے ہوئے ہیں، اگر ان کو شگاف دیا جائے تو کیا عجب ہے کہ یہ دیکھنے لگ جائے۔ چناں چہ پپوٹے کھول دیئے گئے۔ آنکھوں میں پانی چھڑکا گیا۔ وہ دیکھنے لگے، اور آہستہ آہستہ قوت بصارت جو دبی ہوئی تھی۔ عود کر آئی۔ سادھوؤں نے اُن کو اپنا چیلہ بنا لیا، اور نارائن داس نام رکھا۔ رفتہ رفتہ نابھاجی پر تصوف کا گہرا رنگ چڑھ گیا، اور اب وہ رفتہ رفتہ ہندی بھاشا میں بھجن اور گیت لکھنے لگے۔ آخر کار اپنے گورو کے ایما پر "بھگت مال" نامی کتاب تیار کر دی جس میں بھگتوں کے سوانح حیات قلم بند کئے۔ وہ کتاب آج بھی مقبولِ خاص و عام ہے۔ نابھاجی کا صوفیانہ کلام ملاحظہ ہو ؎

نابھا نتھ کھیلا۔ کنول کیل سر سیلا

درپن نین سین من مانجا۔ لاجا الکھ اکیلا

تِل پر دَل۔ دَل اوپر دامنی جوت میں جوت اُجیلا

انڈا پار سالکھ، سورت سُنی سُن سہیلا

چڑھ گئی جائے دھائے گڑھ اوپر شرت بھیا میلا

یہ سب کھیل ایپل امیلا سندھ نیرتد میلا

جَل جَل دھار سار پد جیسے نہیں گورو نہیں چیلا

نابھا نین عین اندر کے کُھل گئے نِرکھ نہالا

سنت اُچھشٹ دار من جھیا ورلبھ دین دُھیلا

درسالہ اوم، دہلی کا بھگت مال نمبر

جنوری ۱۹۶۰ء صفحہ ۱۵۴

○

۸۸ - دین درویش

دین درویش مسلمان تھے، مگر اس قدر صلح کل۔ وسیع المشرب سچے، اور دین دار انسان تھے کہ انھیں ہندو مسلم میں کوئی تمیز نہ تھی۔ آپ پاٹن کے رہنے والے تھے۔ ہندی بھاشا کے علاوہ فارسی میں بھی دست گاہ رکھتے تھے۔ شاعری سے قدرتی تعلق تھا۔ اُن کی شعر گوئی تحقیقی اور وہبی تھی۔ تصنع یا بناوٹ کو دخل نہیں تھا۔

بیس برس کی عمر میں انھوں نے مسلمانوں کے مذہبی مقامات کی سیر کرنے کے بعد ہندو تیرتھوں، گوکل، بندرابن۔ کاشی۔ پریاگ اور شری ناتھ وغیرہ مقامات کی زیارت کی، اور کبیر صاحب کے عقائد کے معتقد ہو گئے۔ اُن کا معمول تھا کہ ہر پورن ماشی کو سرسوتی ندی میں اشنان کرنے آتے تھے اور ساتھ شاگرد ہوا کرتے تھے۔ شعر و سخن کا بازار گرم ہوتا تھا۔ اِن کے کلام میں عرفان و حقائق نہایت سادہ زبان میں بیان کئے گئے ہیں، ذیل میں اُن کی کنڈلیاں درج کی جاتی ہیں ؎

کوڑی ملے نہ بھاگ بن سیکھو منتر ہزار — کیوں نہ پاوے صاحبی بناں لیکھ کرتار
بناں لیکھ کرتار جگت سب پھر پھر آوے — ٹھگ پھرے بے کاج گانٹھ کی لاج گنواوے
کہے دین درویش دکھی چت چھوڑ دشٹ دوڑی — سیکھو منتر ہزار، بھاگ بن ملے نہ کوڑی

بندہ بازی جھوٹ ہے مت سانچی کر مان — کہاں بیربل گنگ ہیں کہاں اکبر کھان
کہاں اکبر کھان بھلے کی رہے بھلائی — فتح سنگھ مہاراج دیکھ اٹھ چل گئے بھائی
کہے دین درویش سکل مایا کا دھندہ — مت سانچی کر مان جھوٹ ہے بازی بندہ
بندہ جانے میں کروں، کرن ہار کرتار — تیرا کیا نہ ہوئے گا ہووے ہوون ہار
ہووے ہوون ہار بھار شر یوں ہی ڈھووے — آپ جس کرے یا نام نارائن کھووے
کہے دین درویش پڑے کیوں بھرم کے پھندے — کرن ہار کرتار کرے گا تو کیا بندہ

(رسالہ ادم دہلی کا بھگت مالا نمبر جنوری سنہ ۱۹۶ء صفحہ ۱۵)

۸۹۔ بُلّھے شاہ

آپ کے حالات خزینۃ الاصفیا مصنفہ غلام سرور لاہوری اور تاریخ الاصفیا میں ملتے ہیں۔ یہ کتاب بُلّھے شاہ کے مُرشد عنایت شاہ قادری قصوری کی خاندانی تصنیف ہے۔ بُلّھے شاہ کا اصلی نام عبداللہ تھا۔ یہ شیخ عبدالقادر جیلانی کی چودھویں پشت میں سے تھے۔ ان کے والد کا نام سخی شاہ محمد تھا جو دریائے سندھ کے کنارے ایک گاؤں اُچّے پنڈ گیلانیاں میں رہتے تھے۔ یہاں سے نقل مکان کر کے ملک وال پانڈو علاقہ ساہی وال کی نئی آبادی میں آئے اور انجام کار پنڈ پانڈو بھٹی کی مسجد میں امامت کرنے لگے۔ پانڈو بھٹی میں آنے کے وقت بُلّھے شاہ کی عمر چھ سات سال تھی۔ یہ اپنے آبائی وطن اُچّے پنڈ گیلانیاں میں پیدا ہوئے تھے۔ اسبورن ایک مصنف نے ان کی تاریخِ ولادت ۱۶۸۰ء اور تاریخِ وفات ۱۷۵۸ء لکھی ہے۔ اورنگ زیب کی موت کے بعد قریباً اسی سال تک زندہ رہے۔ تاریخ نافع السالکین میں بھی ان کے حالات ملتے ہیں۔ انھوں نے بارہ ماسہ۔ کافی سہ حرفی۔ گنڈھال۔ دوہا وغیرہ اصنافِ سخن میں حقیقت کا آشکار کیا ہے۔ نمونۂ کلام:-

بندرا بن میں گیا چراوے ۔۔۔ لنکا چڑھ کے ناد بجاوے
مکّے دا بن حاجی آوے ۔۔۔ واہ وا رنگ وٹائی دا

.... ہن کی تھیں آپ چھپائی دا

ایک اور کافی والہانہ انداز میں محبوبہ اپنی ماں سے کہتی ہے ؎

روزے صبح نمازتی مائے ۔۔۔ مینوں پیا نے آن بھلائے
جان پیاریاں خبراں آئیاں ۔۔۔ منطق نحو سبھے بھُل گیاں

اس انہد تار بجائے

ایک خالص ہندوانہ بھجن سُنیئے ؎

گھر میں گنگا آئی سنتو گھر میں گنگا آئی ۔۔۔ ٹھر کیا۔ باج اُگھٹی آل کھاناں

سُن کے بھل گئیاں سب ماناں   من اُٹھیو شام سندر سوں.....

دوہا

بُلھیا پیئیڈے پڑے پریم کے کیا پینڈا آواگون
اندھے کو اندھا مل گیا راہ بتاوے کون

دوہا

بُلھیا مُلاّ اتے مشالچی دونوں اِکوّ چِت
لوکاں کر دے چاننان آپ انھیرے نت

دوہا

ٹھاکر دوارے ٹھگ بسیں کافر دوار مسیت
ہر کے دوارے بھیکھ ہری ایہہ پریتیت

دوہا

بُلھیا دھرم سالہ وچ ناہیں جِنّے موہن بھوگ پرائے
وچ مسیتاں دھکے ملاے مُلاّں تیوڑی پائے

دوہا

دولت منداں نے بوہیاں اُتے چوبدار بہائے
پکڑ دروازہ رب سچے دا جِتھوں دُکھ دل دا جائے

کافی

دوئی دُور کر وکوئی شور نہیں   ایہہ تُرک ہندو کوئی ہور نہیں
سب سادھ کہو کوئی چور نہیں   ہر گھٹ وچ آپ سمایا اے
ٹک بوجھ کون چھپ آیا اے
کس بھیکھی بھیکھ بنایا اے

۹۰ - بیرو صاحب

شرگن پہنتیی سنتوں میں بیرو صاحب کا نام بلحاظ ترکِ دنیا، محبّتِ خدا طہارتِ نفس، اور فنا فی الذات انتہائی پریم اور احترام سے لیا جاتا ہے۔ آپ دہلی کے مشہور مرتاضِ کامل فقیر باوری صاحب کے سب سے بڑی شاگرد (مُرید) تھے۔ باوری صاحب کے وصال کے بعد آپ خلیفہ مقرر ہوئے اور اپنے مُریدوں کو وعظ و نصیحت اور ہدایت و سُلوک کی تعلیم دیتے رہے۔ آپ کی بے خودی، مستی، عرفان اور تصوّف عجیب تھا۔ آپ کے کلام میں آپ کے کشف و کرامات کی بہت سی پُراسرار باتیں ملتی ہیں۔

آپ کی تاریخِ ولادت اور وفات کا صحیح علم نہیں۔ قیاس اتنا کیا جا سکتا ہے کہ آپ سترھویں صدی عیسوی کے آغاز میں ہوئے اور دہلی کے آس پاس عرفان و تصوف کی تعلیم دیتے رہے۔ یاری صاحب آپ کے مُرید تھے۔ انسان ولادت کے وقت اس خالق سے کیا اقرار کر کے آیا تھا اور پیدا ہوتے ہی سب عہد و پیمان بھُول کر دُنیا کے جھمیلوں میں پھنس گیا۔ اس کا ذکر بیرو صاحب اس طرح فرماتے ہیں ؎

ہنسا رے با جھل مور یا ہی گھراں کر یو میں کون اپائے
موتیا چگن ہنسا آئل ہو۔ سو تو اجھل بھلائے
جھیلر کو بکلا بھیو ہے۔ کرم کیٹ دھر کھائے
ست گرو سنتیہ دیا کیو۔ بھیو بندھن تے بیو چھڑائے
یہ سنسار سکل بھئے اندھا موہ ماہ لپٹائے
بیرو بھگت ہنسا بھیو سکھ ساگر جلیو ئے نہائے

مطلب :- میں کیا اُپائے کروں میرا ہنس جو موتی چگنے کے لئے آیا تھا جھیل کا بگلا بن کر کیڑے مکوڑے کھا رہا ہے۔ اپنا سوروپ بھُول گیا ہے۔ یہ سارا سنسار موہ مایا میں اندھا ہو کر پھنسا ہوا ہے۔ گورو دیو کی کرپا سے آج میری آنکھیں کھُلی ہیں اور کبھگتی ہنس کا یہ ساما پا... ہنس آج سُکھ ساگر میں نہا رہا ہے۔

آئی روپ لاگی تو آپ چھے منے بیہ رادھیہ موہنی مورتی رکھی لوتینے
درس پرس موہن مورتی دیکھہ لو پینے
کوئی برھما جاکو پار نہ پاویں سُر نر منی کو گنے
بیرو بھگت کبیرا من ستھرنا ہیں تین پاپی بھج د دکو منے

مطلب:۔ ہردے کے اندر موہن مورتی براج رہی ہے اُسے یتن سے (کوشش سے) ہردے ہی کے اندر رکھے رہو۔ شرت وہاں سے پھسلنے نہ دو۔ اُس کا پرکاش (لمس) پراپت کرو۔ گھل مل جاؤ۔ کروڑوں برھما جب اُس کا پار نہیں پا سکتے تو اور دیوتاؤں منشوں اور منیوں کی بات ہی کیا ہے۔ اے بیرو! جب میرا من ستھرا (یکسو) نہیں ہے تب میں پاپی بھگوان کو کیسے بھجوں۔

(رسالہ وگیان دہلی کا سنت گاتھا نمبر مارچ۔ اپریل ۱۹۵۱ء صفحہ ۹۸)

۹۱ - یاری صاحب

یاری صاحب کے حالاتِ زندگی پردۂ اخفا میں ہیں۔ رسالہ وگیان دھلی کے سنت گاتھا نمبر میں ان کو بیرو صاحب کا مرید بنایا گیا ہے۔ اور بیرو صاحب کا زمانہ سترھویں صدی عیسوی کا آغاز قیاس کیا گیا ہے لیکن رسالہ کلیان گورکھ پور کے لوگ انک میں یاری صاحب کا زمانہ ۱۷۲۵ بکرم اور سمت ۱۷۸۰ بکرم کے درمیان قیاس کیا گیا ہے۔ یہ دونوں امور مشکوک ہیں۔ ہاں یہ امر مسلمہ ہے کہ یہ بیرو صاحب کے مرید تھے اس لئے ان کا ذکر بیرو صاحب کے ساتھ اسی دورِ سوم میں کیا گیا۔

یہ موحد اور صوفی بزرگ تھے۔ دہلی میں اپنے مرشد بیرو صاحب کی خدمت میں رہتے تھے۔ اُن کے وصال کے بعد یاری صاحب خلیفہ مقرر ہوئے اور اپنے مریدوں کو حقائق و معارف کی تعلیم سے بہرہ اندوز کرنے لگے۔ دہلی میں ان کا مزار ابھی تک موجود ہے۔
یاری صاحب کے کئی مرید تھے۔ اُن میں سب سے مشہور بُلّھا صاحب ہوئے۔
یاری صاحب خدارسیدہ بزرگ، اسرارِ معرفت سے آشنا، وحدت پرست تھے

ان کے اشعار میں ریاضت، عبادت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ خدا ذرّے ذرّے میں موجود ہے۔ چناں چہ فرماتے ہیں ؎

گہنے کے گھڑتیں کہیں سونو بھی جاتو ہے
سونو بیچ گہنو اور سونو گہنو بیچ ہے
بھیتر بھی سونو، اور باہر بھی سونو دیسے
سونو تو اچل انت گہنو کو بیچ ہے

دِن دِن پر بیتی اَدِھک موہے ہری کی

کام کرودھ جنجال بھسم بھیئو — برہ اگن لگی دھدھکی
دھدھکتی دھدک سلگتی اتی نربل — جھلمل جھلمل جھلکی
جھری جھری پربیت انگا رادھر یاری — چڑھی آکاش آئے سر کی
دِن دِن پر بیتی اَدِھک موہے ہری کی

پرماتما اور آتما کا سروپ کیا ہے اور وہ کہاں ملتا ہے۔ اس مسئلہ کے متعلق یاری صاحب یوں فرماتے ہیں۔ ؎

جوتی سروپی آتما گھٹ گھٹ رہیو سمائے
پرم تت من بھاؤنو نیک نہ اِت اُت جائے
رُوپ ریکھ وا نو کہاں کوتی سور پر گاس
اگم اگوچر رُوپ ہے کہو یاری ہری کے داس
آٹھ پہر نرکھت رہو سنمکھ سدا حضور
کہو یاری گھر ہی ملے کاہے جاتے دور

درسالہ کلیان گورکھپور کا یوگ انک بابت شراون سمبت ۱۹۹۲ بکرم
مطابق اگست سنہ ۱۹۳۴ء صفحہ ۸۳۱)

۹۲ - بُلّھا صاحب

رسالہ کلیان گورکھپور کے یوگ انک میں بُلّھا صاحب کا ذکر اس طرح مندرج ہے :-

"بُلّھا صاحب کا پہلا نام بُلاقی رام تھا۔ یہ جاتی کے کنبھی تھے اور اپنے شاگرد گلال صاحب کے یہاں ہل جوتنے اور کاشتکاری کے دیگر اُمور کے لئے نوکر تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اپنے مُرشد یاری صاحب سے بیعت حاصل کر کے سُرت شبد کا ابھیاس کیا کرتے تھے اور ذریعۂ معاش کے لئے نوکری کرتے رہے اگرچہ وہ اچھے مہاتما ہو گئے تھے، لیکن دُنیا کو اس کا پتہ تک نہ تھا۔ ایک دِن اُن کا روحانی کرشمہ دیکھ کر گلال صاحب کی آنکھیں کُھلیں اور اُنھوں نے بُلّھا صاحب کی بیعت قبول کرلی۔ تب سے یہ غازی پور کے بُھرکنڈا گاؤں میں رہ کر ست سنگ کرنے لگے۔ ان کے دو شاگرد ہوئے۔ گلال صاحب اور جگ جیون صاحب۔ بُلّھا صاحب کی نظر میں ؎

یہ جگ جیسے سوپن ہے اور یہ مایا جس ڈائنی ہے جو ہرلیتی ہے پران

فرماتے ہیں ؎

اِتنی آسا چھوڑیئے بھج لیجیے نجوُ نام

اُچرے کوئی سنت جن جنھ سمرِیو ہے نام

آٹھ پہر چونسٹھ گھڑی جن بُلّھا دھرو دھیان

نہیں جانو کونی گھڑی آئی ملیں بھگوان

جاگ آئے جگ جاگئے پگئے ہری کے نام

بُلّھا کہے وچار کے چھوڑ دیہو تن دھام

(رسالہ کلیان گورکھپور کا یوگ انک شراون سمت بکرم مطابق اگست ۱۹۳۵ء صفحہ ۷۰۳)

۹۳۔ مُلّا محمد علیم تحقیق عظیم آبادی

قدیم تذکرہ نگار شاعر کا نام اور اُس کا ایک شعر کافی سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے حالاتِ زندگی کسی تذکرے میں نہیں مل سکے بعض کتابوں سے اِتنا معلوم ہو سکا کہ ہندی کے بلند پایہ شاعر تھے مولف "بہار اور اُردو شاعری" نیز مولف "نوائے وطن" نے ان کا صرف اتنا ہی ذکر کیا ہے کہ عظیم آباد کو ان کے مسکن اور مدفن ہونے کا فخر حاصل ہے۔ عظیم آباد کے حکام اور صوبہ دار مُلّا صاحب کی بہت عزت کرتے تھے، اور مسند پر اپنے ساتھ بٹھاتے تھے۔ ان کے صرف دو شعر مل سکے ہیں جو ہدیۂ ناظرین ہیں:

جھمکڑا باندھ کر دل موہ لے جا   سلونے سانورے اے اِدھر جا

سرجن تیرے مکھڑے میں سورج کی کرن دھائے
دیکھا ہوں جو تجھ کو لکھ کون نینا میرے چندھرائے

۹۴۔ ناظر

وہ ۱۶۰۰ء میں آگرہ کے مقام پر پیدا ہوا۔ اگرچہ کلام ناپید ہے۔ مگر یہ امر مسلّمہ ہے کہ یہ اپنے زمانے کا مشہور اور ذی کمال ہندی شاعر تھا۔"

(ہندی کے مسلمان شاعر۔ مکتبۂ اردو لاہور، از عبداللہ [illegible])

بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ یہ راجپوتانے کے رہنے والے تھے (رسالہ نگار لکھنؤ کا ہندی شاعری نمبر جنوری ۱۹۳۱ء صہ ۳۹)

۹۵۔ شیخ تقی

ان کا مفصل حال اور کلام نایاب ہے۔ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کبیر جی کے مُرشد تھے۔ کبیر پنتھ کے مُسلمان کبیر جی کو شیخ تقی ہی کا مُرید مانتے ہیں۔ کبیر جی نے بھی شیخ صاحب کا نام اپنے اشعار میں لیا ہے۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ تقی مانک پور کے رہنے والے تھے۔ چناں چہ کبیر نے ایک پد [illegible] کہا ہے

مانک پور ہی کبیر بسیری ۔ مدجنی سُنی شیخ تقی کیبری
اوجی سُنی جون پور تھاما ۔ جھونسی سُنی پیرن کے ناما

یہ ہندی کے اچھے شاعر تھے۔ ان کا کلام نایاب ہے۔

(ہندی ساہتیہ کا اتہاس رام چندر شکل صفحہ ۷۶)

۹۶۔ شیخ محی الدین

یہ ایک مشہور صاحب کشف و کرامات صوفی فقیر تھے۔ ملک محمد جائسی کے استاد تھے۔ افسوس کہ ان کے حالات اور کلام نایاب ہیں۔

(ہندی ساہتیہ کا اتہاس رام چندر شکل صفحہ ۹۹)

۹۷۔ شیخ نبی

ان کا زمانہ شاعری سمت ۱۶۷۶ بکرم مطابق ۱۶۱۹ء مانا جاتا ہے۔ جہاں گیر بادشاہ کے عہد میں ہوئے ہیں۔ انھوں نے "گیان دیپ" نام کی مثنوی ہندی زبان میں لکھی ہے۔ جس میں راجہ گیان دیپ اور رانی دیوجانی کی کتھا ہے۔ رام چندر شکل نے لکھا ہے کہ شیخ نبی کو عشقیہ شاعری کا آخری شاعر سمجھنا چاہیے۔ یہ ضلع جون پور میں دوس پور کے پاس مئو نام کے گاؤں کے رہنے والے تھے۔ نمونہ کلام نہیں نہیں مل سکا۔ (ہندی ساہتیہ کا اتہاس، از رام چندر شکل صفحہ ۱۱۰)

۹۸۔ عالم

عالم تخلص کے دو شاعر ہندی ساہتیہ میں ملتے ہیں۔ ایک اکبر کے عہد میں اور دوسرا اورنگ زیب کے عہد میں ہوا۔ یہاں اکبری عہد کے عالم کا ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ اکبری عہد میں ہوئے۔ انھوں نے ۹۹۱ھ مطابق سمت ۱۶۳۹-۴۰ بکرم میں وہ مادھوانل کام کندلا" نام کی پریم کہانی ۔ دوہا ۔ چوپائی میں لکھی۔ پانچ پانچ چوپائیوں

پر ایک ایک دوہا یا سورٹھا ہے۔ شاعر نے اِس کے سالِ تصنیف کا ذکر اس طرح کیا ہے ؎

دِلّی پت اکبر سُرطاناں　　سپت دیپ میں جا کی آناں
دھرم راج سب دیس چلاوا　　ہندو تُرک پنتھ سب لاوا
سَن نو سَو اِکا نوے آہی　　کرو کتھا او بولو تاہی

(ہندی ساہتیہ کا اتہاس صفحہ ۲۰۰)

۹۹۔ جمال

ان کا زمانۂ تصنیف و تالیف سمت ۱۶۲۷ بکرم مانا گیا ہے۔ اِن کے نیتی او ر شرنگار کے دوہے۔ راجپوتانے کی طرف بہت ہر دل عزیز ہیں۔ ان کا کلام بڑا پُر درد اور موثر ہے۔ کوئی گرنتھ تو ان کا نہیں ملتا، البتہ دوہوں کا مجموعہ ملتا ہے۔ دوہوں میں سوز و گداز کے علاوہ لفظی شان بھی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ انھوں نے اپنے دوہوں میں کچھ پہیلیاں بھی رکھی ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ؎

پُورنم چاند۔ کُسُوُ بنھ رنگ۔ ندی تیر۔ دُرم ڈال
ریت بھیت۔ بھُس لینہو۔ اتھر ندی جمال
رنگ چچول مجیٹھ کا سنت بچن پرتی پال
پاہن ریکھ رُو کرم گت اے کہی مٹیں جمال۔
جملا ایسی پریت کر جیسی کیس کرائے
کے کالا۔ کے اُجلا۔ جب تب سر شیوں جائے
منسا تو کاک بھئے، نینا ں بھئے دلال
دھنی وَست بیچے نہیں کِس بِدھ بنے جمال
بال پنے دھولا بھیا تُرن پنے بھیا لال
بِرِدھ پنے کالا بھیا کارن کون جمال

کامِن جادک انگ رچیو دمکت کتا کور
اِم ہنسا موتی تجے اِم چگ اپنے چکور
(ہندی ساہتیہ کا اتہاس' از رام چندر شکل صفحہ ۲۰)

۱۰۰۔ شیخ عبداللہ و شیخ گدائی

مُغل بادشاہوں کی رواداری، آزاد خیالی اور وسیع المشربی کے سبب دربار میں ہندی علماء۔ فضلاء۔ ادباء اور شعراء کا اجتماع قدرتی امر تھا مغلیہ حکومت کا بانی بابر خود بھی ترکی زبان میں شعر کہتا تھا اور رفتہ رفتہ ہندی زبان کی طرف جھک رہا تھا۔ چناں چہ اس کے ترکی اشعار میں ہندی کے الفاظ موجود ہیں۔ جب اُس کے ہاتھ سے ابراہیم لودھی مارا گیا تو کسی نامعلوم ہندی شاعر نے اس واقعہ کو مندرجہ ذیل ہندی چوپائی میں قلم بند کیا تھا۔

چوپائی

نو سو اُوپر تھا بتیسا | پانی پت میں بھارت دیسا
اٹھئیں رجب شکروارا | بابر جیتا ابراہیم ہارا

ممکن ہے دربار میں اور بھی ہندی شاعر موجود ہوں۔ بابر نے ضرورتِ زمانہ کے ماتحت ہندی سیکھنے کی کوشش بھی کی تھی، لیکن موت کا پیغام جلدی آگیا اور اس کی یہ خواہش پوری نہ ہوسکی۔ اُس کے بعد ہمایوں نے ہندی زبان کی طرف توجہ مبذول کی۔ چناں چہ اس کے درباری شعراء میں ایسے فارسی گو مسلمان شعراء بھی تھے، جو فارسی کے علاوہ ہندی میں بھی شعر کہتے تھے، اور ہندی گیتوں کو بڑے پریم سے اپنے سوامی کے سامنے گاتے تھے۔ ان میں شیخ عبداللہ بلگرامی اور شیخ گدائی دہلوی کا نام نامی بخاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ لیکن افسوس کہ ان کا ہندی کلام ہنوز دست یاب نہیں ہوسکا۔

(اکبری دربار کے ہندی کوی۔ صفحہ ۲۶۔ ۲۷)

۱۰۱۔ ابوالفیض فیضی

پورا نام ابوالفیض تھا شیخ مُبارک کا لڑکا تھا۔ ۱۵۴۷ء میں پیدا ہوا۔ اس کو تاریخ۔ فلسفہ طِب اور انشا پردازی میں کمال حاصل تھا۔ سنسکرت زبان کا جیّد عالم تھا چنانچہ اس نے گیتا اور مہا بھارت کے تراجم سنسکرت زبان سے فارسی نظم میں کئے۔ سنسکرت کی منظوم کتب کے علاوہ اس نے بیجا۔ گنتا اور لیلاوتی جیسی مشہور علم ریاضی و جبرو مقابلہ کی سنسکرت کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ سنسکرت زبان کو اس شاعر پر ناز تھا۔ فیضی کو دمہ کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا اکثر اسی مرض میں ۴۹ سال کی عمر پاکر ۱۵۹۵ء مطابق ۱۰۰۴ھ میں بمقام آرہ انتقال کیا۔ اس کو ہندوستان کا سب سے بڑا مصنف سمجھا جاتا ہے۔ سنسکرت زبان خاص طور پر اس کی احسان مند ہے۔ رامائن اور مہابھارت کے تراجم اس کے قلم کا نتیجہ ہیں۔ ہندی میں زیادہ تر دوہے لکھے ہیں، لیکن دست یاب نہیں ہو سکے۔

۱۰۲۔ دارا شکوہ قادری

یہ شاہ جہاں بادشاہ کا سب سے بڑا بیٹا ممتاز محل کے بطن سے تھا تاریخِ ولادت ۲۰ مارچ ۱۶۱۵ء مطابق ۲۹ صفر ۱۰۲۴ھ ہے۔ بادشاہ نے جشنِ قمری میں اس کو "شاہِ بلند اقبال" کا خطاب دیا تھا۔ یہ بڑا بہادر سخی اور آزاد خیال تھا۔ مگر پرلے درجے کا ضدی۔ تیز مزاج اور خود سر تھا۔ مذہب اسلام کا اِتنا پابند نہ تھا، اس لئے مسلمان اراکینِ سلطنت اس سے ناخوش تھے۔ جب حصولِ تخت کے لئے شاہ جہاں کے چاروں بیٹوں میں باہم جنگ چھڑ گئی تو اورنگ زیب نے شجاع اور مراد کے بعد ۲۹ اگست ۱۶۵۹ء مطابق ۱۲ ذی الحجہ ۱۰۶۹ھ کو دارا شکوہ کو بھی قتل کر دیا۔

دارا فارسی۔ عربی کے علاوہ سنسکرت کا جیّد عالم اور شاعر تھا۔ ہندی سے اُسے خاص اُنس تھا۔ وہ صوفی مشرب۔ فقیر دوست اور عرفان و تصوف کا دل دادہ تھا۔ میاں میر کا مرید تھا اور بزرگ ہستیوں بابا لال داس سے بھی فیض یاب ہوتا تھا

اس نے ایک کتاب مجمع البحرین لکھی ہے جس میں ہندو مذہب اور اسلام کو ایک ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ جا بجا آیاتِ قرآنی سے حوالے دیئے ہیں۔ اپنے اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے ۱۶۵۶ء میں اُس نے سنسکرت کی ایک کتاب موسومہ "اپنکھٹ" کا ترجمہ فارسی میں کیا اور اُس کا نام "سرالاسرار" رکھا۔ علاوہ ازیں بھاگوت پُران بھگوت گیتا سنسکرت کتب کا ترجمہ بھی فارسی میں کیا۔ قادری تخلص تھا۔

۱۰۳ - داؤد

داؤد سترھویں صدی عیسوی میں احمد آباد (گجرات) کا ایک دُھنیا تھا۔ اس نے راجپوتانے میں ایک مذہبی فرقے کی بنیاد ڈالی جس کو کبیر کی تعلیم کی شاخ کہا جا سکتا ہے۔ اس نے بتوں کی پرستش اور مندروں کے دستور پر بڑا اعتراض کیا اور صرف زبان سے رام رام کہنا پوجا کے لئے کافی سمجھا۔ اکثر کتابیں اس کی تصنیف سے اب تک مشرقی راجپوتانے میں موجود ہیں۔ نمونہ کلام:۔

داؤد ڈیرہ باغ میں بستی کی ڈھب ڈھیان
جب آویں گی دور وٹیاں تب سوجھت بھوگیان

داؤد دنیا باوری کہے چام کو رام
پونچھ مروڑے بیل کی کاڈھے اپنا کام

۱۰۴ - حضرت مخدوم شیخ احمد عبدالحق ردولوی

آپ کا نام شیخ احمد عبدالحق تھا۔ بڑے پایہ کے درویش تھے۔ ہزاروں آدمی آپ کے حلقۂ بگوش ہوئے۔ ہندو، مسلمان سب آپ کے معتقد تھے۔ آپ کا زیادہ وقت عبادت و ریاضت میں بسر ہوتا تھا۔ عرصے تک آپ کا قیام پنجاب کے ایک مقام سنام میں رہا۔ آپ کو ہندی زبان سے خاص شغف تھا۔ کبھی کبھی ہندی میں دوہے بھی کہتے تھے

آپ کا انتقال ۱۴۸۲ء میں بمقام رودول ضلع بارہ بنکی، اُتر پردیش میں ہوا۔ اور اسی بڑے قصبے میں آپ کا مزار ہے جو مرجعِ خاص و عام ہے۔ ہر سال عُرس ہوتا ہے اور عظیم الشان میلہ لگتا ہے۔ نمونہ کلام ؎

کنواں ہو تو پاٹوں سمندر کہ پاٹن جائے
بارا ہو تو برجوں، چھیں کہ برجن جائے

(ہندی کے مُسلمان شعرا۔ از امیر حسن نورانی صفحہ ۳۰)

۱۰۵۔ مولانا سیّد محمد جونپوری

آپ مذہب اسلام کے زبردست عالم تھے۔ ۱۴۴۳ء میں پیدا ہوئے۔ جون پور (جو اُتر پردیش کا مشہور شہر ہے) کے رہنے والے تھے۔ بعض مُسلمان علمار کو ان سے مذہبی معاملات میں اختلاف ہو گیا تھا، جس کی وجہ سے عام مسلمان آپ کے مخالف ہو گئے تھے۔ آپ کی زندگی کا بیشتر حصہ سیر و سیاحت میں صرف ہوا۔ آپ ہندی اور سنسکرت کے عالم تھے۔ اور ہندی زبان میں شعر کہتے تھے۔ آپ کے ہندی دوہے خاص طور پر مشہور ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

ہوں بلہاری سجناں ہوں بلہار ہوں سر جن سہرا ساجن محمد گل ہار

تو روپ دیکھ جگ موہیا، چندر نرائن بھان
انھیں روپ بِن ہووں کو وہی نہ ہوئے آن
چندر کہے نرائن کون شور دیکھ آئے
ایسا بھگوت بھٹیے، دشٹ پاپ بھجر جائے

۱۰۶۔ مُلّا دو پیازہ

عبدالمومن نام۔ ولی محمد کا بیٹا اور اکبر بادشاہ کا جلیسِ خاص تھا۔ بذلہ سنجی

اور لطیفہ گوئی میں نہایت مشاق تھا۔ راجہ بیربل کا ہم عصر تھا۔ ان دونوں کی نوک جھونک کے اکثر لطیفے زبان زدِ عام ہیں۔ فارسی اور ہندی کا شاعر تھا۔ فارسی میں ابوالفضل سے اصلاح لیتا تھا۔ اس نے ترکی زبان کا ایک لغت "اتراکِ عالم گیری" لکھا ہے۔ آخری عمر میں قصبہ ہنڈیا، ضلع الہ آباد میں پہنچا۔ لوگوں سے بستی کا نام پوچھا، کسی نے کہا "ہنڈیا"۔ آپ نے کہا کہ دو پیانہ اب ہنڈیا میں آ کر کہاں جائے۔ آخر وہیں وفات پائی اور دفن ہوا۔

اس کا اصل وطن متھرا تھا۔ مدت تک وہاں رہا اور ہندی زبان میں دوہے لکھے جو اکثر فقیروں کو یاد ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو ؎

مکت ہیں تن بدن میں اکھ بیٹھے ۔۔۔ پیا کے پریم رس کا چاکھ بیٹھے

ایسا لگے ہے مجھ کو جوں کھانڈ کا کھلونا ۔۔۔ وہ گورا گورا لڑکا بامن کا شیخ کہونا

۱۰۷۔ رزق اللہ شیخ

یہ شیخ عبدالحق بن سیف الدین دہلوی کا بھتیجا تھا۔ فنِ تاریخ میں ایک کتاب "واقعاتِ مشتاق" اس کی تصنیف ہے جو سلطان سکندر کے عہد میں لکھی گئی تھی۔ ہندی اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا۔ فارسی میں آشنامی اور ہندی میں راجن تخلص کرتا تھا۔ ہندی زبان میں "جوت نرنجن" اس کی تصنیف ہے ۔۔۔ ۹۰۱ھ ۱۴۹۵ء میں پیدا ہوا، اور ۱۵۶۱ء عیسوی مطابق ۹۴۹ھ میں انتقال ہوا۔

(قاموس المشاہیر جلد اول صفحہ ۲۶۰)

۱۰۸۔ رسمی

ان کا نام کمال خان ولد اسمٰعیل خان تھا۔ دربار بیجاپور سے اس کا تعلق تھا۔ اس نے [illegible] "خاور نامہ" کا

فارسی سے نظم دکنی میں ترجمہ کیا۔ خاور نامہ میں جناب امیر علیہ السّلام کے محاربات مذکور ہیں اور فردوسی کے شاہنامہ کی طرز پر لکھا ہے۔ شہربانو بیگم کا عقد سُلطان محمد بن ابراہیم عادل شاہ کے ساتھ ہوا تھا۔

(تاریخ ادب اردو۔ از سکینہ صاحب۔ صفحہ ۷۶)

۱۰۹۔ قاضی محمود گجراتی

قاضی محمود گجراتی متوفی سنہ ۹۲۰ھ ہندی کے زبردست شاعر تھے۔ ان کے اشعار مجالسِ حال وقال کو ایک عرصہ دراز تک گرماتے رہیں گے۔

(پنجاب میں اُردو صفحہ ۱۱۶)

۱۱۰۔ طاہر

یہ جہانگیر کے عہد میں ہوئے۔ انھوں نے ایک کتاب "کوک سار" سنہ ۱۰۳۰ھ میں لکھی۔ (پنجاب میں اُردو۔ صفحہ ۱۱۷)

۱۱۱۔ شیخ پیر محمد سلون

شیخ پیر محمد سلون متوق سنہ ۱۰۴۷ھ ہندی و فارسی میں عمدہ اشعار لکھتے تھے۔

(پنجاب میں اُردو۔ صفحہ ۱۱۷)

۱۱۲۔ شیخ جنید موہانی

شیخ جنید موہانی چشتی متوفی سنہ ۱۰۷۸ھ۔ عربی۔ فارسی اور ہندی کے اعلیٰ شاعر تھے۔

(پنجاب میں اُردو۔ صفحہ ۱۱۷)

۱۱۳۔ دولت قاضی۔ علاول عبد الحکیم۔ دولت وزیر بہرام۔ محمد اکبر کبیر محمد۔ شمشیر علی شمس الدین

سترھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں دولت قاضی نے ”نور چندرانی“ بنگالی نظم لکھنی شروع کی۔ قاضی کی بے وقت وفات کی وجہ سے یہ نظم ختم نہ ہو سکی۔ علاول ایک اور مسلمان شاعر نے ۱۶۵۸ء میں اس کی تکمیل کی۔ عبد الحکیم نے قصہ یوسف زلیخا کو اسی زبان میں نظم کیا۔ دولت وزیر بہرام نے لیلیٰ مجنوں کی مثنوی لکھی۔ محمد اکبر نے یمین جلال ایک عشقیہ افسانہ پر قلم اٹھایا۔ کبیر محمد نے رنگ مالا، شمشیر علی نے ”ریجوان ساہا“ (رضوان شاہ) اور شمس الدین صدیق نے ”بھاو لابھ“ تصنیف کیں۔

(پنجاب میں اردو۔ صفحہ ۱۱۷-۱۱۸)

۱۱۴۔ شیخ دانشمند

میرٹھ کے قریب جھنجھانہ ایک پرانی بستی ہے۔ عہد ماضی میں یہ ایک مردم خیز قصبہ تھا، اور بعض مشاہیر وہاں پیدا ہوئے۔ شیخ دانشمند بھی وہیں کے رہنے والے تھے۔ صوفی منش تھے۔ ہندی اور فارسی کے شاعر تھے۔ انھوں نے علوم ہندیہ میں کمال حاصل کر کے ہندی کتب کے تراجم اکبر کے لئے فارسی زبان میں کئے۔

۱۱۵۔ محمد تغلق

اس کا اصلی نام جوناخاں تھا۔ اپنے باپ غیاث الدین تغلق کی وفات پر ۱۳۲۵ء میں محمد تغلق کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ یہ عالم فاضل بادشاہ تھا۔ فلسفہ و ریاضی کا اسکالر۔ علم طب و نجوم کا ماہر۔ فارسی اور ہندی کا اعلیٰ شاعر اور اعلیٰ درجہ کا خوش نویس تھا۔ کئی زبانیں جانتا تھا۔ ”اکبری دربار کے ہندی کوی“ میں صفحہ ۲۳ پر لکھا ہے کہ محمد تغلق جو خود بھی کامیاب ادیب اور شاعر تھا۔ اس نے علما و ادبا کی ایک جماعت اپنے دربار میں

رکھی ہوئی تھی۔ افسوس کہ نمونہ کلام نہیں مل سکا۔

۱۱۶- فاضل شاہ و شیخ حسین

فاضل شاہ ہندی کے مشہور شاعر گزرے ہیں۔ یہ بھگتی کال میں پریم آشری گروہ کے شاعر تھے۔ عشق و محبت ان کا پیغام تھا اور مجاز سے حقیقت کی تعلیم دیتے تھے۔ محبت کے افسانے اور سچے واقعات نظم کرکے لوگوں کو خدا کی طرف متوجہ کرتے تھے۔ ان کی زبان میں اودھی کی چاشنی تھی۔ (تاریخ ادب ہندی، از ظہیر احمد علوی صفحہ ۴۸)

اسی زمانے میں شیخ حسین بھی ہندی کے شاعر گزرے ہیں۔ یہ بھی پریم مارگی اور کرشن بھگت شاعر تھے، لیکن ان کا حال اور کلام کسی تذکرے میں موجود نہیں صرف نام ملتا ہے۔ انھوں نے ایک عاشقانہ مثنوی لکھی ہے۔

(ہندی ساہتیہ کا اتہاس: از رامچندر شکل)

۱۱۷- سدنا

سدنا بھگت کا نام ایشور پریمیوں کی صف میں ایک نمایاں پہلو رکھتا ہے۔ اس کے سوانح حیات ہمارے لئے وحدت کا درس لئے ہوئے ہیں۔ اس کا جنم ایک قصاب خاندان میں ہوا، مگر مادر قدرت نے یوم ولادت ہی سے اس کے کانوں میں ایشور بھگتی کا منتر پھونکا اور جام وحدت پلا کر سرشار کر دیا۔ قصاب خاندان میں پیدا ہونے کے باعث بچپن ہی سے اس نے کئی بار بے گناہ بکریوں کا گلا کٹتے دیکھا۔ جوان ہوکر اس نے اپنا آبائی پیشہ اختیار کیا اور گوشت فروشی کو ذریعہ معاش بنایا۔ ایک دن ایک حاملہ بکری کو ذبح کرتے وقت اس کی بے قراری، تڑپ اور آہ و زاری سے سدنا کے دل پر قدرتی طور پر چوٹیں لگیں۔ گویا بکری کی موت نے اس کی زندگی بدل دی۔ اس نے یہ کام بالکل ترک کر دیا اور آئندہ کے لئے گناہوں سے توبہ کرکے یادِ خدا میں محو رہنے لگا۔ آخر ایک سادھو کی صحبت میسر آگئی اور سدنا مکمل طور پر ایشور بھگت بن گیا۔

سدنا کی دو نظمیں شری گورو گرنتھ صاحب میں موجود ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہوے

بانی سدنے کی۔ راگ بلاول

نرپ کنیا کے کارنے۔ اک بھیا بھیکھ دھاری

کامارتھی۔ سوارتھی۔ واں کی پیج سواری

تو گن کہاں جگت گرا۔ جو کرم نہ ناسے

سنگھ سرن کت جائی اے۔ جو جمبک گراسے

ایک بوند جل کارنے۔ چاترک دکھ پاوے

پران گئے ساگر ملے۔ پھن کام نہ آوے

پران جو تھا کے تھر نہیں۔ کیسے برماؤ

بوڈ موئے نوکا ملے۔ کہو کاہے چڑھاؤ

میں ناہیں کچھ ہو ناہیں۔ کچھ آہے نہ مور

اؤسر لجا راکھ لے ہو۔ سدنا جن تورا

۱۱۸۔ رجّب

یہ صوفی منش بزرگ ہوئے ہیں۔ ان کے ناصحانہ کلام میں غضب کی تاثیر اور درد ہے۔ زیادہ تر دوہے کہتے تھے۔ دھارت کی تلقین میں یہ پیش پیش تھے۔ حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہوے

آشا۔ اشٹ۔ آیا سنا۔ کھان۔ پان۔ پہران

رجب جبا کے گھٹ ملیں تا کو ملیا جان

مورکھ کو ست سنگ سے کچھو پرا پت ناہیں

رجب دانہ کوڑ گو گلے نہ ہانڈی ماہیں

مو احد بزرگوں میں رجب کا نام بہت بلند ہے فرماتے ہیں ۹

الٹا چلے سوادلیا سودھی گت سنسار
رجب الٹے پانو سے سیدھے پگ کو دھار

۱۱۹۔ سلّھے شاہ

یہ ایک صوفی بزرگ ضلع انبالہ (پنجاب) میں ہوئے۔ حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ صرف ایک شعر ملا جو حاضر ہے ؎

بوڑھ بڑھاپا آگیا سن بھیّا سلّھے
پانو پونت سپلوت ہو، یا دھن ہو پلّے

۱۲۰۔ شیخ فرید ثانی

ہندی ساہتیہ کا اتہاس، از بھوانی شنکر میں صفحہ ۵، پر آپ کا نام ہندی کے صوفی شعرا کی فہرست میں دیا گیا ہے۔ کلام دست یاب نہیں ہو سکا۔ قاموس المشاہیر جلد دوم، صفحہ ۲۵۱ پر آپ کا مختصر حال یوں درج ہے:

"اکبر کے انتقال کے وقت یہ شخص شہر آگرہ کی فوج کا سردار تھا خدمات کے صلے میں عہد جہاں گیری میں بہت کچھ مناصب اور مراتب پائے۔ اس پر فالج گر پڑا تھا جس کی وجہ سے شاہی خدمات بجا لانے کے نا قابل ہو گیا۔ اس کی نا قابلیتِ کار کے سبب اعتماد الدولہ والدِ نور جہاں اس کا کام کرنے لگے، جو رفتہ رفتہ ان کی ترقی کا باعث ہوا۔ اس نے ۱۶۱۶ء مطابق ۱۰۲۵ھ میں انتقال کیا۔"

۱۲۱۔ شیخ بھیکھن

ہندی گو مسلمان شعرا کے حالات معلوم کرنے کے لئے انتہائی تحقیق و تجسس سے کام لینا پڑتا ہے۔ چنانچہ شیخ بھیکھن کے حالات شری جتاب سنگھ بی۔ اے۔ گیانی

ہیڈ ماسٹر گوروارجن دیو خالصہ ہائی اسکول ترن تارن (پنجاب) کی تصنیفِ منیف بزبان پنجابی "ناداں اتے تھاواں دا کوش" کے صفحہ ۱۴۱ پر لکھے ملے ہیں، اُس کا اُردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے :-

کہا جاتا ہے کہ شیخ بھیکھن جی اکبر بادشاہ کے زمانے میں ہوئے ہیں۔ ان کی ولادت موضع بکینی (پکوئی) ضلع لکھنؤ (یو۔پی) میں ہوئی۔ یہ اُس زمانے کے علماؤ فضلا میں برگزیدہ و سربرآوردہ سمجھے جاتے تھے۔ قرآن شریف کے حافظ بھی تھے، صوفی منش بزرگ تھے۔ کلام بھی عرفان وتصوّف کا ایک بحرِ موّاج ہے۔ ۱۵۷۳ء میں وفات پائی۔ آپ کے صوفیانہ کلام میں سے دو شبد شری گورو گرنتھ صاحب میں دیے گئے ہیں۔ ملاحظہ ہوں ؎

(از شری گورو گرنتھ ساگر صفحہ ۴۸۲۔ راگ سورٹھ، بانی بھگت بھیکھن)

نینوں نیر بہے تن کھینباں ۔ بھئے کیس دُودھ وانی

رُدھا کنٹھ شبد نہ اُچرے ۔ اب کیا کرے پرانی

رام رائے ہوئے بید بنواری ۔ اپنے سنتھ لیہو اُبھاری

ماتھے پیر سریر جلن ہے کرک کریجے ماہیں

ایسی بیدھن اُپج کھری بھئی واکا اُوکھد ناہیں

ہر کا نام اَمرت جل نرمل ایہہ اَوکھد جگ سارا

گور پرساد کہے جن بھیکھن پاؤ موکھ دوارا

ایسا نام رتن نرمولک پُن پدارتھ پایا

انِک جتن کہ ہردے راکھیا رتن نہ چھپے چھپایا

ہر گُن کہتے کہن نہ جائی جیسے گونگے کی مٹھائی

رسنا رمت سُنت سکھ سرونا چت چیتے سکھ ہوئی

کہو بھیکھن دوئے نین سنتو کھے جیہہ دیکھاں تے کھوئی

۱۲۲۔ بیگم بادشاہ محل۔ عالم

یہ جہاں گیر بادشاہ دہلی کی بیگم تھیں عالم تخلص تھا سنہ ۱۶۲۰ء مطابق سنہ ۱۰۲۹ھ میں فوت ہو گئیں۔ (قاموس المشاہیر جلد اول صفحہ ۱۲۰)

نمونہ کلام

زین کٹت ہے تڑپت موری　　　کون جتن کروں داس تہارے

(ہماری زبان یکم ستمبر سنہ ۱۹۶۰ء صفحہ ۱۶)

۱۲۳۔ مُلّا نوری

یہ اعظم پور کے والے تھے۔ شہنشاہ اکبر (سنہ ۹۶۲ھ تا سنہ ۱۰۱۴ھ) کے زمانے میں گزرے ہیں۔ انہیں ملّا فیضی سے بے حد ربط و ضبط تھا۔ قائم چاند پوری اور میر حسن دہلوی نے اپنے تذکروں میں ان کا ذکر کیا۔ جناب عبد العلیم نامی کا ایک مضمون ""مسلمان اور ہندی ادب"" علی گڑھ میگزین جلد نمبر ۶ شمارہ ۵ تا ۸ سنہ ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا اُس میں وہ لکھتے ہیں کہ مُلّا نوری ہندی شاعری میں بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ نمونہ کلام نہیں مل سکا۔

۴۔ رِیتی کال (فنّی دور)

سمنت ۱۷۰۰ بکرم سے سمنت ۱۹۰۰ بکرم تک

رِیتی کال سے متعلق کچھ عرض کرنے سے پہلے مختصر طور پر یہ کہہ دینا بھی ضروری ہے کہ دونوں قوموں کے میل جول سے عربی۔ فارسی اور تُرکی الفاظ بھی ہندی میں آ گئے چناں چہ تلسی داس ایسا مُحتاط شاعر بھی غنی۔ غریب۔ صاحب۔ اطاعت عمر دراز وغیرہ متعدد الفاظ استعمال کر گیا۔ اب رِیتی کال میں الفاظ کے علاوہ بعض فارسی بحور بھی ہندی میں آ گئیں۔

اکبری عہد سے پہلے ہندی شاعری بلحاظ فن و اصول بالکل غیر منتظم اور قواعد عروض کی پابندیوں سے قطعاً بے نیاز تھی، لیکن جب اکبر کی رواداری۔ وسیع المشربی آزاد خیالی۔ صُلح پسندی اور ادب پروری کے ظلِّ عاطفت میں جملہ علوم و فنون نے نئے لباس میں ملبوس ہونے لگے تو ہندی شاعری نے بھی کروٹ لی اور کچھ ایسے جدت پسند شعرا پیدا ہوئے جنھوں نے اِس کے شاعرانہ کمالات۔ نزاکتِ خیالات اور ندرتِ بیان کا جائزہ لے کر ہندی شاعری کے اصول مرتّب کئے اور زبان کی ہیئت پر ناقدانہ نظر ڈالی۔ ان نبض شناسانِ سخن میں کیشوداس (۱۵۵۵ء سے ۱۶۱۷ء) غالباً پہلا شخص ہے جس نے ہندی شاعری کے محاسن و صنائع بدائع کو جانچا اور پرکھا۔ اُس نے فنِ شاعری پر بحث کی اور ہر چیز کی مثال اشعار میں دی۔ امثلہ میں دیے گئے اشعار بھی زیادہ تر خود ہی کہے۔ اُس کی قادر الکلامی کا زندہ ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے

کہ اُس نے ہر رنگ ۔ ہر بحر اور ہر صنف میں شعر کہہ کر حدُودِ سخن کو وسعت دی۔ ان ہی ایام میں کرپارام نے حُسن و عشق کو بھی شاعری میں داخل کر دیا اور عشقیہ شاعری کی بُنیاد رکھی اور اس موضوع پر طبع آزمائی ہونے لگی۔ چنانچہ ہن لال مصر متوطن چرکھری نے ایک کتاب "شرنگار ساگر" لکھی۔ کرنیس کوی نے "کرن بھرن"، "شرن بھوشن" اور "بھوپ بھوشن"، تین کتابیں علم بیان و علمِ معانی کے موضوع پر لکھیں۔ لیکن فنی شاعری کا باقاعدہ آغاز کیشو سے پچاس برس بعد چنتامنی تر پاٹھی سے ہوا۔ انھوں نے ۱۶۴۳ء کے قریب "کاویہ ووویک"، "کوی کل کل پیترو" اور "کاویہ پرکاش" تین کتابیں جدید موضوعات پر لکھ کر جدید شاعری کی بُنیاد رکھی۔ یہ تکوان پور ضلع کان پور کے رہنے والے تھے۔ ۱۶۶۵ء کے بعد ناگپور چلے گئے اور وہاں فنِ عروض سے متعلق "چھند وچار" نامی کتاب لکھی۔ ان کی طرزِ بیان اور حسنِ ادا نہایت دل کش اور دل نشین ہے۔

اِس دَور کے شاعروں کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ سنسکرت شاعری کے آخری دَور کی مطابقت کرتے ہوئے انسان کے مختلف جذبات کو شاعری کی زبان میں ادا کرتے تھے اور اپنے اشعار کو سنسکرت کے اصول شاعری کے مطابق صنائع بدائع سے مرصع کرتے تھے۔ انھوں نے بھارت مُنی کے بتائے ہوئے نو مختلف انسانی جذبات یا رسوں میں سے شرنگار رس کو خاص طور سے اپنایا تھا۔ اس رَس کا تعلق وصل و فراق کے سلسلے میں پیدا ہونے والے مسرّت و غم کے جذبات سے ہے۔ اسی لیے اس دَور کی شاعری کا بیشتر حصہ عشقیہ شاعری پر محمول ہے۔

مُسلمان بھائیوں نے بھی اس نئے اندازِ بیان سے متاثر ہو کر فنی شاعری میں اپنی سحر کاری اور معجز نگاری کے جوہر دکھائے اور فنِ عروض کی پابندیوں میں محدود رہ کر وہ زورِ تخیل، لطافتِ بیان اور ندرتِ ادا دکھائی کہ آج تک اُن کی شاعرانہ رنگینیاں اور رعنائیاں پڑھنے والوں کو والہ و شیدا بنائے ہوئے ہیں ان جادو نگاروں میں سید برکت اللہ پیمی۔ سید غلام نبی بلگرامی۔ میر عبدالجلیل بلگرامی دیوان سید رحمت اللہ۔ رس لین۔ شاہ محمد کاظم۔ قلندر کاکوروی۔ علی محب خاں

پریتم۔ شاہ غلام حسین ایلچ پوری وغیرہ متعدد شعرا نے گہر ہائے آبدار سے ہندی زبان کا دامن اس قدر بھر دیا کہ ابدالآباد تک ہندی زبان اُن کی احسان مند ہے۔ علاوہ ازیں اس دور میں اور بھی بیسیوں مُسلمان ہندی گو ہوئے جن کی فہرست طویل ترین ہے، لیکن افسوس کہ تذکرے اُن کے حالات اور کلام کا پتہ دینے سے عاجز ہیں بعض کا صرف نام ہی ملتا ہے۔ بہر حال انتہائی کد و کاوش کے بعد راقم الحروف کو جو کچھ کم و بیش تحقیقات بہم پہنچی، ہدیۂ ناظرین ہے۔ ہاں یہ عرض کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فتی دور میں بھی بھگتی اور پریم کے اثرات بعض شعرا کے یہاں جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ کیوں کہ جب کوئی نئی طرز رواج پاتی ہے، تو اس کے زوال پذیر ہونے پر بھی اُس کے اثرات ضرور باقی رہ جاتے ہیں۔

۱۔ سیّد شاہ برکت اللہ پیمی بلگرامی

آپ کا لقب صاحب البرکات بن سید اویس بن میر عبد الجلیل بن میر عبد الواحد بلگرامی۔ کلام فارسی میں عشقی اور ہندی میں پیمی تخلص کرتے تھے۔ آپ کا شمار اکابر اولیائے کرام میں ہے۔ دیوانِ فارسی و مجموعۂ اشعارِ ہندی موسوم بہ "پیم پرکاش" اب تک موجود ہے۔ قدیم وطن آپ کا بلگرام تھا۔ حضرت سید عبد الجلیل صاحب آپ کے جدّ امجد کا مزار پہلے سے مارہرہ ضلع ایٹہ میں واقع تھا۔ آپ نے بھی وہیں توطن اختیار فرمایا۔ ۲۶ر جمادی الثانی سنہ ۱۰۷۰ھ کو پیدا ہوئے اور ۱۰ محرم سنہ ۱۱۴۲ھ کو وصال ہوا آپ کی درگاہ بمقام مارہرہ ضلع ایٹہ زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔

(قاموس المشاہیر، جلد اول۔ صفحہ ۱۲۶)

نمونہ کلام

دوہا:۔ چکھ جوگی کنٹھا گرین اُرن سیام اُو سیت
آنسو بوند سُمرن لین درسن بھچھا ہیت

مطلب:۔ چکھ بمعنی چشم جوگی بمعنی [illegible]

شاعر کہتا ہے کہ جوگی کی آنکھیں سُرخ سیاہ اور سفید دانوں کا کنٹھا اپنے گلے میں پہنے ہوئے اور قطراتِ اشک کی تسبیح لئے ہوئے خیراتِ دیدار کی خواستگار ہیں

دوہا: ہیمی ہندو تُرک میں ہر رنگ رہو سمائے
دیول اور مسیت مُوں دیپ ایک ہی بھائے

مطلب :- دیول یعنی مندر ۔ مطلب یہ ہے کہ اے ہیمی ہندو اور مسلمان دونوں میں خُدا کا جلوہ موجود ہے جیسے کہ چراغ کی روشنی مندر یا مسجد دونوں جگہ یکساں ہے ۔

دوہا آنٹیا تن کی اٹیٹی من پٹوا بھیئو مور
سُور چھاوے کر گیان سوں نہی پریم کی ڈور

مطلب :- آنٹیا یعنی ٹوپی ۔ اٹیٹی یعنی اُلجھا ہُوا ۔ مطلب یہ ہے کہ جسم کی ٹوپی اُلجھی ہوئی ہے ۔ اس کو سُلجھانے کے لیے میرا دل ہر وقت مصروف نظر آتا ہے ۔ اُسے دستِ معرفت سے سُلجھاتا ہے اور محبت کی ڈور بناتا ہے ۔

دوہا من پنچھی ، تن پنجرا پانپ بھرو امول
پیارو نپور وکر دیو تو ہیں ، تو ہیں بول

مطلب :- اے دِل کے پرندے جسم کے اس بیش قیمت اور خوبی سے بھرپور پنجرے میں تیرے پیارے یعنی خُدا نے آسائش کے تمام سامان مُہیا کر دیے ہیں ۔ اس لئے تو بھی سچے دل سے خدا کی ثنا کرتا ہوا ، تُو ہی ، تُو ہی کی رٹ لگاتا رہ ۔

دوہا تُو نہیں ، تُو نہیں جو چھوٹے ہو نہیں ہو نہیں ہوئے
جھار بچھاوے کامری رہی اکیلا سوئے

مطلب :- جس وقت اَنْتَ الْحَقُّ کے مرتبہ سے گزر کر انا الحق کا مرتبہ حاصل ہو اُس وقت کمبل جھٹک کر بچھاوے اور تنہا سو رہے ۔ یعنی فنا فی اللہ ہو جاوے ۔

دوہا نئی اپیت یا پیت کی پھیلیں سب سکھ دیہہ
پا چھیں دکھ کے جیل میں ڈار گری تن کیہہ

مطلب صاف ہے

۲ - میر عبد الجلیل بلگرامی تو اللہ ضریحہ

وطن بلگرام (اودھ) آپ ایک جلیل القدر عالم اور فصیح شاعر تھے۔ آپ کا تخلص واسطی تھا۔ ۱۶۹۹ء مطابق ۱۱۱۱ھ میں بیجاپور کے مقام پر شاہنشاہ اورنگزیب کی حضوری میں مرزا علی بیگ نے جو شاہی اخبار نویس تھے آپ کو پیش کیا اور آپ کو جاگیر اور منصب عطا ہوا، اور عہدہ بخشی اور گجرات کی اخبار نویسی پر مقرر ہوئے۔ اور وہاں سے بھکر (سندھ) کو تبدیل کیے گئے۔ ۱۷۱۴ء مطابق ۱۱۲۶ھ میں عہد فرخ سیر چند سازشوں کی وجہ سے علیحدہ کیے گئے۔

(قاموس المشاہیر۔ جلد دوم صفحہ ۵۶)

مولانا میر غلام علی آزاد بلگرامی آپ کی نسبت یوں رقم طراز ہیں :-

"مصرد اکرین مصرہر بنس کہ از براہمۂ معتبر بلگرام است و در قنون سنسکرت وبھاکا مسلم خاص وعام وعلاقہ مرحوم ورا بہ ملازمت امیر الامرا سید حسین علی خاں رسانید و در سلک ندما و نواب منسلک گردانید۔ دوہئہ در مرثیہ آں جناب نظم کردہ و بیان واقع بہ عالم اظہار آوردہ کہ

ہوا تھے او ہوے گا ایسو کینن سو سیل

جیسو احمد نند جگ ہوی گیو میر جلیل

مطلب : نند شاعر کہتا ہے کہ میر عبد الجلیل سا نیک اور صاحب مروت دنیا میں دوسرا ہوا ہے نہ ہوگا۔

از غرائب اتفاقات آں کہ چوں ایں دوہہ را عدو کردہ شد بے زیادت ونقصان تاریخ بر آمد رحلت آں جناب بیست وسوم ربیع الآخر سن ثمان وثلثین ومائۃ والف (۱۱۳۸ھ) واقع شد"

(مآثر الکرام صفحہ ۲۷۰)

مولانا آزاد بلگرامی میر عبد الجلیل کی تولد و وفات کے سال کی نسبت یوں فرماتے ہیں :-

"ولادتِ باسعادت سیزدہم شوال سنہ احدیٰ و سبعین و الف (۱۱۷۱ھ) است و انتقال شبِ شنبہ بیست و سوم شہر ربیع الآخر سنہ ثمان و ثلثین و مأتہ و الف (۱۲۳۸ھ) در شاہجہاں آباد واقع شد نعشِ مبارک حسب الوصیۃ بدار السلام بلگرام نقل کردہ۔ و ترجمہ اول وقتِ عصر ششم جمادی الاول سال مذکور در قدم والد بزرگوار ایشاں سیّد احمد مرحوم دفن ساختند۔

(ماثر الکرام صفحہ ۲۵۴)

نمونہ کلام از انگ درپن

الہ نام پوتھی پر لکھی اینتھ بھائی
جیون جڑائی کوٹیکو بہال سہائی

مطلب:۔ آغازِ کتاب میں اللہ کا نام ایسا زیب دیتا ہے کہ جس طرح سونے کا مرصع (جڑاؤ) ٹیکہ پیشانی پر خوشنما معلوم ہوتا ہے۔

کیس پاس کی پھانس پھانسو لوگ
ایک سیام تم اوبری الک سنجوگ۔

مطلب:۔ کیس بمعنی زلفیں۔ پاس بمعنی کمند۔
شاعر کہتا ہے کہ کمندِ زلف نے تمام مخلوق کو اسیر کیا مگر اے سیام ایک تم بچے ہو کیوں کہ تمہارا دیکھنا ممکن نہیں۔

دوہا

پھلواری گھونگھٹ کی پائیں جات
سمن باس بن چھانیں نہیں سہات

مطلب: شاعر کہتا ہے کہ محبوب چمن کی سیر کے لئے نقاب ڈال کر اس لئے جاتا ہے کہ پھولوں کی خوشبو چھانے بغیر پر لطف نہیں ہوتی۔

دوہا

پھلواری جل نین سے سینچت لئی لئی باس
سوکھی رو کھ پلاس گوات بسنت کی آس

مطلب :۔ ہجور محبوبہ اپنے وجود کو پژمردہ اور خشک دیکھ کر اُسے اپنے اشکوں سے سیراب کرتی ہے، اور کیوں نہ کرے کہ پلاس کے سوکھے ہوئے درخت کو فصلِ بہار کی اُمید ہوتی ہے۔

دوہا ؎
رہتی سیجنی ہیں بہ سنگ پاؤن روپ بھات
اب پریتم بچھرِ ی بھئی پاؤن پک کی بھانت

مطلب : نائکا کا شوہر سفر کو جانے والا ہے اس لئے وہ اپنی مصاحبہ سے کہتی ہے کہ اے سہیلی یہ رات جو نہایت پاک صورت ہے شوہر کے وصال میں گزر رہی ہے۔ شوہر کے چلے جانے پر میری حالت شوہر کی جدائی میں پپیہا کی طرح ہو جائے گی جو رات بھر جاگ کر پیو کہاں پیو کہاں پکارتا ہے۔

دوہا ؎
پیاری تیری چرن کی کہوں کہاں لو بھید
چھن بچھرت جا کی پری جھاواں چھاتی چھید

مطلب :۔ اے پیاری تیرے قدموں کے بھید کہاں تک بیان کروں، یعنی کہاں تک تعریف کروں کیوں کہ ایک لمحہ بھر کی جدائی میں جھاواں جو غیر ذی روح ہے، کا سینہ چھلنی ہو گیا ہے۔

۳۔ سید غلام نبی۔ رس لین بلگرامی

سید غلام نبی نام۔ رس لین تخلص۔ وطن بلگرام۔ تاریخ ولادت میں بہت اختلاف ہے۔ بعض نے ۱۶۸۹ء اور بعض نے ۱۶۹۹ء بتائی ہے۔

آپ میر جلیل بلگرامی کے بھانجے اور میر باقر کے صاحب زادے تھے۔ جناب مقبول احمد صمدانی اپنی کتاب "حیاتِ جلیل" یعنی "تذکرہ علامہ میر عبد الجلیل بلگرامی" میں رس لین کی نسبت لکھتے ہیں :۔

"میر غلام نبی میر صاحب (عبد الجلیل بلگرامی) کے خواہر زادے بلگرام میں ۲، محرم ۱۱۱۱ھ مطابق ۱۶۹۹ء کو تولد ہوئے۔ میر صاحب

کو خبر پہنچی تو تاریخ نکالنے کی فکر ہوئی۔ اسی خیال میں سو گئے، عالم رویا میں
بچہ کی صورت نظر آئی، جو کہہ رہا تھا " نورِ چشم باقر عبد الحمیدم " بیدار
ہونے پر اعداد کا شمار کیا پوری تاریخ تھی۔ میر صاحب نے یہ پیشین گوئی
کی کہ مولودِ مسعود شاعر ہوگا۔ اور یہ پیشین گوئی پوری ہوئی "
حضرت آزاد بلگرامی مصنف مآثر الکلام نے بھی ان کی تاریخ ولادت ۱۱۱۱ھ لکھی اور اسی کو ترجیح ہے۔
رس لین عربی فارسی میں بھی شعر کہتے تھے اور نبی تخلص فرماتے تھے۔ شعر و ادب
کے علاوہ موسیقی سے بھی لگاؤ تھا۔ زمانے کے دستور کے مطابق عربی، فارسی کی تعلیم
گھر ہی پر حاصل کی اور اس میں دست گاہِ کامل بہم پہنچانے کے بعد سنسکرت، ہندی اور
برج بھاشا میں کمال حاصل کیا۔ تذکرے شاہد ہیں کہ مرزا جانِ جاناں مظہر ہندی شاعری
میں ان کے شاگرد تھے۔ ہندی شاعری میں دوہا ایک مشہور صنف سخن ہے۔ کہتے ہیں
بہاری لال چوبے اس صنفِ سخن کا ماہر گزرا ہے کوئی شاعر اس میدان میں اس کی ہم سری نہ کر سکا مگر ایک
رس لین ہیں کہ جن کے دوہے اتنے اونچے اور بلند آہنگ ہیں کہ ان پر بہاری لال کا شبہ ہونے لگتا ہے۔
رس لین نے برج بھاشا میں دو قابلِ قدر تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔

۱۔ " انگ درپن " (سراپا)، جس میں جسم محبوب کے سارے اعضا کا تشبیہی بیان
کیا گیا اور معشوق کا سراپا لفظی صنعت گری کے ساتھ کھینچا گیا ہے۔ یہ کتاب
۱۱۴۷ھ میں لکھی گئی تھی۔ اس میں ۱۷۷ دوہے ہیں۔ رس لین کی تصانیف
میں یہ کتاب سب سے زیادہ مقبول ہے۔

۲۔ دوسری تصنیف " رس پربودھ " ہے، جو ۱۱۵۴ھ میں تصنیف ہوئی۔ یہ کتاب
رس۔ بھاؤ۔ نائیکا بھید۔ چھ موسم اور بارہ ماسہ پر ایک منظوم شاہ کار
ہے۔ اس میں ۱۱۵۵ دوہے ہیں۔ یہ کتاب بلحاظ فن اتنی اہم ہے کہ ہر ناقد
فن نے اس کی تعریف ہے۔

رس لین کا عام اندازِ سخن سیدھا سادہ اور سہل ہوتا ہے۔ ان کے اشعار سمجھنے
کے لئے ذہن پر زور نہیں دینا پڑتا، جو کچھ کہتے ہیں پورے طور پر محسوس کر کے

بے ساختہ طریقے سے کہتے ہیں۔ زبان پر اتنی قدرت ہے کہ مشکل سے مشکل مضمون کو بھی بڑے سہل انداز میں ادا کر جاتے ہیں۔ تشبیہات اور استعارات کے بادشاہ ہیں اور سراپا نگاری میں ماہر۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

دوہا ہے

مکت بھئے گھر کھوئے کے کان بیٹھے جائے

گھر کھووت ہیں آور کے کیجئے کون آپائے

مطلب: موتیوں نے اپنا گھر چھوڑ کر کانوں میں اپنا مقام بنا لیا ہے۔ اب وہ محبوبہ کے حسن کو چمکا کر دوسروں کا گھر برباد کر رہے ہیں، اس کا کیا علاج ہے۔

دوہا ہے

مکھ سسی تر کھی چکور ار ونن پانیپ لکھی ہیں

پدپنج و بھت برجونت نین رس لین

مطلب:۔ اُس کے چاند جیسے مکھڑے کو دیکھ کر چکور حیران ہے اور اُس کے پانی جیسے شفاف جسم پر مچھلی قربان ہوتی ہے۔ اور اے رس لین میری آنکھوں کا یہ حال ہے کہ اُس کے کنول جیسے پاؤں کو ٹکٹکی لگا کر دیکھ رہی ہیں گویا بھنورے کی طرح اُس کے چاروں طرف پھرتی ہیں اور وہاں سے ہٹنے کا نام نہیں لیتیں۔

دوہا ہے

کت دکھائے کامنی دی کو بنج باںھ

تھرتھرات سی تن پرے پھر پھرات گھن ماںھ

مطلب :۔ محبوبہ نے اپنی بانہہ کھول کر بجلی کو کیوں دکھائی کہ اُس کو بادل میں چین نہیں ملتا اور وہ تڑپتی پھر رہی ہے۔

دوہا ہے

پی موٗ نی میری سدا راکھت درگن بسائے

ڈرپتی گوری دیہہ یہ مت کاری ہو جائے

مطلب ہے درگن بمعنی آنکھ۔ ایک دوشیزہ اپنی سہیلی سے کہتی ہے۔ سکھی ری میرا پی مجھے ہمیشہ اپنی آنکھوں میں بسائے رکھتا ہے، ڈرتی ہوں کہ کہیں میرا رنگ ہی کالا نہ ہو جائے۔

دوہا ہے

ہوں نہ سہوں گی بات آلی تو سوں کہوں نینگ

میری مکھ کو چند کہی لاوت لال کلنک

مطلب :- الی، بمعنی سکھی۔ لال سے مراد، محبوب۔ شاعر کہتا ہے کہ ایک دوشیزہ اپنی سکھی سے اپنے محبوب کی شکایت کرتی ہوئی کہتی ہے کہ اے سکھی میں اپنے محبوب کی باتوں کو کبھی برداشت نہیں کرسکتی، میرے چہرے کو چاند سے تشبیہہ دیتا ہے، جو داغ دار ہے۔

دوہا ۵ — مکرت چند یہ تی دیوس ٹھی ماس ماس کرگھیائے
تو ؤ مکھ مدھرائی لکھے پھیکو پر گھٹی جائے

مطلب :- چاند جو ہر مہینہ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ اے میرے محبوب تم جانتے ہو کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ بات دراصل یہ ہے کہ جب وہ اول اول نکلتا ہے تو اپنے غرورِ حسن میں بڑھتا ہی جاتا ہے۔ پھر ایک بار جب تمہارے چہرے پر نظر پڑ جاتی ہے تو مارے شرم کے پھیکا پڑ جاتا ہے اور گھٹنا شروع ہو جاتا ہے۔

۴۔ مرزا جان جاناں مظہر

شمس الدین نام۔ جان جاناں عرف مظہر تخلص۔ والد کا نام مرزا جان تھا۔ مظہر صوفی باصفا اور شاعرِ یکتا تھے۔ کلام میں جس قدر متانت اور تاثیر ہے، اسی قدر توحید اور روحانیت بھی جلوہ گر ہے۔ مسٹر بیل اور فرانسیسی محقق گارسن ڈیٹاسی کی تحریر کے مطابق بمقام آگرہ ۱۱۱۰ھ مطابق ۱۶۹۸ء۔ مگر مولانا آزاد مصنف سروِ آزاد کی تحقیق کے مطابق ۱۱۱۲ھ میں بمقام کالا باغ۔ صوبہ مالوہ میں پیدا ہوئے۔ آپ اردو، فارسی اور ہندی تینوں زبانوں میں باکمال شاعر تھے۔ اردو اور فارسی کے دیوان ملتے ہیں، اور ایک فارسی بیاض خریطۂ جواہر کے نام سے آپ کی یادگار ہے۔ لیکن افسوس کہ ہندی کلام دستیاب نہیں ہوسکا۔

سروِ آزاد (مآثر الکرام) میں مولانا آزاد نے دو جگہ یہ بات ظاہر کی ہے کہ مظہر ہندی شاعری میں مولانا غلام نبی رس لین کے شاگرد تھے۔ ملاحظہ ہو، مآثر الکرام صفحہ ۳۷۲۔

"میرزا جانجاناں مظہر دہلوی سلمہٗ اللہ تعالیٰ فنِ شعرِ ہندی
از میر غلام نبی اخذ نمود۔"

اور یہی عبارت اسی تذکرے کے صفحہ ۳۱۳ پر مندرج ہے جو اس امر کا روشن ثبوت ہے کہ مرزا مظہر اردو فارسی کے ساتھ ساتھ ہندی کے بھی شاعر تھے۔ ۱۱۹۴ھ ہجری مطابق ۱۷۸۱ء میں وفات پائی۔

۵۔ دیوان سید رحمت اللہ بلگرامی

دیوان سید رحمت اللہ بن سید خیر اللہ بن دیوان سید بھیکن سید محمد صغریٰ کی اولاد سے تھے۔ بلگرام وطن تھا۔ رحمت صاحب کے دادا جان دیوان سید بھیکہ سخاوت و شجاعت اور مروت و نیک طینتی میں شہرۂ روزگار، نیز صوری و معنوی خوبیوں سے مزین تھے۔ نواب احتشام خاں و نواب محتشم خاں عالم گیری و نواب مرتضیٰ خاں والاشاہی عالمگیری کی سرکار میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ سید خیر اللہ قباد خاں عالم گیری کی سرکار میں ملازم تھے۔ ان کا انتقال ہو گیا تو سید رحمت اللہ نے اپنے جدِ امجد سید بھیکہ کی خدمت میں تربیت پائی۔ جب سید بھیکہ بوڑھے ہو گئے تو سید رحمت اللہ نے سب کاروبار سنبھال لیا اور عبد الصمد خاں روشانی کی سرکار میں اعلیٰ عہدہ اور جاگیر پائی۔ آخر بمقام سلیم پور ۱۳ ربیع الآخر ۱۱۱۸ھ میں وفات پائی۔ اُن کی نعش کو بلگرام میں لا کر دفنایا گیا۔

مولانا آزاد بلگرامی لکھتے ہیں کہ:-

"سید رحمت اللہ در ہندی اُستادِ عصر بود۔ علامہ مرحوم میر عبد الجلیل بلگرامی تعریفِ خوش فہمی او بسیار می کرد۔" (سرو آزاد صفحہ ۳۶۴)

ان کے کلام میں تشبیہات و استعارات نہایت پُر لطف اور دل نشیں ہیں۔

ہندی کے اصناف سخن میں دوہے کو خاص مقبولیت حاصل ہے۔ رحمت نے اس صنف پر خوب طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے دوہے بہت مقبول اور پسندیدہ ہیں۔ ان کا ہندی دیوان "پورن رس" کے نام سے ان کی یادگار ہے۔ نمونۂ کلام

ملاحظہ ہو ۔

کاری گھنکاری گری گہری سرس سکمار
لوٹن ہاری جگت کی لوٹن ہارے بار

مطلب :۔ گھنکاری بمعنی دراز ۔ گری بمعنی زیادہ ۔ سرس بمعنی خوبصورت ۔ سکمار بمعنی نازک ۔ بار بمعنی بال ۔ شاعر کہتا ہے، اے نازنین تیرے سیاہ ۔ دراز ۔ خوبصورت ۔ نازک ترین اور غلطیدہ بال خلق خدا کو تاراج کرنے والے ہیں ۔

دوہا

سوہت بینی پیٹھ پر جھینی پٹ کی بہائی
لوٹت ناگن کنول دل انگ پراگ لگائی

مطلب :۔ بینی بمعنی چوٹی ۔ جھینی بمعنی باریک ۔ کنول دل بمعنی برگِ گل نیلوفر ۔
شاعر کہتا ہے کہ اے محبوبہ تیری چوٹی پشت پر دراز پڑی ہوئی باریک دوپٹہ کے اندر ایسی خوشنما ہے کہ گویا ناگن اپنے جسم میں خاکِ گل مَل کر سرخ رنگ کے گل نیلوفر کی پتّیوں پر لوٹتی ہے ۔

دوہا

کر اُچائے جمہائی تیہ دھاری بہج بہہ بھائی
منو چپلا دوئی چمک ہوئی گری بھوم پر آئی

مطلب :۔ اُچائے بمعنی بلند کرے ۔ بہہ بھائی بمعنی اس طرح سے ۔ چپلا بمعنی بجلی ۔ بہج بمعنی بازو ۔
شاعر کہتا ہے کہ اے نازنین تُو نے انگڑائی لیتے ہوئے جو اپنے دونوں بازو اونچے کر کے یکایک نیچے کئے تو ایسا معلوم ہوا کہ گویا دو بجلیاں چمک کر زمین پر گریں ۔
(طورِ کلیم صفحہ ۱۶ ۔ ۱۷)

دوہا

مانگ سُہاگ بھری اُبی بپ پانی چھب جاتے
سیام منو گھن سیام میں چپلا اک لیک لکھائے

مطلب :- الی بمعنی سہیلی - بب بمعنی دونوں - سیام مراد خوبصورت، گھن سیام بمعنی ابرِ سیاہ۔
چپلا بمعنی بجلی - لیک بمعنی لکیر - اے سکھی دونوں پٹے (موئے سیاہ) کے درمیان میں
مانگ کہ جس میں ابرق گلال بھرا ہوا ہے، ایسی خوشنما معلوم ہوتی ہے کہ گویا ابرِ سیاہ میں
بجلی چمکتی ہے۔

دوہا

آن بان کو کہت ہیں نین بان سمان

دی لاگت سالت جو یہہ دیکھت بیدھت پران

مطلب :- آن بمعنی اور سب - بان بمعنی تیر - نین بان بمعنی تیرِ نظر - سمان برابر - سالت بمعنی
سوراخ کرنے والا - بیدھت بمعنی زخمی کرتا ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ اور سب کہتے ہیں کہ تیرِ نظر تیر کے برابر ہے۔ یہ بات درست نہیں، کیوں کہ
تیر جب دل پر لگتا ہے تب سوراخ کرتا ہے اور تیرِ نظر صرف دیکھنے ہی سے جگر اور دل
میں سوراخ کر دیتا ہے۔

۶ - سید محمد عارف بلگرامی

سید محمد عارف نام - محمد رکن الدین بلگرامی کی والدہ سے ہیں - بلگرام
وطن - ۹ ماہ ذی القعد - بروز جمعہ ۱۱۲۲ھ میں تولد ہوئے۔ عنفوان شباب ہی سے
شعر و سخن کی طرف مائل ہوئے۔ فارسی اور ہندی سخن وری میں کمال حاصل کیا
ان کے خیالات و مضامین نہایت دل کش ہیں۔ سراپا نگاری میں ماہر تھے۔

نمونہ کلام از سکھ نکھ - دوہا پنگلا چرن

بال بال کی بال کو بیوری بھید بنائے

سکھ نکھ تین بالن ہیں کنگھی لوں نہ سہائے

مطلب :- بیوری بمعنی جدا کرنا - سکھ نکھ بمعنی سراپا - شاعر کہتا ہے کہ اے سکھی اس ناز نین
کے موئے سر کو جو تو جدا کرتی ہے واقفِ راز نہیں ہو سکتی - جب تک کہ کنگھی کی طرح ہر

بال کے سینہ میں نہ گھس جائے۔ مُدعا یہ کہ جب تک شاعر محبتِ عورات میں دِل باختہ نہ ہو جائے، بیان سراپا ناممکن ہے۔

بینی برنن دوہا

سَمُدر ہیو ہتھ مین مَن لئی جگ کرت انیت

بینی تیری سیس تادہ کرتیا کو بینی ریت

مطلب :۔ سَمُدر بمعنی دریا۔ ہیو بمعنی دل۔ ہتھ بمعنی بلوکر۔ مین مَن بمعنی دل کی مچھلی۔ انیت بمعنی ظلم بینی بمعنی چوٹی۔ کو بینی بمعنی خلاف۔

شاعر کہتا ہے کہ سینے کے دریا سے دل کی مچھلی کو پکڑ کر دُنیا میں ظلم کرتی ہے۔ یہ تیرے سر کی چوٹی نے کیا نیا طریق اختیار کیا ہے۔

مانگ برنن۔ دوہا

لال بیندِلی جُت اَنگ لکھ آوت اُپمان

پھَن ست اَنک مینک کی مَن دھوکھیں لپٹان

مطلب = بیندلی بمعنی قشقہ مدوّر یا بندی۔ جت کے بمعنی ساتھ۔ لکھ بمعنی دیکھ۔ اپمان بمعنی مثال نہیں۔ ست انک بمعنی صد۔ مینک بمعنی مارِ سیاہ۔ من بمعنی مہرۂ مار۔ دھوکیں بمعنی شک۔ شاعر کہتا ہے کہ اے نازنین تیری پیشانی پر قشقہ مدوّر یعنی بندی لگی ہوئی ہے اور چہرہ کے گرد زلف آویزاں ہے، اس کی مثال اس کے سوا اور کوئی خیال میں نہیں آتی کہ کالے سانپوں کے سینکڑوں پھن لپٹے ہوئے ہیں۔

نیتر برنن۔ دوہا

بِس بھلیت اَنکی لکھت مَن پاوت نہیں چین

کن پہ کاشں رچ گن کریں برچھک راس تو نین

مطلب = بس بمعنی زہر۔ کن بمعنی کیوں نہ۔ رچ گن کریں بمعنی اپنی تعریف کریں تو نین یعنی تیری آنکھیں۔ مطلب یہ کہ اے محبوبہ تیری آنکھیں دیکھنے سے زہر سرایت کرتا ہے، اور دل کا چین جاتا ہے۔ تیری چشم کا طالع برج عقرب (برچھک راس) ہے۔ پھر کیوں نہ

اپنا ہنر ظاہر کریں۔

مُکھ باس برنن - دوہا

ڈگر ڈگر تئو بگر کی گُنجت مُدھکر پُنج
کیتو تو مُکھ باس نی بھون گنج بن گنج

مطلب : ڈگر بمعنی راہ۔ بگر بمعنی گھر۔ گنجت بمعنی خوش آواز۔ مدھکر بمعنی زنبورِ سیاہ۔
پُنج بمعنی جوق جوق بھون گنج بمعنی خانہ باغ۔ بن گُنج بمعنی چمنستان۔
مطلب یہ ہے کہ تیرے گھر کی راہوں پر جوق جوق زنبورِ سیاہ گونج رہے ہیں۔
اے گلشنِ خوبی، تیری خوشبوئے دہن نے تیرے گھر کو باغ و چمنستان بنا دیا ہے۔

باہُہہ برنن - دوہا

پاس تُلت تو باہُہہ کی پیت آجگت ہیت
جیو لیت بادھ کر پرین یہ جیتم جیہ دیت

مطلب : پاس بمعنی پھانسی - شاعر کہتا ہے اے محبوبہ پھانسی کی مانند تیرے حلقۂ ہر
دو بازو کا بیان کرنا سخنِ ناموزوں ہے۔ کیوں کہ وہ پھانسی جان لیتی ہے اور یہ پھانسی
حلقۂ آغوش کے طالب کو جان دیتی ہے۔

۷ - رحمٰن

نام عبدالرحمٰن۔ تخلص رحمٰن۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر کے بیٹے شہزادہ
محمد معظم کے منصب دار تھے، اور ہندی زبان میں بڑی قابلیت رکھتے تھے۔ ان کے
ہندی کلام میں دوہے زیادہ ہیں اور بہت مشہور ہیں۔ ان کی ایک کتاب ویرک شتک
بہت مشہور ہے جس میں ۱۰۷ دوہے ہیں۔ نمونۂ کلام۔

دوہا

کھیرا کو منہ کاٹ کے ملیت لون لگائے
رحمٰن کڑوے مُکھن کو چہیئے یہی سزائے

بدزبان اور تلخ مزاج انسان کے لئے کتنا عبرت خیز دوہا ہے۔

بگڑی بات بنے نہیں لاکھ کرے کہیں کوئے
رحمن بگڑے دودھ کو متھے نہ ماکھن ہوئے

بگڑی بات اور بگڑے دودھ کی باہم تشبیہہ کس لاجواب ہے۔

کھیر، خون، کھانسی، کھسی، پریت، مدھ پان
رحمن دابے نہ دبیں جانے سکل جہان

کتنی سچی بات شاعر نے کہی ہے، واقعی یہ چھ چیزیں چھپائے سے نہیں چھپ سکتیں۔

ذیل کے دوہے میں تکرار الفاظ کا لطف اٹھائیے، اور داد دیجیے ؎

کر کی کر کی چوریاں۔ بر کی بر کی ریت
در در کی کنچوکی، ہر کی ہر کی پریت

مطلب: یعنی ہاتھ ہاتھ کی چوڑیاں شوہر شوہر کے طور طریقے۔ در در کی خادمہ، ان میں ہر ایک کی محبت جداگانہ ہوتی ہے۔

رحمن کا سارا کلام اسی قسم کے پسندیدہ اخلاق آموز اور دلچسپ مضامین سے مملو ہے۔

۸۔ قاسم شاہ

یہ دریاآباد ضلع بارہ بنکی (یو۔پی) کے رہنے والے تھے، بکرم سمت ۱۷۸۸ کے قریب موجود تھے۔ انھوں نے ہنس جواہر نام کی کہانی ہندی نظم میں لکھی ہے جس میں راجہ ہنس اور رانی جواہر کی کتھا ہے۔ یہ کتاب نامی پریس لکھنؤ سے فارسی حروف میں شائع ہوئی۔ شاعر نے اس کتاب میں شاہ وقت کی نسبت یوں کہا ہے ؎

محمد شاہ دلّی سلطانو۔ کا من گن اوہی کیر بکھانو

چھاجے پاٹ چھتر سر تا جو — ناؤ ہیں سیس جگت کے راجو
رُوپ ونت درسن منہ راتا — بھاگونت اوہی کینہہ ودھاتا
درب ونت دھرم مہنگ اُپرا — گیان ونت کھرڈگ مہنگ سوا

شاعر نے اپنی واقفیت اس طرح دی ہے ؎

دریاآباد مانجھ مم ٹھاؤں — امان اللہ پتا کمرناؤں
تہواں موہی جسم بدھی وِنیاں — قاسم ناؤں جاتی کرہنیاں
تے ہوں بیچ بدھی گیشھ گمیناں — اوہی سبھا بیٹھے چیت وِنیاں
اُونچے سنگ، اونچے من بھاوا — تب بھا اونچے گیان بدھی پاوا
اُونچا پنتھ پریم کا ہوئی — تیہی مہنگ اونچے بیٹھے سب کوئی

کتھا کا خلاصہ شاعر نے یوں بیان کیا ہے ؎

کتھا جو ایک گپت مہنگ رہا — سو پرگٹ اُودھار ہی میں کہا
ہنس جواھر بدھی اوتارا — نرمل رُوپ سو دیئی سنوارا
بلخ نگر بُرھان سلطانُو — تے ہی گھر ہنس بھئے جس بھانُو
عالم شاہ چین نیپتی بھاری — تے ہی گھر جنمی جواہر پیاری
تے ہی کارن وہ بھیو دیوگی — گیئو سو چھانڈ دیس ہوئی جوگی
انت جواھر ہنس گھر آئی — سو جگ مہنگ یہ گیئو بکھانی
سو سُنی گیان کتھا میں کینہا — لکھیئوں سو پریم رہے جگ چینہا

(ہندی ساہتیہ کا اتہاس' از پنڈت رام چندر شکل صفحہ ۱۱۱/۱۱)

۹ - نور محمد

یہ دہلی کے بادشاہ محمد شاہ کے عہد میں ہوئے ہیں۔ بمقام "سبرحد" ضلع جون پور (جو جون پور اور اعظم گڑھ کی سرحد پر واقع ہے) میں پیدا ہوئے۔ شادی کے بعد یہ اپنے آبائی گاؤں سے اپنے سسرال موضع بھادوں "ضلع اعظم گڑھ

چلے گئے۔ ان کے خسر شمس الدین کے کوئی اولادِ نرینہ نہ تھی۔ اس لئے نور محمد وہیں رہنے لگے۔ نور محمد کے بھائی محمد شاہ، موضع "سرحد" ہی میں رہے۔ نور محمد کے یہاں دو لڑکے پیدا ہوئے جن کے نام تھے غلام حسین اور نصیر الدین۔ نصیر الدین کی اولاد سے شیخ فدا حسین تقسیم وطن (۱۹۴۷ء) تک بقید حیات تھے۔ بعد میں کچھ پتہ نہیں چلا۔ اُس وقت اُن کی عمر اسّی (۸۰) برس کی تھی۔ نور محمد فارسی کے اچھے عالم تھے، اور ہندی شاعری میں بھی دوسرے صوفی شعرا سے پیش پیش تھے۔ انھوں نے ہندی میں ۱۱۵۷ھ مطابق سمت ۱۸۰۱ بکرم میں "اندراوتی" نام کی ایک نہایت اچھی اور کامیاب مثنوی لکھی۔ جس میں کالنجر کے راجکمار (راج کنور) اور آگم پور کی راجکماری (اندراوتی) کی پریم کہانی بیان کی۔ اُس مثنوی کے آغاز میں دستورِ زمانہ کے مطابق محمد شاہ بادشاہ کی اُس وقت یوں تعریف کی ہے ؎

کروں محمد ساہ بکھانو	ہے سورج دہلی سلطانو
دھرم پنتھ جگ بیچ چلاوا	نبر نہ سبرے سوں دکھ پاوا
جیتے سلاطین جگ کیرے	آئی سہاس بنے ہیں چیرے
سب کا ہو پر دایا دھرئی	دھرم سہت سلطانی کرئی

شاعر نے اپنی کہانی کی تمہید یوں ارشاد فرمائی ہے ؎

مَن دِرِگ سوں اک اُن مجھارا	سُوجھی پرا موہیں سب سنسارا
دیکھ اُوں ایک انیک پھلواری	دیکھ اُوں تہاں پُرش اُو ناری
دُو دُو مکھ سو بھا برنی نہ جائی	چند سورج اُترے بھوئیں آئی
تپی ایک دیکھ اُوں تے ہی ٹھاؤں	پُوچھ پچھیوں تا سوں تنہہ کر ناؤں
کہا آہنے راجا اور رانی	اندراوتی اَو کنور گیانی

آگم پور اندراوتی کنور کلنجر رائے
پریم ہُنتے دُو ونہہ کہہ دینھا الکھ ملائے

اس کے ہندی کلام کی ایک اور کتاب "انوراگ بانسری" ہے۔ اس کی

تصنیف کا زمانہ ۱۱۷۸ھ مطابق سمت ۱۸۲۱ بکرم ہے۔ یہ کتاب حقائق و معارف کے رموز پر حاوی ہے۔ اس کتاب میں چوپائیوں کے ساتھ دوہے رکھنے کی بجائے بروے چھند رکھے ہیں۔ مثلاً ؎

نگر اِک مُورتی پُرا ناؤں　　　　راجہ جیو آہے تے ہی ٹھاؤں
کا وانوں وہ نگر سہاؤن　　　　نگر سہاؤن سب مَن بھاؤن
اِہے سَریر سُہا دن مُورتی پُور
اِہے جیو راجہ جوجا ہُو نہ دُور

(ہندی ساہتیہ کا اتہاس از رام چندر شکل صفحہ ۱۱۱-۱۱۲)

۱۰- البیلی علی

یہ وشنو سوامی مت کے مہاتما "ونشی علی" کے چیلے (شاگرد) تھے۔ اس کے علاوہ ان کا اور کوئی حال معلوم نہیں ہوسکا۔ ان کا سالِ تصنیف یا زمانہ شاعری بکرم کی اٹھارویں صدی کا آخری حصہ مانا جاتا ہے۔ یہ ہندی بھاشا کے مشہور اور بلند پایہ شاعر ہونے کے علاوہ سنسکرت کے بھی شاعر اور ادیب تھے جس کا ثبوت ان کی سنسکرت تصنیف ہے "شری ستوتر" ہے۔ انھوں نے "سمے پربندھ پداولی" نام کی ایک کتاب ہندی نظم میں لکھی ہے۔ جس میں ۳۱۳ پد نہایت درد انگیز اور پاک محبت کے جذبات سے لبریز ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:

لال تیرے لوبھی لولُپ نین
کیہی رَس چھکنی چھکے ہو چھبیلے مانت ناہن چین
نیند نین گھُوری گھُوری آوتِ اُتی گھُوری رہی چھونین
البیلی علی رَس کے رسیا کت بترت یہ نین
لال تیرے لوبھی لولُپ نین

بنے نَوَل پریہ پیاری
سَر دَرین اُجیاری
سَر وَرین مُکھ وَین مین مَے جَمُنا تیر سُہایو
سکل کلا پُورن سَسی سیتل مہی منڈل پَر آیو
اَتی سے سَرس سُگندھ مند گتی بہت پَون اُچی کاری
نَو نَو رُوپ نَوَل نو جو بن بنے نَوَل پریہ پیاری

(ہندی ساہتیہ کا اتہاس' از شکل صفحہ ۳۵۴-۳۵۵)

۱۱۔ ہاشم شاہ

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہدِ حکومت میں عربی۔ فارسی اور ہندی کا ایک بہت بڑا فاضل اور مایۂ ناز صوفی شاعر تھا۔ زمانہ کے رواج کے مطابق پنجابی میں بھی شعر کہتا تھا۔ یہ ۱۷۵۳ء میں ضلع امرتسر (پنجاب) کے ایک گاؤں "جگدیو" میں پیدا ہوا۔ آپ کے والد حاجی محمد شریف قریشی النسل عرب تھے جنھیں جگدیو کا ایک بڑھئی مسمیٰ اللہ بخش فریضۂ حج ادا کرتے وقت لاولد ہونے کی بنا پر عرب سے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ والد کی پاک صحبت اور . . تعلیم و تربیت نے ہاشم کی فطری پاک باطنی کو لازوال نور کے سانچے میں ڈھال دیا۔ طبیعت میں صوفیانہ اثرات سما گئے اور وہ چھوٹی سی عمر میں مکمّل صوفی ہو گیا۔

۱۴ سال کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اس کے باوجود اُس نے فارسی ہندی اور پنجابی میں کافی دست رَس حاصل کر لی فطری شاعر ہونے کی وجہ سے ریاضت و زہد کے خشک ماحول میں جذبۂ شعری طوفان بن کر اُٹھا اور اُس کے احساسات پر چھا گیا۔ روحانیت میں ڈوبے ہوئے اور صوفیانہ درد و اثر میں سموئے ہوئے اشعار نے ایک نئی زندگی بخشی اور ایک قلیل عرصے میں شاعر کی حیثیت سے اُسے لازوال شہرت حاصل ہو گئی اور یہی شہرت اُسے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں

لے گئی، جس نے اُسے بہت سی جاگیر عطا کی۔ ہاشم شاہ نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ ہندی میں وہ ڈھائی سو کے قریب دوہے کہے۔ یہ خوش گو اور خوش بیان ہونے کے علاوہ خوش آوازہ بھی تھا۔

ایک دن مہاراجہ لاہور سے امرت سر گئے۔ طبیعت ناساز ہوگئی۔ بہتیرا علاج کرایا صحت نہ ہوئی۔ کسی نے کہا کہ سُنا ہے موسیقی کا صحت پر بڑا اثر پڑتا ہے اور مہاراجہ تو گانے کے رسیا ہیں۔ اگر اس وقت ہاشم کے دوہے سرکار کو سنائے جائیں تو شاید افاقہ ہو جائے۔ اُسی وقت ایک تیز رفتار سوار ہاشم کے پاس موضع جگدیو پہنچا، اور فوراً ہاشم کو ساتھ لے آیا۔ ہاشم نے اپنی نئی تصنیف لیلیٰ مجنوں سے اشعار گائے۔ ہاشم کے رسیلے دوہے سُن کر مہاراجہ کی طبیعت بحال ہونے لگی اور کچھ دنوں کے بعد تندرست ہو گئے۔

ہاشم کے دوہے اور بیت کس قدر موثر اور زبان کس قدر رسیلی تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے بھی ہوسکتا ہے کہ ایک لڑکی ہاشم کے دوہوں پہ عاشق ہوگئی اور رفتہ رفتہ اُس کے نکاح میں آ گئی۔

(روزانہ ویر بھارت امرت سر۔ ۲۳، جولائی ۱۹۵۳ء)

انسوس کہ ان کے ہندی کلام کا نمونہ دستیاب نہیں ہوسکا۔

۱۲، ۱۳۔ عالم اور شیخ

عالم دراصل برہمن تھے مگر شیخ نام کی رنگریزن سے محبت کی بنا پر مسلمان ہوگئے تھے۔ شیخ بھی ہندی زبان کی شاعرہ تھی۔ عالم کی تاریخ ولادت سمت ۱۷۱۲ بکرم ہے اور زمانۂ تصنیف سمت ۱۷۴۰ بکرم کہا جاتا ہے۔ آپ شہنشاہ عالمگیر کے دوسرے لڑکے شہزادہ معظم جو بعد میں بہادر شاہ کے نام سے تخت نشین ہوا کے دربار میں رہا کرتے تھے۔ عالم کی ہندی نظموں کا مجموعہ "عالم کیلی" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ شیخ اور عالم کی باہم محبت بھی اپنے اندر ایک دلچسپ کہانی رکھتی ہے۔

کہتے ہیں کہ عالم نے ایک بار شیخ کو پگڑی رنگنے کے لئے دی جس کے دامن کے ایک گوشے میں کاغذ کا پرزہ سہواً بندھا چلا گیا۔ کاغذ پر ایک نامکمل مصرع لکھا ہُوا تھا ع

اُنک چھری سا کامنی کاہے کو کٹی چھین

جس کا مطلب یہ ہے کہ سونے کی چھڑی جیسی خوب صورت محبوبہ کی کمر نہ جانے کیوں نہیں۔ شیخ نے اس دوہے کو مکمل کر کے کاغذ پگڑی کے کونے میں باندھ کر عالم کے پاس بھیج دیا اور وہ دوسرا مصرع یوں لکھا ع

کٹی کو کنچن کاٹ بِدھی کُچن مدھیہ دھری دین

مطلب یہ کہ قضا و قدر نے کمر کا سونا کاٹ کر سینے پر رکھ دیا۔

کمر کے پتلا ہونے کی تاویل میں حُسن التعلیل کا وہ پہلو پیدا کیا ہے کہ سبحان اللہ تاریخی اعتبار سے یہ دوہا ہی عالم اور شیخ کی شادی کا موجب ہوا۔ شیخ کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا، جس کا نام جہان رکھا گیا۔ شہزادہ معظم نے ایک دفعہ ازراہِ تمسخر شیخ سے کہا کہ کیا عالم کی بیوی آپ ہی ہیں؟

شیخ نے جواب دیا کہ ہاں جہاں پناہ جہان کی ماں میں ہی ہوں۔

عالم کی تصنیف "عالم کیلی" میں بہت سے کبت شیخ کے دماغ کا نتیجہ ہیں جیسے مندرجہ ذیل کبت میں چوتھا مصرع شیخ کا ہے ؎

پریم رنگ بگے جگ، جگے جامنی کے جوبن کی جوتی جگی جور اُگمت ہیں
مدن کے ماتے متوارے ایسے گھومت ہیں جھومت ہیں جھکی جھکی جھنپ اُگھرت ہیں
عالم سو نول نکائی ان نینن کی پانکھری پدم پہ بھنور تھرکت ہیں
چاہت ہیں اُڑبے کو دیکھت مینک مکھ جانت ہیں رین تاتیں تاہی میں رہت ہیں

عالم کے ایک ایک لفظ میں دردِ عشق اور سوز و گداز بھرا ہُوا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

پیتم کو چکو روپیکے نس دن کو لیکھے چندبن دن چھپی لاگت اندھیاری ہے
عالم کہت آلی اہو پا سپیں چکاٹسٹین کیلی ہیں پرپتی پیاری ہے

کار وکا من کہت گنواری ایسی لاگتی ہے موہے واکی سیامتائی لاگت اُجیاری ہے
من کو اتنک تہاں رُوپ کو وچار کہاں جبھ دکی پینڈوں تہاں لو بھی کچھ نیاری ہے

ذیل کے اشعار دیکھیے عالم نے انقلاب زمانہ کی کتنی سادہ مگر دلکش تصویر کھینچی ہے ۔

جا تھل کینے وہار انیکن تا تھل کانکری بیٹھا چنیو کریں
جا رسنا سو کری بہو باتن تا رسنا سو چرتر گنیو کریں
عالم جو نسے کنجن میں کری کیلی تہاں اب سیس دھنیو کریں
نینن میں جو سدا رہتے تن کی اب کان کہانی سنیو کریں

۱۴ - علی محب خاں پریتم

یہ آگرے کے رہنے والے تھے سمت ۱۷۸۷ میں "کھٹمل بائیسی" نام کی ایک ظریفانہ انداز میں لکھی ۔ یہ کتاب متعدد پہلوؤں سے اہم ترین ہے ۔ خاں صاحب نے ظرافت کا نہایت اچھوتا، رنگیلا اور بانکا انداز نکالا ہے جس کے سبب یہ اپنے ہم عصروں میں نہایت بلند مقام پر فائز نظر آتے ہیں ۔ ان کی اور کوئی تصنیف نہیں ملتی ۔ نہ سہی ۔ ان کی "کھٹمل بائیسی" ہی سینکڑوں برس تک ان کی یاد تازہ رکھنے کے لئے کافی ہے ۔ نمونہ دیکھیے کبت

جگت کے کارن کرن چاروں وید کمل میں بسے وہ سُجان گیان دھری کے
پوشن آوَنی دُکھ سوشن تہلوکن کے ساگر میں جائے سوئے سیس سیج کری کے
مدن جرائیو جو سنگھارین درشٹی ہی میں سرشٹی بسے ہیں پہار وئیو بھاجی ہری کے
بدھی ہری ہر آور ان بیں نہ کو دُتیو کھاٹ پہ نہ سوئیں کون ڈری کے
بادھن پے گیئو دیکھی بنن میں رہے چھپی سانپن پے گیئو تے پتال مُکھ پائی ہے
گنجن پے گیو ڈھول ڈارت ہے سیس پر بیدھن پے گیو کا ہو دارو نہ بتائی ہے
جب ہہرانے ہم ہری کے نکٹ گئے ہری مو سوں کہی تیری متی بھول چھائی ہے
کو نہ اپائے بھٹکت جنی ڈولے سن کھاٹ کے نگر کھٹمل کی دُہائی ہے

۱۵۔ نظیر اکبر آبادی

نظیر اکبر آبادی بعہد محمد شاہ ثانی تقریباً اس زمانے میں پیدا ہوئے جب نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا تھا۔ عمر اتنی زیادہ پائی کہ میر و سودا سے لے کر جرأت اور ناسخ کا زمانہ دیکھا۔ آپ کا نام ولی محمد اور والد کا نام محمد فاروق تھا۔ ولادت شہر دہلی میں ہوئی۔ احمد شاہ ابدالی کے حملے کے وقت یہ اپنی ماں اور نانی کو لے کر آگرہ چلے گئے۔
آخر عمر میں فالج میں مبتلا ہو گئے اور اسی مرض کے سبب ۱۶ اگست ۱۸۳۰ عیسوی میں انتقال کیا۔ رام چندر شکل نے اپنے تذکرہ (ہندی ساہتیہ کا اتہاس صفحہ ۵۹۷) میں ان کی ولادت سمت ۱۷۹۷ بکرم اور وفات سمت ۱۸۸۷ بکرم لکھی ہے۔

آپ فارسی۔ اردو۔ ہندی تینوں زبانوں میں خوب شعر کہتے تھے مدرسی کا پیشہ تھا۔ طبیعت میں استغنا اس قدر تھا کہ بادشاہ اودھ نے بلایا مگر آگرہ نہیں چھوڑا۔ کلام عام لوگوں میں نہایت مقبول ہے، یہاں یہ اردو کے شکسپیر کہے جاتے ہیں۔ وہاں انھوں نے کھڑی بولی میں وہ دادِ سخن دی ہے کہ رہتی دنیا تک خراجِ تحسین وصول کرتے رہیں گے ان کے ہر شعر سے انسانی ہمدردی، صلح جوئی۔ وسیع المشربی۔ رواداری اور آزادہ روی جھلکتی ہے۔ کرشن بھگوان کی شان میں بہت کچھ لکھا ہے۔ ایک طویل ہندی نظم میں کرشن جی کا بچپن اور جوانی کی کیفیات بیان کی ہیں۔ چناں چہ نمونہ ملاحظہ ہو ؎

یارو سنو یہ دَدھی کے لٹیا کا بال پن — اور مدھو پوری نگر کے بسیا کا بال پن
موہن سروپ نرت کریا کا بال پن — بن بن میں گوال گو ٹیں چریا کا بال پن
ایسا تھا بانسری کے بجیا کا بال پن — کیا کیا کہوں میں کرشن کنھیا کا بال پن

پردے میں بال پن کے یہ اُن کے ملاپ تھے
جوتی سروپ کہیے جنھیں، سو وہ آپ تھے

واں کرشن مدن موہن نے جب جب گوالوں سے یہ بات کہی
اور آپ ہی سے جھٹ گیند ڈھنڈا اُس کالی دہ میں پھینک دی

یہ لیلا ہے اُس نند للن من موہن جسومت دُلارے کی
رکھ دھیان سنو دنڈوت کرو جے بولو کرشن کنہیا کی

جب مُرلی دھر نے مُرلی کو اپنی اَدھری دھری
کیا کیا پریم پریت بھری اس میں دھن بھری
لے اُس میں رادھے نام کی ہر دم بھری کھری
لہرائی دُھن جو اُس کی اِدھر اور اُدھر ذری
سب سُننے والے کہہ اُٹھے جے جے ہری ہری
ایسی بجائی کرشن کنہیا نے بانسری
موہن کی بانسری کے میں کیا کیا کہوں جتن
لے اس کی، مَن کی موہنی، دُھن اس کی چت ہرن
اس بانسری کا آن کے جس جا ہوا ابچن
کیا جل، پَوَن، نظیر، پکھیرو، کیا ہرن
سب سُنتے والے کہہ اُٹھے جے جے ہری ہری
ایسی بجائی کرشن کنہیا نے بانسری

(ماخوذ از ہندی اخبار روزانہ ہندوستان ۲۶ اگست ۱۹۵۹ء صفحہ ۵)

۱۶ ۔ خالص

سید امتیاز خاں نام۔ خالص تخلص تھا۔ اصفہان یا مشہد کا باشندہ تھا۔ ہندوستان میں شہنشاہِ عالمگیر کے عہد میں آیا۔ اور کچھ عرصے کے واسطے صوبہ دار گجرات مقرر ہوا۔ اس کو خدا یار خاں نے مُلکِ سندھ میں ۱۷۱۰ء مطابق ۱۱۲۲ھ میں قتل کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ قاسم علی خاں نواب بنگال اس کا پوتا تھا۔ یہ ایک دیوان کا مصنف ہے۔

(قاموس المشاہیر، جلد اول، صفحہ ۱۰۳)

نمونہ کلام

تُم نام جپن کیوں چھوڑ دیا

کرودھ نہ چھوڑا، جھوٹ نہ چھوڑا ستیہ بچن کیوں چھوڑ دیا
جھوٹے جگ میں دل للچا کر اصلی وطن کیوں چھوڑ دیا
کوڑی کو تو خوب سنبھالا لال رتن کیوں چھوڑ دیا
جس سمرن سے اَتی سُکھ پاوے تن سمرن کیوں چھوڑ دیا
خالص اک بھگوان بھروسے تن من دھن کیوں چھوڑ دیا
تُم نام جپن کیوں چھوڑ دیا

(ماخوذ از اخبار سناتن دھرم پرچارک۔ امرتسر ۳ ستمبر ۱۹۶۸ء)

۱۷۔ لطیف

لطیف صاحب کے حالاتِ زندگی نایاب ہیں۔ اخبار "سناتن دھرم پرچارک امرت سر" مورخہ ۳ ستمبر ۱۹۶۸ء میں ان کی ایک مختصر ہندی نظم شائع ہوئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب لطیف صاحب کو کرشن جی سے کتنی دلی عقیدت تھی۔ نظم میں وہ اُودھو جی کو یوں مخاطب کرتے ہیں ؎

اودھو موہن موہ نہ جاوے
جب جب سُدھ آوت ہے رہ رہ تب تب من بجلاوے
اودھو موہن موہ نہ جاوے
بِرہ بتھا بید صت ہے اُن بن پل چھن چین نہ آوے
اودھو موہن موہ نہ جاوے

۱۸۔ یک رنگی خاں

یک رنگی خاں اسم بامسمّٰی انسان معلوم ہوتے ہیں۔ سوانح حیات تو مل نہیں سکی، البتہ ان کا ہندی کلام جو اخبار سناتن دھرم پرچارک، مورخہ ۳ ستمبر ۱۹۶۸ء سے دست یاب ہوا۔ اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ واقعی یک رنگی تھے اور بھگوان کرشن سے والہانہ محبت رکھتے تھے۔

نمونہ کلام

سانوریا من بھایا رے

سوہنی صورت، موہنی مورت ہردے بیچ سمایا رے

دیس میں ڈھونڈا اودیس میں ڈھونڈا انت کو انت نہ پایا رے

سانوریا من بھایا رے

۱۹۔ فرحت

فرحت اللہ نام۔ فرحت تخلص۔ باپ کا نام شیخ عبداللہ۔ اُردو دیوان بھی آپ کا ملتا ہے۔ ۱۸۷۴ء میں بمقام مرشد آباد فوت ہوئے۔

(قاموس المشاہیر جلد دوم صفحہ ۱۲۱)

نمونہ کلام

بنسری مکھ سے لگائے کھڑے گردھاری

سُنت سُنت من نہ بھرت ہے ایسی ہے تان کراری

بنسری مُکھ سے لگائے کھڑے گردھاری

ہولی

مارو مارو ہو شیام پچکاری ہو

تاک لگائے کھڑی سکھین سنگ اوٹ لئے رادھا پیاری ہو
دیکھو دیکھو شیام وے کیو آوت ابیر لئے بھری تھاری ہو
اک پچکاری اور پر بھو مارو بھیگ جائے تن ساری ہو
فرحت نیہ کھ بنکھ یہ لیلا ہری چرنن بلہاری ہو
مارو مارد ہو شیام پچکاری ہو

۲۰ - افسوس

افسوس! کہ افسوس کے حالاتِ زندگی دست یاب نہ ہو سکے۔ ان کی ایک ہندی نظم ہولی کے بیان میں ملی ہے۔ اس نظم میں اُس منظر کو مدِ نظر رکھا گیا ہے جب کرشن جی گوکل سے متھرا چلے گئے اور پھر ہولی پر بھی واپس نہیں آئے۔ کرشن جی کی غیر حاضری میں فرقت زدہ رادھا اور گوپکاؤں کے احساسات کی تصویر یوں کھینچی گئی ہے۔ ~

کا سنگ پھاگ مچاؤں ری
کنجا سنگ گردھاری رہت ہیں
آنسوؤں کو سکھی رنگ بناؤ		دو نینان پچکاری رہت ہیں
برہا میں کل نہ پڑت پل چھن ہوں		ویا کل سکھیاں ساری رہت ہیں
کنجا سنگ گردھاری رہت ہیں

۲۱ - قاضی اشرف محمود

قاضی صاحب نے کھڑی بولی میں نند کمار کی ٹھمک ٹھمک چال اور مدھ بھری مُرلی کی رسلی تان کا ذکر کس عقیدت سے کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ ~

میرے پران بھلاون آئے		میرے من کو لبھاون آئے
رمل کمل کر مرلی مدھر مدھر		بنسی بجاون آئے

افسوس کہ ایسے رواداراور آزاد خیال شاعر کے حالات معلوم نہ ہو سکے

۲۲۔ سیّد انشاء اللہ خاں (کشمری)

یہ اردو کے مشہور شاعر تھے جو دہلی کے اُجڑنے پر لکھنؤ چلے گئے تھے، ان کے والد صاحب میر ماشاء اللہ کشمیر سے دہلی آئے۔ اسی جگہ انشاء اللہ کی ولادت ہوئی سمت ۱۸۷۵ بکرم مطابق ۱۸۱۷ء میں انتقال ہوا۔

سیّد انشاء اللہ خاں نے اُردو فارسی کے علاوہ ہندی کھڑی بولی کو بہت ترقی دی۔ انھوں نے رانی کیتکی کی کہانی سمت ۱۸۵۵ بکرم اور سمت ۱۸۶۰ بکرم کے درمیان لکھی ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے ٹھیٹھ ہندی لکھنے کی پوری کوشش کی ہے۔ اس میں عربی۔ فارسی۔ ترکی۔ گنوری اور سنسکرت کے الفاظ سے پرہیز کیا ہے۔

ہندی کھڑی بولی کو ترقی دینے والے چار شخص ہوئے ہیں۔ منشی سدا سکھ لال سیّد انشاء اللہ خاں۔ للّو لال اور سدل مصر۔ یہ چاروں اہل قلم سمت ۱۸۶۰ بکرم کے آس پاس ہوئے، ان چاروں میں انشاء اللہ خاں کی بھاشا سب سے چلبلی۔ محاورہ دار اور سرل ہے۔ مثلاً ؎

یہ کیسی چاہت جس میں لہو برسنے لگا
اور اچھی باتوں کو جی ترسنے لگا

آتیاں جاتیاں جو سانسیں ہیں
اُس کے بن دھیان یہ سب پھانسیں ہیں

انشاء نے جگہ جگہ بڑی پیاری گھریلو ٹھیٹھ بھاشا استعمال کی ہے، نمونہ دیکھئے:

"جو ایسی بات پر سچ مچ ڈھلاؤ دیکھوں گی تو تمھارے باپ سے کہہ کر وہ بھبھوت جو وہ مُوا۔ نگوڑا بھوت۔ مچھندر کا پوت۔ اَبدھوت دے گیا ہے، ہاتھ مُرکوا کر چھنوا لوں گی۔"

رانی کیتکی کی کہانی یا اُدے بھانو کا قصہ ثابت کرتا ہے کہ انشا صاحب کو کھڑی بولی سے کس قدر اُنس تھا۔

۲۳۔ تانا شاہ

ابوالحسن قطب شاہ نام تھا، لیکن تانا شاہ کے نام سے مشہور تھا۔ یہ قطب شاہ کا داماد تھا جس کی وفات کے بعد ۱۶۷۲ء مطابق ۱۰۸۳ھ میں دکن حیدر آباد میں گول کنڈے کا بادشاہ ہوا۔ پوری عمر ۵۶ سال کی اس طرح تقسیم ہوئی چودہ برس عہد طفولیت، پھر چودہ برس خدمات پیر طریقت سید شاہ راجو، پھر چودہ سال سلطنت اور چودہ سال قیدی عالم گیر۔ اپنے اسلاف کی طرح تعمیر عمارات کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ ۱۰۸۳ھ میں آٹھ لاکھ روپے کے صرف سے ایک عظیم الشان عمارت ساحل رودِ موسیٰ بنام چار محل بنوائی اور پھر اسی نام سے ایک محلہ آباد ہوا۔ مکہ مسجد کی تعمیر جاریہ کی تکمیل پر آٹھ لاکھ روپیہ صرف کیا۔ پہلے اس کا نام بیت العتیق تھا۔ ۱۰۹۸ھ میں مکہ مسجد نام ہوا۔ ہندی کی شاخ دکھنی زبان کا شاعر تھا۔ تانا شاہ تخلص تھا۔ اسی پر قطب شاہی خاندان کا اختتام ہوا۔ ۱۲، ربیع الثانی ۱۱۱۳ھ مطابق ۱۷۰۴ء میں وفات پائی۔ گول کنڈہ میں مقبرہ ہے۔ (قاموس المشاہیر، جلد دوم صفحہ ۲۹-۳۰)

چوں کہ بعد معزولی قید سخت تھی اس لئے ممکن ہے کہ لوگوں کو اس کی نظمیں ضبطِ تحریر میں لانے کا موقع نہ ملا ہو۔ اس لئے اس کا کوئی منظوم مخطوطہ نہیں ملتا۔ البتہ کہیں کہیں تذکروں میں اشعار مل جاتے ہیں۔

نمونہ کلام

کس در کہوں جاؤں کہاں مجھ دل بھی بھر ٹے ہے
ایک بات کے ہوں گے سجن یاں جی ہی بارہ باٹ ہے

۴۴۔ واجد علی شاہ اختر

یہ اودھ کے آخری بادشاہ تھے۔ اپنے باپ امجد علی شاہ کی وفات کے بعد فروری ۱۸۴۷ء مطابق ۲۶ صفر ۱۲۶۳ھ میں تخت پر بیٹھے۔ تاریخِ تخت نشینی اس مصرع سے نکلتی ہے۔ ع

مبارک مبارک ہو شاہانہ تاج

۱۲۶۳ ہجری

عیش و عشرت کی طرف زیادہ مائل تھے۔ کئی مرتبہ سرکار انگلشیہ کی ہدایت کرنے کے باوجود انتظامِ ملک داری کی طرف توجہ نہ کی۔ بالآخر ۷ فروری ۱۸۵۶ء کو اودھ کا الحاق ہو گیا۔ واجد علی شاہ کو مٹیا برج کلکتہ میں بتاریخ ۱۳ مئی ۱۸۵۶ء نظر بند کر دیا گیا۔

اودھ کے محاصل سالانہ دو کروڑ روپیہ کے قریب تھے۔ لیکن معزول بادشاہ کو صرف پندرہ لاکھ روپیہ سالانہ کا وظیفہ دیا گیا۔ واجد علی شاہ کا تخلص اختر تھا۔ اسیر اور فتح الدولہ برق سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ فارسی میں بھی اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ اردو، فارسی کے علاوہ ہندی بھاشا میں بھی شعر کہتے تھے۔ ہندی میں زیادہ تر ٹھمری اور دوہا کہتے تھے۔ ۲۱ ستمبر ۱۸۸۷ء مطابق ۳ محرم ۱۳۰۵ھ کو انتقال کیا۔

واجد علی خاں اختر نے اپنی تصنیف "پری خانہ" میں اپنی ہندی شاعری کا اقرار کیا ہے۔ چناں چہ اپنی "بیبی نگار محل" کے حالات میں وہ لکھتے ہیں:۔

"اسی زمانہ سے میں نے ٹھمریاں موزوں کرنے کی مشق شروع کی اُنھیں میں سے ایک ٹھمری کے یہ بول ہیں:

من او گوئیاں سیاں رہے اہو دیس

(پری خانہ صفحہ ۵۱)

واجد علی شاہ اختر کو موسیقی میں بھی مہارتِ تامہ حاصل تھی۔ چنانچہ قطب علیخاں

ستار نواز کے حال میں خود لکھتے ہیں :۔

"قطب علی خاں اس فن میں اس قدر مہارت رکھتا تھا کہ اُس وقت کا وہ نائیک بیجو ۔ نائیک گوپال اور تان سین تھا ۔ اس شخص کو میں نے اپنے رفع ملال کے لیے ستار نوازی میں اپنا اُستاد مقرر کیا اور اس سے میں نے یہ فن اتنا سیکھا کہ کئی بار حاضرین محفل حیران رہ گئے"

(بیری خانہ مکتبہ نیا راہی کراچی صفحہ ۶۱-۶۲)

کھیل، تماشے اور رقص و سرود کا بڑا شوق تھا ، چناں چہ ایک رہس کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

"اس ناچ میں کنہیا اور رادھا کے مکالمے کا تاثر ہوتا ہے جو مفارقت اور وصل کے ہنگام رونما ہوتا ہے ۔ یہ مکالمہ ہندی دوہروں میں لکھا جاتا ہے ۔ جیسے دوہرہ ؎

مور مکٹ کا چھنی کر مُرلی اور مال   یہ مانک موہ من لبسے سدا بہاری لال

دوہرہ رادھا ؎

آپیا رے موہن پلک ڈھانپ توہے لیوں   نا میں دیکھوں اور کا نہ توہے دیکھن دیوں

(بیری خانہ مکتبہ نیا راہی کراچی ۔ صفحہ ۱۵۳)

رسالہ آج کل دہلی کے موسیقی نمبر اگست ۱۹۵۶ء میں ایک مضمون "ہندوستانی موسیقی کا ارتقا" شایع ہوا ہے ، اس میں صفحہ ۲۳ پر یہ عبارت لکھی ملتی ہے :۔

لکھنؤ کے نواب واجد علی شاہ کے درباریں وسہل تر اور نسبتاً زیادہ جذباتی چیزیں ٹھمری اور دادرا ایجاد کی گئیں"

نمونہ کلام ملاحظہ ہو ۔ ٹھمری ؎

استائی ۔ سانجھ نیند نین نہیں آئی رے

انترہ تڑپ تڑپ سگری رین گجری   رلت نیر سوں ندیا بہائی رے

سانجھ نیند نہ آئی رے

اکھتر سنگ سنجوگ نہ بنی ہے ہوں برہن رت ہی دُکھ پائی رے
سانجھ نیند نہ آئی رے

آپ اُردو میں اختر، اور ہندی میں اکھتر تخلص کرتے تھے، جو اختر ہی کی تبدیل شدہ صورت ہے۔

۲۵۔ تان رس خاں

تان کا ایک بادشاہ عروج عہدِ مغلیہ میں اور دوسرا زوالِ عہدِ مغلیہ میں ہوا۔ تان کے اس دوسرے بادشاہ کا نام قطب بخش تھا۔ دہلی کے قریب ڈاسنا نامی ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام قادر بخش تھا جن کو فنِ موسیقی سے گہرا لگاؤ تھا۔ چناں چہ بہت چھوٹی عمر میں انھوں نے اپنے بیٹے قطب بخش کو موسیقی تعلیم دینی شروع کی، اور عالمِ جوانی تک پہنچتے پہنچتے اُنھیں ماہر کامل بنا دیا۔

میاں قطب بخش اپنے والد سے موسیقی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے دہلی آئے۔ وہ اس فن میں اتنے ماہر ہو کر آئے کہ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی نگاہ نے اُنھیں قلعہ معلیٰ کے لئے چُن لیا اور وہ سب سے بڑے شاہی موسیقار ہو گئے اور بادشاہ سے گہرے تعلقات قائم ہو گئے۔ دہلی کا مشہور محلہ چاندنی محل بادشاہ نے خاں صاحب کو دیا تھا۔ یہاں اب تک بھی ایک گلی کا نام "گلی تان رس خاں" ہے۔

تان رس باوجود ماہرِ فن ہونے کے ایک درویش صفت بزرگ میاں اچپل (جو فنِ موسیقی میں کامل تھے) کے شاگرد بن گئے اور سونے پر سہاگے، کی مثل صادق آئی۔ شاہ ظفر کی جلاوطنی کے بعد جودھ پور، جے پور، گوالیار، نیپال اور الور کی ریاستوں میں بھی شاہی گویے کی حیثیت سے مقیم رہے۔ آخر عمر میں میر محبوب علی خاں نظام حیدر آباد کے دربار میں رہنے لگے اور سو سال کی عمر پا کر وہیں انتقال کیا۔

خاں صاحب کے چار بھائی اور تھے۔ حیدر خاں، مدار خاں، علی بخش خاں اور حاجی جیون خاں۔ اولاد میں دو صاحب زادے، غلام غوث خاں اور چھوٹے امراؤ خاں

امراؤ خاں ہندوستان میں بہت مشہور ہوئے۔ باپ کے نام کو خوب روشن کیا۔ تان رس خان کے دو بھتیجے شبو خاں صاحب اور ظہور خاں صاحب اپنی تان کی پھرت کے اعتبار سے انفرادی حیثیت رکھتے تھے۔ خاں صاحب کے بھانجے محمد صدیق بھی بہے مشہور و معروف تھے۔ ان کے پوتوں میں عبدالرحیم خاں نادرؔ اردو ہندی کے بہت اچھے شاعر اور داغؔ دہلوی کے شاگرد تھے۔ فنِ موسیقی میں بڑے باکمال تھے دونوں بھائی عبدالکریم خاں صابرؔ اور عبدالعظیم خان بیانؔ بھی مرزا داغؔ کے شاگرد تھے۔ اور فنِ موسیقی میں لاجواب تھے خاں صاحب کے دوسرے پوتے سردار خاں اور پر پوتے پیارے خاں بھی بہت مشہور فن کار ہیں۔

تان رس کے شاگردوں میں علی بخش اور فتح علی خاں ہندوستان کی بہت ہی مشہور ہستیاں گزری ہیں۔ یہ دونوں حضرات پنجاب کے رہنے والے تھے۔ مہاراجہ پٹیالہ کے یہاں مدتوں ملازم رہے۔ ان کے شاگرد میاں جان خاں۔ کالے خاں اور علی بخش خاں قصوری نے ہندوستان گیر شہرت حاصل کی۔ یہ سب حضرات ہندی زبان کی ترقی میں برابر کے حصہ دار اور قابلِ ذکر ہیں، کیوں کہ یہ اکثر راگ، راگنیاں خود بھی کہتے تھے جو ہندی زبان میں ہوتی تھی۔

تان رس خاں اپنے زمانے کے یکتا موسیقار تھا۔ بزرگانِ دینؒ بہت عقیدت رکھتے تھے۔ اجمیر شریف اور کلیر شریف میں اِن کی بنائی سنہچیاں آج بھی موجود ہیں۔ ان کی دو چیزیں بطور نمونہ ملاحظہ ہوں۔

راگ پوُر دی۔ تین تال

استائی: جمعیت کیجئے موری حضرت نظام الدین سلطان المشائخ اودیا

انترہ: پھوں دیس میں نام تہارو ذرذری کٹھن سمے کو گیان سُرراگ تان صدقہ امیر کا۔

راگ جونپوری تین تال میں خیال ہے

استائی: سکھی پریم نگریا نہ جائیو جائیو نہ پر بہ دُکھ سہیئو

انترہ: پریم نگر کی راہ کٹھن ہے اپنی مت کی رہیو سکھی

راگ ٹوری میں ایک اور خیال ہے تین تال میں ؎

استائی۔ اب موری نیّا پار کرو تم حضرت نظام الدین اولیا

انترہ۔ قطب الدین کے راج دلارے بابا فرید گی آنکھ کے تارے۔ رس کھان کی لیو کھبر یا۔

(ماہنامہ شاعر بمبئی کا قومی یک جہتی نمبر صفحہ ۲۲۶ سنہ ۱۹۷۴ء)

۲۶۔ میاں اَچپل

میاں اچپل تان رس خاں کے اُستاد تھے۔ حضرت قطب صاحب کے مزار کے قریب رہتے تھے۔ موسیقی کے عالم ہونے کے ساتھ صوفی بھی تھے، اِن کا راگ یمن میں خیال ہے ؎

استائی۔ گُرو بِن کیسے گُن گائے گُرو نا مانے تو گُن نہیں آوے گُنیَن میں۔ بے گُنی کہاوے

انترہ۔ ڈ۔ رِجھاوے سب کو چرن گہے سنگیتن کے تب اَچپل گُن آوے

(ماہنامہ شاعر بمبئی کا قومی یک جہتی نمبر سنہ ۱۹۷۴ء صفحہ ۲۲۶)

۲۷۔ میاں رمضان خاں رنگیلے

میاں رمضان خاں رنگیلے مغل بادشاہ محمد شاہ کے درباری موسیقار تھے۔ اپنی رچناؤں میں کہیں کہیں محمد شاہ کا نام بھی اپنے نام کے ساتھ ڈالا ہے۔ یہ بزرگ اپنے زمانے میں بے مثل نایک تھے۔ ان کی راگ اڈّانہ میں چیز ہے ؎

استائی۔ مندری موری کاہے کو چھین لئی چھبیلوا ہوں کہا کینو تورا رے

انترہ۔ ہوں تو نا ہیں رَت جات رنگیلے مان کہا مورا رے۔

ان ہی کی ایک چیز ہے راگ نٹ بہاگ اور ایک تال میں ؎

استائی۔ کیسے کیسے جوگت موسوں لگا دیکھو سیّاں تمہارے بولن بِن پوچھے ناہیں سانس نند کو دیات

انترہ۔ جنم جوبن یونہیں جات رنگیلے تمہاری مایا سوں نس دِن جیا کلپات

(ماہنامہ شاعر بمبئی کا قومی یک جہتی نمبر ۱۹۷۴ء صفحہ ۲۲۶)

۲۸ - امراؤ خان

یہ خیال امراؤ خان ابن تان سین ؒ خاں کا بنایا ہوا ہے۔ راگ راگیشری میں ہے ؎

استائی۔ آیو رے جیت راجا رام چند رلنکا نگر
انترہ۔ دیس دیس سُنی اُنی چچکیت آنند بھیو گھر گھر

۲۹۔ بسرام خاں کلاونت

یہ شاہ جہانی عہد کا مشہور کلاونت تھا۔ خوش حال کا بھائی اور گن سمندر خاں کا بیٹا ہے۔ اس نے ۱۰۸۲ھ مطابق ۱۶۷۱ء میں انتقال کیا۔

(رسالہ آج کل کا موسیقی نمبر اگست ۱۹۵۶ء صفحہ ۱۰۸)

۳۰۔ نعمت خاں سدا رنگ

یہ پرسول خاں کا بیٹا اور فنِ موسیقی میں یگانۂ آفاق تھا۔ اس کی بین نوازی کی تعریف نہیں کی جاسکتی۔ دھرپد۔ خیال۔ ترانہ اور نغمہ کے دوسرے اقسام بڑی تازگی۔ پختگی اور رنگینی کے ساتھ لکھے ہیں۔ شروع میں محمد معظم شاہ کی مجلس میں تتار ہی قوالی۔ دیودت۔ کبیشر۔ اور دوسرے اہلِ کمال سے فنِ موسیقی حاصل کیا۔ بعدازاں بہاں دار شاہ کے دربار میں عزت و احترام پایا۔ پھر محمد شاہ بادشاہ دہلی نے اس کی پرورش فرمائی، اور بڑی قدردانی کی۔ محمد شاہ کے آخری عہد میں اس کا انتقال ہوا۔

نعمت خاں اپنے گیتوں میں سدا رنگ تخلص کرتا تھا اور موسیقی کی جامع صنف "خیال" کا اُستادِ کامل تھا۔ اس نے نئے نئے راگ ترتیب دیئے جو خیال کے نام سے مشہور ہوئے۔

ایک رنگ خیال ملاحظہ ہو ؎

جھن جھن جھن پائل باجے
کیسے جاؤں پی کو ملن
جاگے موری ساس ننداور دیورانیا جیٹھنیا
اگر سنے نیر و با گرو دیگوا ورسن پاوے محمد شاہ رنگیلے
جھن جھن جھن پائل باجے
کیسے جاؤں پی کو ملن

(آج کل دہلی کا موسیقی نمبر اگست ۱۹۵۶ء صفحہ ۱۰۹-۱۱۰)

یہ خیال میاں نعمت خاں سدا رنگ کا راگ بروا میں ہے ؎

استائی۔ لنگروا چھانڈو موری بیاں کرکن لاگی لیے ناداں چیر یاں دروں گن بگرت بوری رے
انترہ۔ تم رے ملن کو آئی ہوں سدا رنگ ساس نند کی چوریاں۔

(ماہنامہ شاعر بمبئی کا قومی یک جہتی نمبر صفحہ ۲۲۷)

۳۱۔ میاں من رنگ

میاں من رنگ سدا رنگ کے شاگردوں میں سے تھے۔ یہ بھی محمد شاہ رنگیلے کے درباری گائیکوں میں سے تھے۔ بروا راگ استائی گیا خوب کہی ہے اس میں فراق کا تاثر ہے ؎

استائی۔ اے ری میں کونا ہیں پرت چین تڑپت ہوں میں پڑی
انترہ۔ من رنگ پیا آج ہو نہیں آئے آنسوؤں لاگی جھری

(ماہنامہ شاعر بمبئی کا قومی یک جہتی نمبر ۱۹۷۴ء صفحہ ۲۲۷)

۳۲۔ محمد خاں

نعمت خاں سدا رنگ کے زمانے ہی میں دولت راؤ کے دربار میں ایک بہت بڑے گویّے محمد خاں تھے جو امیر خسرو کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے، انھوں

نے ۴۰ برس تک ریاض کرنے کے بعد عام جلسوں میں گانا شروع کیا تھا۔ خیال راگ میں "ستا نوٹ" کی ایجاد بھی انھیں کی مرہونِ منت ہے۔ انھوں نے اپنی تمام زندگی انھیں تانیات کے تنوع اور ترقی پر صرف کی تھی اس لئے وہ ہمیشہ دوسرے گویوں کے سامنے گانے سے پرہیز کرتے تھے۔ انھیں خوف تھا کہ ان کے تان کی تکنیک دوسرے بھی نقل نہ کرلیں۔

(ماہنامہ آج کل دہلی کا موسیقی نمبر اگست ۵۶ء صفحہ ۱۱۰)

۳۳۔ فیروز خاں

یہ نعمت خاں کا شاگرد اور داماد تھا۔ اپنے عہد کا سب سے بڑا گویا تھا جو دستکاری کاری پختگی اور رنگینی اس کے گانے میں دیکھی، اُس کا وجود دوسروں کے یہاں محال ہے۔ بین نوازی میں یگانۂ زماں اور عدیم المثال تھا۔ دھرپد خیال اور ترانہ لکھنے میں پوری مہارت اور قدرت حاصل تھی۔

(ماہنامہ آجکل دہلی کا موسیقی نمبر اگست ۱۹۵۶ء صفحہ ۱۰۸)

۳۴۔ پیر بخش

۱۸۴۳ء سے ۱۸۷۹ء تک خیال پیر بخش کے ہاتھوں زندہ رہا جو نعمت خاں سدا رنگ کے بعد براہ راست یکے بعد دیگرے پیر بخش تک پہنچا تھا۔ پیر بخش کے دو شاگرد ہدو خاں اور ہسو خاں گوالیار کے دربار میں درباری گویے تھے۔ ہدو خاں کے دو لڑکے محمد خاں اور رحمت خاں تھے جن میں رحمت خاں نے خیال گانے میں خاص مقبولیت حاصل کی۔ مہاراجہ نیپال نے ان کے علم و فن کی اس قدر قدردانی کی کہ اُن کو شاہی ہاتھی پر بیٹھنے کی عزت سے نوازا گیا۔

علاوہ ازیں مشتاق حسین۔ عنایت حسین۔ کرامت خاں۔ عبدالکریم خاں، خدا بخش غلام عباس۔ استاد فیاض خاں، نتھن خاں اور ولایت حسین خاں نے اس فن میں ہندوستان گیر

شہرت حاصل کی۔ عورتوں میں گوہر جان اور زہرہ بائی بھی اس صنفِ موسیقی (خیال) کی بہترین گائیکائیں مانی جاتی تھیں۔

(ماہ نامہ آج کل کا موسیقی نمبر اگست ۱۹۵۶ء صفحہ ۱۱۰)

۳۵۔ محمد شاہ رنگیلا بادشاہ دہلی

محمد شاہ بادشاہ دہلی کے دربار میں جہاں بڑے بڑے صاحبِ کمال گویّے اور شاعر رہتے تھے، وہاں خود محمد شاہ (متوفی ۱۱۶۱ھ) بھی ہندی زبان کا شاعر تھا۔ اس کی تصنیف سے ایک بارہ ماسہ اب تک موجود ہے۔

جناب سائل حیدری مینائی گوالیاری نے اپنے ایک گرامی نامہ کے ذریعہ ان کا ہندی کلام بغرضِ نمونہ عطا فرمایا جو شکریہ کے ساتھ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔

محمد شاہ رنگیلے کا ایک آساوری کا خیال سُنیئے۔ ؎

اَب موے کان بھنکو اپری لو

جب آویں گے یاد رنجوا   تن من دھن نچھاور کرہوں

سدا رنگیلے محمد شاہ   رتن جتنگوا

اب موے کان بھنکو اپری لو

۳۶۔ اعظم خاں

اعظم خاں ایک ہندی شاعر ہوئے ہیں۔ ان کے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ تذکروں سے صرف یہ پتہ چلا ہے کہ انھوں نے محمد شاہ بادشاہ دہلی کے حکم سے "سنگار درپن" نامی کتاب سمت ۱۷۸۶ بکرم میں تالیف کی۔

۳۷۔ ابو ظفر بہادر شاہ

بہادر شاہ ابو ظفر سراج الدین نسل تیموری سے دہلی کے آخری بادشاہ تھے

اکبر شاہ ثانی کے بیٹے تھے۔ سہ شنبہ کے دن بتاریخ ۲۴ ؍ اکتوبر ۱۷۷۵ء مطابق ۲۸ شعبان ۱۱۸۹ھ پیدا ہوئے۔ ان کا تاریخی نام ابوظفر ہے۔ والدہ کا نام لال بائی تھا۔ فارسی کے بڑے عالم اور اردو کے فصیح شاعر تھے۔ ظفر تخلص کرتے تھے۔ ذوق دہلوی سے تلمذ تھا۔ چار دیوان مطبوعہ موجود ہیں جن میں ان کا ہندی کلام بھی درج ہے۔
۲۸ مئی ۱۸۳۷ء مطابق ۲۸ جمادی الثانی ۱۲۵۳ھ اپنے باپ کی بجائے تخت نشین ہوئے۔ بدقسمتی سے ۱۸۵۷ء کے غدر میں ان پر بغاوت کا الزام لگایا گیا اور اکتوبر ۱۸۵۸ء میں قید کر کے رنگون بھیج دیے گئے۔ اس وقت دو بیویاں ایک لڑکا اور ایک پوتا ان کے ساتھ تھے گورنمنٹ سے ایک لاکھ روپیہ ماہانہ کا وظیفہ ملتا تھا۔ رنگون ہی میں ۷؍ نومبر ۱۸۶۲ء کو انتقال کیا۔

یہ بادشاہ جہاں تقدیر کے گھر سے دولت و اقبال اور شاہانہ عروج کی نعمتوں سے محروم رکھا گیا، وہاں خوش مذاقی۔ زندہ دلی اور روشن خیالی کے جوہر سے مالامال کیا گیا تھا۔ یہ خضر صورت۔ درویش سیرت اور صوفی منش تھا۔ اردو میں نئی نئی زمینیں پیدا کیں۔ اسی واسطے تذکرہ نگاروں نے اس کو زمینوں کا بادشاہ کہا ہے۔ اردو میں ظفر اور ہندی میں شوق رنگ تخلص کرتا تھا۔ موسیقی میں بھی ماہر تھا۔ اور ہندی میں پنجابی کے الفاظ بھی بعض جگہ استعمال کئے ہیں اور بعض مثلث اس طرح لکھے ہیں کہ ٹیپ کا مصرع جداگانہ بحر میں اردو کا اور پہلے دونوں مصرعے ہندی کے جس میں پنجابی کا لفظ بھی کہیں کہیں آ گیا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔ ے

عشق کا عالم نہ پوچھو وہ جہاں ہی اور ہے
پریم نگر کی ریت نرالی، اور نرالا طور ہے
ہے تو وہ اس جگ میں لیکن ہے وہ جگ ہی اور
واں زمیں ہی اور ہے واں آسماں ہی اور ہے
ہم نہ جانیں کیسی مسجد کیسا ٹھاکر دوارا
ہم تو اُنہی سیس نوائیں جتھے اپنا پیارا

اپنے سجدے کے لئے اک آستاں ہی اور ہے

(دیوانِ ظفر جلد اول صفحہ ۳۸۹)

نہ جانوں اِن بھاگاں نے کیا باندھی مجھ سے لاگ

سو یح چاند سبھی ہیں پھر ویے، پھرے نہ مورے بھاگ

عمر گزری فلکِ پیر کو پلٹے کھاتے

(دیوانِ ظفر جلد اول صفحہ ۳۸۵)

نا جانوں وہ کون نگریا، کیسی اُس دی بات

کیسو وہاں کے لوگ لبیا، کیسو وہاں کی ٹھات

ہے وہ کیا عالم کہ جس کا بھید ہم پاتے نہیں

میں کہتی تھی اپنے پیا کو راکھوں گی ٹیں گھیر

وہ تو بن کو ایسے سدھائے پل ہی لاگی دیر

اس طرح سے پھول بھی گلشن میں کملاتے نہیں

(دیوانِ ظفر جلد اول صفحہ ۳۸۷)

اُردو اشعار کے علاوہ فارسی اشعار کو ہندی اشعار (مختلف البحر) کے ساتھ تضمین کیا ہے ؎

کیوں مو پہ رنگ کی ماری پچکاری   دیکھو کنورجی دوں گی میں گاری

ہر کہ دست از جاں بشوید

ہر چہ در دل دارد، بگوید

شوقِ رنگ ایسے ڈھیٹھ لگر سے کھیلے کون اب ہوری

مکھی مینڈے اور ہاتھ مروڑے کر کے وہ برجوری

ہر کہ با فولاد بازو پنجہ کرد

ساعد سیمین خود را رنجہ کرد

(دیوانِ ظفر جلد اول صفحہ ۳۹۴)

ہندی غزلوں کا نمونہ بھی دیکھئے ؎

بیم اگن نت موہے جراوت پا کا بھید کہوں کا سے
پی ہو پاس تو جی ہو ٹھنڈا، اپنی بپتا کہوں واسے
من کے اندر پیا قلندر تیرے ظفرؔ وہ آن بسا
کام پڑا جب واسو تہارو، کام رہا کیا دُنیا سے

(دیوان ظفر جلد سوم ۔صفحہ ۱۹۳)

کون نگر سے آئے ہم، اور کون نگر کے باسے ہیں
جائیں گے ہم کون نگر کو، ہوتے من میں ہراسے ہیں
دُنیا ہے اک رین بسیرا، بیت گئی رہی تھوڑی سی
ان کو کہہ دو سو جائیں نیندیں جو نندا سے ہیں

آپ نے ٹھمریاں پہیلیاں ۔ سٹھنیاں بھی کہی ہیں ۔ شاعری کے علاوہ موسیقی میں بھی فنِ خیال کے استاد تھے ۔

۳۸ ۔ ذوقؔ دہلوی

شیخ محمد ابراہیم نام ۔ ذوقؔ تخلص ۔ شیخ محمد انصاری کے فرزند ۔ ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۰۴ھ کو دہلی میں پیدا ہوئے ۔ فارسی ۔ عربی میں صاحبِ استعداد کامل تھے ۔ ابتدائے عمر ہی سے شاعری کا شوق تھا ۔ شاہ نصیر کی شاگردی اختیار کی ۔ مومنؔ اور غالبؔ کے ہم عصر تھے ۔ بہادر شاہ ظفر بادشاہ دہلی کے اُستاد تھے ۔ اِس فن کے مسلم الثبوت اُستاد مانے جاتے ہیں ۲۴ صفر ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۵ء ۔ بروز چہارشنبہ انتقال کیا ۔ ایک دیوان اور مثنوی "جاں سوز" یادگار ہے ۔ اُردو کے علاوہ ہندی میں بھی شعر کہتے تھے ۔ گو ان کا ہندی کلام ناپید ہے ۔ لیکن ان کے ہندی میں شعر گوئی کا ثبوت ان کے شاگرد رشید آزاد دہلوی کے بیان سے ظاہر ہے ۔ فرماتے ہیں :۔

" بادشاہ کا قاعدہ تھا کہ شاہ عالم اور اکبر بادشاہ کی طرح محرم میں

کم سے کم ایک سلام ضرور کہتے تھے۔ شیخ مرحوم بھی اسی کو اپنی سعادت اور عبادت سمجھتے تھے۔ ہزاروں گیت، ٹپے، ٹھمریاں، ہولیاں کہیں، وہ بادشاہ کے نام سے عالم میں مشہور ہیں، اور اِن باتوں میں وہ اپنی شہرت چاہتے بھی نہ تھے!! (آبِ حیات صفحہ ۴۸۶)

دوسری جگہ مولانا آزاد لکھتے ہیں:

"ایک بڈھا چورن مرچن کی پڑیاں بیچتا پھرتا تھا اور آواز دیتا تھا

"تیرے من چلے کا سودا ہے کھٹّا اور میٹھا"

حضور (شاہ ظفر) نے سُنا ایک دو مصرعے اُس پر لگا کر اُستاد کو بھیج دیئے۔ اُنھوں نے دس دوہرے لگا دیئے۔ حضور (شاہ ظفر) نے لے رکھے۔ کنچنیاں ملازم تھیں، اُنھیں یاد کروا دیئے۔ دوسرے دن بچہ بچہ کی زبان پر تھے۔ دو بند یاد رہ گئے۔"

لے تیرے من چلے کا سودا ہے کھٹّا اور میٹھا
کنجڑے کی سی ہاٹ ہے دُنیا، جنس ہے ساری اکٹھی
میٹھی چاہے میٹھی لے لے، کھٹّی چاہے کھٹّی
لے تیرے من چلے کا سودا ہے کھٹّا اور میٹھا
روپ رنگ پر نہ بھول، نہ دل میں دیکھ عقل کے بیری
اُوپر میٹھی نیچے کھٹّی، انبوا کی سی کیری
لے تیرے من چلے کا سودا ہے کھٹّا اور میٹھا"

ایک فقیر صدا دیتا تھا:-

"کچھ راہِ خدا دے جا جا تیرا بھلا ہوگا"

حضور (شاہ ظفر) کو صدا پسند آئی۔ اُن سے (ذوق) کہا۔ اُنھوں (ذوق) نے بارہ دوہرے اُس پر لگا دیئے۔ مُدّتوں تک گھر گھر سے اسی کے گانے کی آواز آتی تھی اور گلی گلی لوگ گاتے پھرتے تھے۔

کچھ راہِ خدا دے جا جا تیرا بھلا ہوگا

دُنیا ہے سرا اس میں تو بیٹھا مسافر ہے
اور جانا ہے یہاں سے جانا تجھے آخر ہے

کچھ راہِ خدا دے جا جا تیرا بھلا ہوگا

دے گا اُسی کو تو، وہ جس کو ہے دلوانا
پر ہے ظفرؔ تجھ کو یہ آواز سُنا جانا

کچھ راہِ خدا دے جا جا تیرا بھلا ہوگا

اس طرح کی ہزاروں چیزیں تھیں۔ ٹپّے، ٹھمریاں، پہیلیاں، سٹھنیاں کہاں تک لکھوں۔
ایک دن ٹہل رہے تھے۔ حافظ ویران ساتھ تھے۔ بہ تقاضائے استنجا بیٹھ گئے اور وقتِ معیّن سے زیادہ دیر ہوئی۔ انھوں نے قریب جا کر خیال کیا تو کچھ گنگنا رہے ہیں اور چٹکی سے جوتی پر کھٹ کھٹ کرتے جاتے ہیں۔ پوچھا کہ ابھی آپ فارغ نہیں ہوئے؟

فرمایا کہ حضور (شاہ ظفر) نے چلتے ہوئے ایک ٹھمری کے دو تین انترے سُنائے تھے کہ اسے پورا کر دینا۔ اس وقت اُس کا خیال آ گیا۔

پوچھا کہ یہ جوتی پر آپ چٹکی کیوں مارتے تھے؟
فرمایا کہ دیکھتا تھا اس کے لفظ تال پر ٹھیک بیٹھتے ہیں یا نہیں۔

(آبِ حیات صفحہ ۵۰۶ - ۵۰۷)

ان حالات کی روشنی میں یہ بات ایک بے نقاب حقیقت ہے کہ حضرت ذوقؔ اُردو فارسی کے علاوہ ہندی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔

ذوقؔ کے متعلق رسالہ "نگار" لکھنؤ بابت ماہ ستمبر ۱۹۵۵ء صفحہ ۳۷ پر محمد انصار اللہ نظر خورجوی کا مضمون (ذوقؔ اور علمِ موسیقی) شائع ہوا ہے، جس میں سے چند اقتباسات دیئے جاتے ہیں، جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ ذوقؔ کو ہندی شاعری سے بھی لگاؤ تھا۔

ذوق اپنی موسیقیت کی نسبت خود کہتے ہیں :-

"چند روز موسیقی کا بھی شوق رہا اور کچھ حاصل بھی کیا۔ مگر خاندیش سے ایک بڑا صاحبِ کمال گویّا آیا۔ اُس سے ملاقات کی۔ باتوں باتوں میں اُس نے کہا جو گانے کا شوق کرے اُس کے لئے تین سو برس کی عمر چاہئے۔ سو برس سیکھے، سو برس سُنتا پھرے، اور جو سیکھا ہے اُسے مطابق کرے۔ پھر سو برس بیٹھ کر اوروں کو بھی سُنائے اور اس کا لُطف اُٹھائے۔ یہ سُن کر دل برداشتہ ہو گیا اور یہ بھی خیال آیا کہ ابراہیم اگر بڑا کمال پیدا کیا تو ایک ... ڈوم ہو گئے۔ اس پر بھی جو کلاونت ہو گا وہ ناک چڑھا کر یہی کہے گا کہ "عطائی" ہیں۔ سپاہی زادہ سے ڈوم بننا کیا ضرور۔"

(آبِ حیات۔ صفحہ ۵۷۸)

پھر ایک قصیدے میں کہتے ہیں ؎

ماہرِ موسیقی ایسا کہ ادا کرتا تھا
کبھی یک بارہ مقام اور کبھی چودہ مت

ہندی راگ میں پنڈتوں نے بائیس (۲۲) سُرتیاں مقرر کی ہیں، ان میں سے سات خاص ہیں، اور یہی زیادہ اہم ہیں۔ ان کو اصطلاحاً سُر کہتے ہیں۔ ذوق کہتے ہیں ؎

مدھم و پنچم کھرج گندھار دھیوت اور نکھاد
نغمۂ ہندی کا ہوئے سات سُر سے انتظام

دوسرے مصرع میں اگرچہ سات سُر بیان ہوئے ہیں، لیکن پہلے میں صرف چھ کا ذکر ہے۔ ساتواں سُر رکھب ہے جو کھرج اور پنچم کے درمیان واقع ہوتا ہے۔ غالباً اس سُر کا بیان مناسب محل نہ معلوم ہوا۔ اس لئے ذوق نے اس کا نام نہیں لیا۔ کھرج کا اصلی نام شڑج ہے۔ اس کے ساتھ اگر پنچم کی سُرتی بھی ہو تو ان کی ملی جلی آواز کانوں کو بہت بھلی لگتی ہے۔ چنانچہ ذوق کا ایک شعر ہے ؎

لو گے جس سازِ خدا ساز کو آغوش میں آج
تار چھیڑو گے کھرج کا تو سُنو گے پنچم

پہلے مصرعے پر غور کیجئے کس قدر خوب ہے۔ ساز کو بجانے کے لئے اُسے اس طرح گرفت میں لیتے ہیں گویا آغوش میں لے رہے ہیں ے

اس قدر سازِ طرب ساز کی آواز بلند
چھیڑیں گر تار کھرج کا تو کھرج کا تو سنو دھیوت

دھیوت بھی مذکورہ سات سُرتیوں میں سے ایک ہے۔ دون کی کھرج اور پنچم کے درمیان جب یہ واقع ہوتی ہے تو اُسے سِدھ دھیوت کہتے ہیں اور یہی رائج الوقت ہے۔ ان کے علاوہ ذوق کے یہاں مختلف راگنیوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ مثلاً ے

لے کے انگڑائی کہیں ہنسنے لگی رام کلی
اُٹھی ملتی ہوئی آنکھوں کو کہیں اپنی للت

للت اور رام کلی دونوں ہندی راگنیوں کے نام ہیں۔ رام کلی بھیروں ٹھاٹھ کا راگ ہے اور صبح کے وقت گایا جاتا ہے۔ للت میں مدھم اور دھیوت کا سنگت ہوتا ہے۔ آدھی رات کے بعد یہ زیادہ لطف دیتا ہے۔ اس ۔۔۔۔ کا وقت رات کا پچھلا پہر ہے۔ ے

اثرِ نغمۂ شیریں سے جہاں بھول گیا
کہ سوا راگ کی سم کے ہے کوئی اور بھی سم

سم کے لغوی معنی برابر کے ہیں لیکن موسیقی میں ہر تال کے ساتھ ایک سم ہوتی ہے آج کل تال اور گیت کا سم سے شروع ہونا ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن پہلے اس کو اصولی حیثیت حاصل تھی اور ہر تال ایک سم سے شروع ہوتی تھی۔

مذکورہ اصطلاحات سے ثابت ہوتا ہے کہ ذوق کو علم موسیقی سے خاصی واقفیت تھی اور یہ ظاہر ہے کہ ذوق اپنے اشعار کو ترنم و موسیقیت سے ضرور آراستہ کرتے ہوں گے، اور اس کے لئے واقعات شاہد ہیں۔ ذوق شعر کہتے تھے، تو پہلے دیکھ لیتے

تخنے کہ یہ تال پر ٹھیک بھی بیٹھتے ہیں یا نہیں ؟
گانے کی اقسام میں ٹھمری ۔ ٹپے وغیرہ بھی ہیں، جو ذوق نے ہزارہا لکھے، اور اس میدان میں بھی مسلم الثبوت اُستاد ہوئے ۔ دولت رام شفق وغیرہ ذوق کے وہ تلامذہ تھے جو صرف ٹھمری اور ٹپے وغیرہ لکھتے تھے ۔

(ماہنامہ نگار ماہ ستمبر ۱۹۵۸ء صفحہ ۳۹)

جناب طالب علی الہ آبادی کی رائے بھی اہمیت سے خالی نہیں کہ:
"حضرت امیر خسرو کے بعد ہندوستان کے اندر اُردو شعراء میں ذوق کو اس کی اولیت حاصل ہے کہ انھوں نے غزل کی مناسبت سے ترنم اور نغمہ، نجوم اور رمل میں بھی دست گاہ حاصل کی ۔"

(دیوان ذوق صفحہ ۱۰)

۳۹ ۔ سکندر

خلیفہ سکندر نام ۔ عرف گھسیا ۔ سکندر تخلص ۔ یہ محمد شاکر ناجی کا شاگرد تھا ۔ اس کا زمانہ شاعری ۱۱۶۵ھ ہجری کے آس پاس ہے ۔ اس نے پنجابی ۔ مارواڑی ۔ پوربی ۔ بنگالی زبان میں مرثیے کہے ہیں ۔ اس کی ایک نظم بہت مشہور ہے جس میں ملاح ۔ ماہی گیر اور بادشاہ ولی خوار کا قصہ نہایت آب و تاب سے نظم کیا ہے ۔ نمونۂ کلام دست یاب نہیں ہو سکا ۔ مندرجہ بالا واقفیت تذکرہ شعرائے اُردو از میر حسن اور قاموس المشاہیر جلد اول صفحہ ۲۹۹ سے حاصل ہوئی ۔

۴۰ ۔ ہمدانی

اس کا اصلی نام محمد رضا تھا ۔ شاہنشاہ بہادر شاہ کے زمانہ میں ہندوستان آیا اور قزل باش کا خطاب پایا ۔ مبارز خاں حاکم حیدرآباد اور بعد وفات اسکے نظام الملک کی ملازمت میں رہا ۔ بمقام دہلی ۱۷۴۶ء مطابق ۱۱۵۹ھ فوت ہوا ۔

موسیقی سے خوب واقف تھا۔ اس نے اکثر ہندی دوہے اور فارسی غزلیں جو موسیقی پر پوری اترتی ہیں، تصنیف کی ہیں۔ اُمید تخلص تھا۔

(قاموس المشاہیر جلد دوم، صفحہ ۱۴۲)

۴۱ - عزلت

میر عبدالولی نام۔ عزلتؔ تخلص۔ سید سعد اللہ سلونی کے بیٹے اور شاہ پیر محمد سلونی کے نواسے تھے۔ سید سعد اللہ سفرِ حج سے واپسی پر قصبہ سلون کی بجائے سورت میں رہنے لگے۔ میر عبدالولی کی نشوونما وہیں سورت میں ہوئی۔ اپنے والد سے علوم فنون کی تعلیم پائی، اور مدتوں درس دیتے رہے۔ طبیعت میں تیزی اور چہل کی خداداد تھی۔ پہلے فارسی اور اردو میں شعر کہتے تھے، پھر بھاشا میں کہنے لگے۔ بھاشا میں دوہے کبت۔ بھولنے، سوال و جواب۔ بارہ ماسے۔ مکرنیاں پہیلیاں سبھی چیزوں میں طبع آزمائی کی اور ہر ایک چیز کو سلیقہ سے کیا۔

موسیقی کا شوق ہوا تو زیر و بم اور تال سُر میں مہارت پیدا کی۔ ساز و قانون سرود وغیرہ میں سب سے آگے نکل گئے۔ اس زمانے کے اچھے اچھے گویے ان کے سامنے کان پکڑتے تھے۔

مصوری میں وہ کمال دکھایا اور رنگ و روغن میں ایسی صفائی پیدا کی کہ اس فن کے ہم عصر ان کے ہاتھ کی کھینچی ہوئی تصویروں کو دیکھ کر محوِ حیرت ہو جاتے تھے۔ غرض کہ جامعیت اور ہمہ دانی میں اپنے بہت سے ہم عصروں میں ممتاز تھے۔

(گلِ رعنا صفحہ ۹۶ - ۹۷)

۴۲ - شاہ عالم ثانی

دہلی کا بادشاہ تھا۔ اس کا اصلی نام عالی گہر تھا۔ شہنشاہ عالمگیر ثانی کا لڑکا تھا۔ زینت محل عرف لال کنور کے بطن سے ۱۵ رجب ۱۱۳۹ھ مطابق ۱۷ ذیقعدہ ۱۱۴۰ھ

پیدا ہوا۔ اس نے ۲۳ر اکتوبر ۱۷۶۴ء کو انگریزوں کے ہاتھ سے صوبہ بہار نکالنے کے لئے بکسر کی مشہور لڑائی لڑی مگر شکست کھائی اور الہ آباد چلا آیا۔ اور ۲۵ر دسمبر ۱۷۷۱ء کو دہلی پہنچا۔ ۱۰ر اگست ۱۷۸۸ء کو غلام قادر خاں روہیلہ سردار نے اس کو اندھا کر دیا۔

شاہ عالم کو شعر و سخن سے بہت دلچسپی تھی۔ خود بھی شعر کہتا تھا۔ فارسی اور اُردو میں آفتاب اور بھاشا میں شاہ عالم تخلص کرتا تھا بعض اوقات اردو فارسی میں بھی شاہ عالم لکھ دیتا تھا۔ اس نے اُردو فارسی اور ہندی میں اتنا کہا کہ ایک دیوان فارسی۔ ایک دیوان اردو، اور ایک مجموعہ کلام ہندی اب تک یادگار ہے۔ ہندی کلام کا مجموعہ کتب خانہ عالیہ رام پور میں محفوظ ہے۔ یہ خود بادشاہ کے حکم سے ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۷ء میں مرتب کیا گیا تھا اور شاید خود اسی نے اس کا نام "نادراتِ شاہی" رکھا۔

چوں کہ شاہ عالم ہندوستان کا بیٹا تھا اس لئے اس کی مختلف نظمیں ہولی۔ دیوالی وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ اس کی شاعری جذبات کی شاعری ہے۔ جو کچھ دل پر گزرتی ہے اسے سادہ طریقے سے بیان کر دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کلام میں شان و شکوہ کم مگر اثر زیادہ ہے۔

"نادراتِ شاہی" میں بادشاہ نے اکثر نظموں کو راگ اور تال میں باندھ کر شروع میں اس راگ اور تال کا نام لکھوا دیا ہے جس سے کتاب کی اہمیت دو چند ہو گئی ہے۔

نمونہ کلام سٹھنیاں

چھاتی دکھاوے آنکھ لڑاوے بولت بول بڑھاوا

سمدھن آئی سمدھی کے ڈھنگ لے کر ہاتھ چڑھاوا

صاحب محل جب بن ٹھن آئیں ساجے سکل سنگار

پکڑ ہاتھ سمدھی نے ڈالا گل پھولن کا ہار

سمدھن حوض کنارے بیٹھی دیکھے چھٹنا پھُہارا
ہنس ہنس کے سمدھی نے، اُس کے ہاتھ دیا پُھہار

دوہے

مانگت یا ہی رسول، سنو تم نیک نگاہ اتنے کر لیجے
شاہ عالم نایب راور وہ اب جی کی مراد سبے بھر دیجے

حضرت قطب الدین کی دیکھ جب لاگی جوت
شاہ عالم پادشاہ کی اِنچھا پوُرن ہوت

خواجہ معین الدین کے آئے ہم دربار
پائیں مرادیں جیہ کی لاگے ناہیں بار

مانگت تم سوں، آج میں حضرت خواجہ پیر
شاہ عالم کو دیجے مال، مُلک، من دھیر

سوّیا

ہو تم پیر، مُرید میں تیرو ہوں رین دِناں تمرے گن گاؤں
تاج اب تخت دیو سب راج تیں تو شاہ عالم شاہ کہاؤں
چاہت ہوں جگ میں اتنی اب سوُ سکھ سوں کہہ تو ہی سناؤں
نیک نگاہ رہے نت ہی اور جی کی مراد سبے ہم سو پاؤں

ہولی

ہوری کھیلت سرک سرک جات ساری بار بار سنوارت سُگھر ناری
ناچت پیاری سبھ سنواری۔ باجت تاری گھنگھرو کی جھنکاری

کھیل مچا رہی سرب پساری۔ گہوں کہاری۔ آتش بکاری چھب نیاری
ایکے چھپورت پچکاری۔ ایکے نولاسی ناری۔ پھگوا مانگت دے دے گاری

دوہا

آج رنگ کھیل آئیں سکل برج کی ناری
چوواچندن عبیر گلال اور پچکاری رنگ ماری

آؤ بینم تم میرے مدھ ماتے نیر جاؤ گے بیچ بھی بھور
کون تیا سنگ رین بتائی نہ جانوں کو نہ کے تم رہے ٹھور

چمک تیا کے روپ کی لیت بجا کو چین
نتھ کے موتی نرکھ سکھ نہ بھکے کا کے نین

۴۴۔ نواب مہربان خاں۔ رند

نواب مہربان خاں رند دیوان فرخ آباد بڑے مہمان نواز۔ آشنا پرور اور خوش اخلاق امیر تھے۔ باوجود ایں کہ علم نہیں رکھتے تھے مگر اہل کمال کی صحبت میں معلومات بہت وسیع ہو گئی تھیں۔ میر سوز مدت تک ان کے پاس رہے۔ ان سے شاعری۔ تیر اندازی اور شمشیر شناسی وغیرہ کی مشق کی تھی۔ موسیقی میں بہت ماہر تھے اور کبت بہت اچھے کہتے تھے۔ (گل رعنا صفحہ ۱۳۵)

مصحفی اپنے تذکرہ ہندی میں کہتے ہیں کہ:۔

"اگرچہ شخص جاہل بود۔ اما سلیقہ صحبت شعرا اور اہم بعرصۂ قلیل مرتبہ وا لے شاعری رسانیدہ"

میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ:۔

"بہ اہل سخن ہمیشہ سرگرم سخن و با صاحب ہر فن چوں روح

در فن۔ محسن بہ حسنِ اخلاق و در فنِ موسیقی و شاعری ہندی کہ عبارت از کبت ہا باشد طاق۔"

(تذکرہ میر حسن۔ صفحہ ۷۵)

۴۴۔ انجام

امیر خاں نواب۔ لقب "عمدۃ الملک"۔ انجام تخلص۔ شاہ نعمت اللہ ولی کی اولاد میں، اور محمد شاہ رنگیلے کے مخصوصین میں تھا۔ اس کی نسبت سید فتح علی حسینی اپنی تصنیف "تذکرہ ریختہ گویان" میں لکھتے ہیں کہ:

"نواب امیر خاں عمدۃ الملک انجام عفرہ الملک السلام شاگردِ مرزا بیدل مرحوم، در فارسی و ریختہ گوئی۔ و ہندی و علم موسیقی و لطیفہ و بدیہہ سرائی و حاضر جوابی و ہمہ کلمات بے بدل بود۔"

افسوس کہ ان کا ہندی کلام دست یاب نہیں ہو سکا۔ ۲۶ دسمبر ۱۷۴۶ء میں محمد شاہ نے ان کی حد سے بڑھی ہوئی بے باکی کے سبب ناراض ہو کر قتل کرا دیا۔

۴۵۔ شاہ جہاں

مغل بادشاہوں نے ہندی زبان پر جو احسان کیا ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں۔ اکبر اور اس کی اولاد ہندی سے محبت رکھتی تھی۔ اس ضمن میں ہندوستان کے مشہور محقق اور مصنف جناب امتیاز علی خاں عرشی ناظم کتاب خانہ عالیہ ریاست رام پور "نادراتِ شاہی" کا دیباچہ لکھتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

"شاہ جہاں خود ہندی کا شاعر تھا۔" (دیباچہ نادراتِ شاہی صفحہ ۲)

افسوس کہ شاہ جہاں کے ہندی کلام کا مجموعہ نایاب ہے۔

(بزمِ تیموریہ صفحہ ۲۱۱)

۴۶ - خواجہ میر دردؔ اور رنجؔ

جناب۔ امتیاز علی خاں عرشی "نادراتِ شاہی" کے دیباچہ میں صفحہ ۳ پر لکھتے ہیں کہ :-

محمد شاہ کے زمانے میں محفلِ حال و قال کے سجادہ نشین تک موسیقی کے ماہر ہونے لگے تھے۔ خواجہ میر دردؔ جو اس وقت کے بڑے ممتاز صوفی اور صاحبِ سجادہ تھے ہندی موسیقی کے اتنے بڑے اُستاد تھے کہ گویّے اور کلاونت اپنی چیزیں اصلاح کی غرض سے اُن کی خدمت میں پیش کیا کرتے تھے۔ یہی حال اُن کے نواسے میر مہدی رنجؔ کا تھا کہ بڑے بڑے اُستاد اُن کے سامنے کان پکڑتے اور خاک چاٹ کر نام لیتے تھے۔"

اس عبارت سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ خواجہ میر دردؔ اور رنجؔ دونوں اردو کے علاوہ ہندی میں بھی شعر کہتے تھے۔

۴۷ - قاضی عبد الغفار - غفاؔ

یہ صوفی منش بزرگ موضع رہوئی، ضلع پٹنہ کے رہنے والے تھے۔ اُن کی صرف ایک تصنیف "جواہر الاسرار" ملتی ہے جو ۱۱۱۶ھ میں تصنیف کی گئی ہے۔ ہندی دوہے خوب کہتے تھے۔ چند دوہے بطور نمونہ درج کیے جاتے ہیں۔ ؎

آگ بٹے تن پیم کے جل بل بوجھو جیو | کہے غفا تم آگ موں رے جو پایا پیو

کہے غفا سیہ خوب سے جگ موں ایہی پاپ
پر گٹ ہوا میوا کچھ لوگ کہا دیں آپ

غفا سمندر پیم کا دیکھا غوطہ مار | جو تھے موتی پریم کے آئے ہمارے ہاتھ

بھیجا پوتھی پریم کی تا لوں دھر قرآن — مانک ماتھ سمائے کے آپی مانجھ آن

اُٹھ پردیسی کیا سوا نین ہیم جل دھوئے — دور گئے سبھ سنگ تو ن رہا اکیلا سوئے

تن کا تانبا آگ ہوں پانی کرے جو کوئے — ڈارے بوٹی پریم کی تب جائے کنچن ہوئے

پریم پنتھ موں ایک ہے سن مسجد اور دیر — جب دیکھا تب پیا کوں نہ آیا غیر

لوگ باورے پیا کوں ڈھونڈیں دیس بدیس — پیا پرگٹ جگ ماتھ ہے آپے مانک بھیس

چوپائی

کہے غفا جن دیکھا دوئی — پریم پنتھ موں مشرک ہوئی

کہے غفا جن آپ بھلایا — تن سائیں کا درشن پایا

(بہار اور اردو شاعری صفحہ ۱۹)

۴۸۔ احمد گجراتی

احمد کی نسبت میر حسن اپنے تذکرہ میر حسن میں صفحہ ۴ پر یوں رقم طراز ہیں :-

"احمد گجراتی دیگر در زبانِ سنسکرت و بھاکا می گویند کہ تصانیف بسیار دارد۔ چوں معاصرِ شاہ ولی اللہ دلی بود۔ دو سہ۔ ریختہ نیز گفتہ"

افسوس کہ اس کا ہندی کلام دست یاب نہیں ہو سکا۔

میر تقی اور شفیق نے اس کو احمدی لکھا ہے۔ لیکن قائم شوق اور حسن نے احمد گجراتی لکھا ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

۴۹ ۔ خوشنُود

ملک خوشنود محمد عادل شاہ کا درباری شاعر تھا۔ اس نے سلطان مذکور کی فرمائش سے ۱۰۵۰ھ میں امیر خسرو کی مشہور مثنوی "ہشت بہشت" کا منظوم ترجمہ دکنی زبان میں کیا۔ میر حسن دہلوی ان کی نسبت یوں فرماتے ہیں :۔

"خوشنود تخلص مرد دکنی بود۔ احوالش معلوم نیست۔ او راست ؎

سب رین جاگی سیج پر تو بھی سجن آیا نہیں
چھپ چھپ کے دیکھی باٹ میں رہنی کو دکھلایا نہیں

میر تقی میر نے بھی نکات الشعرا میں صفحہ ۱۰۲ پر خوشنود کا صرف یہی شعر نقل کیا ہے۔

۵۰ ۔ لُطفی دکنی

لُطفی دکنی لُطفی تخلص۔ از قدیم است۔ او راست ؎

تجھ عشق کی اگن سے شعلہ ہو جل اٹھا جیو ۔۔۔ دل موم کے نمونے گل گل پگھل گیا ہے
میں عشق کی نگی ہن پل پڑا ہوں تس پر ۔۔۔ جو ین کا ماتا آ کر مجھ کو کھندل گیا ہے

(تذکرہ شعرائے اردو از میر حسن صفحہ ۱۴۳)

۵۱ ۔ وَلی دکنی

سید محمد فیاض نام۔ ملا محمد باقر آگاہ نے مرآۃ الجنان کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ ویلوران کا وطن تھا، عالمگیر کے زمانے میں گزرے ہیں۔ دکن میں بمقام سات گڑھ امیر سراست خاں کی رفاقت میں عرصہ تک رہے۔ پھر وہاں سے نکل کر کڑپہ میں چلے آئے۔ یہاں کے صوبہ دار نواب عبد المجید خاں نے ان کی بڑی قدر کی اور ملازمت دے کر سد صوت میں تعینات کر دیا۔ یہ واقعات ولی نے "رتن پدم" کے دیباچہ میں بیان کئے ہیں، ان کی تصنیفات میں سے اس وقت دو کتابیں ملتی ہیں۔ رتن پدم اور روضۃ الشعرا۔ رتن پدم

کی ابتدا یوں ہوئی ہے ؎

خدایا تو ہے پاک پروردگار	نرنکار د آنار و آچھی انار
دلی تیرے کرم کی ہے مجھے آس	نہ کر اُس آسوں ہرگز تو نیراس

(اردوئے قدیم صفحہ ۱۰۰)

برا گی جو کہلاتے انھیں گھر بار کرنا کیا	ہوئی جوگن پیو کی اب اُسے سنسار کرنا

(ہماری زبان یکم ستمبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۱۶)

۵۲۔ مرزا سوداؔ

مرزا محمد رفیع نام۔ سوداؔ تخلص۔ ان کے آبا و اجداد کابل کے باشندے تھے، ان کے والد مرزا محمد شفیع ایک تجارت پیشہ بزرگ تھے جو کابل سے ہندوستان میں آئے اور دہلی میں قیام کیا۔ مرزا صاحب ۱۱۲۵ھ مطابق ۱۷۱۳ء کو بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ پرورش اور تعلیم دہلی میں ہوئی۔ پہلے سلیمان قلی خاں ودادؔ اور پھر شاہ حاتمؔ کے شاگرد ہوئے جہاں یہ اُردو کے مسلم الثبوت اُستاد اور اقلیم سخن کے شاہنشاہ تھے۔ وہاں ہندی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے ۱۱۹۵ھ مطابق ۱۷۸۱ء میں وفات پائی۔ نمونہ کلام ؎

دوہا

اند گیر دسے کپڑے رنگے مکھ پر ملے بھبھوت

پوچھیں بی بی فاطمہ کت گیئو میرو پوت

جو میں ایسی جانتی چھوڑ جائے گا وہ	تو نبرے میں بیاہ کو پل نہ چھوڑتی توہ

(ہماری زبان یکم ستمبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۱۶)

۵۳۔ بحری دکنی

یہ دکن کے ایک صوفی منش بزرگ تھے، ان کا نام قاضی محمود اور والد کا نام بحرالدین

تھا جو قاضی دریا کے لقب سے مشہور تھے۔ قصبہ گوگی جو نصرت آباد کے مضافات میں واقع ہے، ان کا وطن تھا۔ ۱۰۹۵ھ کے قریب اپنے وطن سے بیجاپور چلے گئے۔ ۱۰۹۷ھ میں حیدرآباد چلے آئے۔ انھوں نے ایک مثنوی "من لگن" دکنی زبان میں لکھی ہے اور رنگ زیب عالمگیر کے عہد میں ۱۱۱۲ھ میں تمام ہوئی۔ نمونہ کلام ؎

اے روپ نہارتی رتی ہے	پربت پربت پتی پتی ہے
پربت میں اوہک نہ کم تتی میں	یکسا ہے راس ہورتی میں
ساگر تو نہ سرمہ داں میں ماگا	صندوق میں سو کیوں سماگا
طوفان تنک سسن کی تو ہیں	سحر وا ایک آنکھ کے انجو ہیں
ہر بول میں معرفت کی بانی	سیتا کی نہ رام کی کہانی
تھا پور رجو یک بڑا پٹارا	سو بھاگ نگر میں کھوے سارا
سب جگ کو دیا پو گیاں پوگن	تب ہاو گنہا پو پو پھول چن چن

ہجری تھے یہی کتک برس تھے
بارہ اوپر ایک سو سہس تھے

۴۵۔ غمگین

مفتی مولوی عبدالقادر خاں نام غمگین تخلص۔ والد کا نام مرزا محمد کرم آشنا تھا۔ برلاس پور میں پیدا ہوئے چودہ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہو کر ۱۸۰۹ء میں بمقام مراد آباد سرکاری کمپنی کی ملازمت میں داخل ہو گئے۔ لارڈ ولیم بنٹنگ نے صدر الصدور کر دیا۔ ۱۸۳۸ء میں ملازمت چھوڑ کر دہلی چلے گئے اور شاہ ظفر کے پاس چھ مہینے رہے۔ پھر ریاست رام پور میں عدالت دیوانی و فوجداری پر مفتی مقرر ہوئے۔ اردو۔ فارسی۔ بھاشا اور مرہٹی چار زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ رجب کی ساتویں تاریخ ۱۲۶۵ھ کو رام پور میں انتقال کیا۔ افسوس کہ ان کے ہندی کلام کا نمونہ نہیں مل سکا۔

(تذکرہ کاملان رام پور صفحہ ۲۳۴)

۵۵۔ حافظ بُدھن

آپ کا نام بُدھن اور تخلص شیفتہ تھا۔ فارسی اور ہندی میں شعر کہتے تھے۔ تذکرہ کاملانِ رام پور میں صفحہ ۱۰۳ پر ان کے نام کے ساتھ "سر آمدِ شعرائے فارسی و ہندی لکھا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ فارسی کے علاوہ ہندی کے بھی ممتاز شاعر تھے، نمونہ کلام نا پید ہے۔ تذکرہ کاملان رام پور (صفحہ ۱۰۳)

۵۶۔ محبوب عالم عرف شیخ جیون

شیخ جیون گیارھویں صدی ہجری میں بمقام جھجھر پیدا ہوئے۔ ان کے حالاتِ زندگی پردۂ اخفا میں ہیں صرف اسی قدر پتہ چلتا ہے کہ یہ سید میراں بھیک چشتی صابری متوفی ۱۱۳۱ھ کے مُرید اور خلیفہ تھے۔ یہ فارسی کے علاوہ ہریانی (ہندی) میں بھی شعر کہتے تھے۔ یہاں چہ رسول اللہ کی وفات پر حضرت عائشہ حضرت فاطمہ کی طرف سے مرثیے لکھے ہیں اور اُن کو دوہرے کا نام دیا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہوے

سُکھ چین کے گھر سووتی لاگا کلیجہ نیر اب

دُکھ نین بھر بھر رووتی بھاری پڑی ہے بیڑ اب

جانی بنا گوئی بھئی جر جر سبی ہوں کو بلا

تن ماں لگی ہے لو گٹی دل کا گیا دلمیر اب

لِسدن پکاروں ایکلی بپو بن سبھی تن بے کلی

آنسوں بھراں نینوں رہا نہ نیر اب

بپو چاہ چاہے جیو یہ پیو بن نہیں کچھ جیو

جیکوں کو تجوں بپکوں لہوں کیسی اُٹھی ہے پیر اب

پک پکسبڑی تھک گری ٹوٹا تنگ نا ہیں رہا

محبوب عالم نیہہ کی پاوں پڑی زنجیر اب

انھوں نے ہریانی ہندی میں درود نامہ اور محشر نامہ اپنی یادگار چھوڑے ہیں
درود نامہ کا افتتاحیہ دیکھیے ؎

جپوں میں پہل نام رحمٰن کا | تپوں گیان میں دھیان سبحان کا
وہی ہے جو کرتار عالم خدا | نرنجن نرنکار سب سے جدا

حضرت عمر کی طرف سے دوہرے دیکھیے ؎

محمد نیہہ کی پھانسی گئی گر مانہ سے ہانسی
گئی ہے ٹوٹ کر پھانسی کسے یہ حال دکھلاؤں
لگن لاگی نپٹ گاڑھی محمد بیت نہیں یادہی
یہی ہے جیوماں بھادی محمد نانوں نت گاؤں

(پنجاب میں اُردو - صفحہ ۱۹۱ و ۱۹۲)

۵۷ - میر جعفر زٹلی

میر جعفر نام ۔ زٹلی تخلص ۔ یہ قصبہ نارنول کے سید تھے ۔ والد کا نام سید عباس تھا ۔ اورنگ زیب کی تخت نشینی اور میر جعفر کی ولادت ایک ہی سال میں واقع ہوئی ۔ کم سنی ہی میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا ۔ چچا نے جن کا نام میر سرور تھا سرپرستی کی مکتب کی تعلیم پانے کے بعد شہزادہ اعظم شاہ پسر عالم گیر کی ملازمت میں داخل ہو گئے ۔ شاہ فرخ سیر کی تخت نشینی کے موقع پر ایک ہجو آمیز نظم لکھنے کی وجہ سے بحکم بادشاہ مذکور ۱۷۱۳ء مطابق ۱۱۲۵ھ میں قتل کیے گئے ۔

میر جعفر ہزل گوئی اور بذلہ سنجی میں مشہور تھے فارسی اور ہندی میں شعر کہتے تھے ، بعض ہجویہ نظموں میں فارسی اور ہندی ملی جلی ہے ۔ مثلاً ؎

جہاں ہوئے ایسا کلچھن کپوت | لگے خلق کے منہ کو کالک بھبھوت

کتا کٹ ڈلا ٹٹ مست ہر سو | چھٹا چھٹ ومیٹا پھٹ ہست ہر سو

میر جعفر ہندی کے محاورے بھی خوب استعمال کرتے تھے۔ مثلاً :-

اندھے کی جورو کا خدا رکھوارا ۔۔۔ دُم جو پکڑی بھیڑ کی وارا ہوا نہ پارا

بہرے آگے گاونا گونگے آگے گل ۔۔۔ اندھے آگے ناچنا، یہ تینوں آل بل

ہندی کلام کا نمونہ دیکھئے :-

جنھوں گھر جھومتے ہاتھی، ہزاروں رین دِن ساتھی

تنھوں کو خاک اب کھائی کہ آخر خاک ہو جانا

ٹکتی باندھتے باگاں محل ہیں رنگ اور راگاں

وہاں ہیں بیٹھتے کاگاں کہ آخر خاک ہو جانا

ہزاراں شہر کے راجا جنھوں مکھ چاند سے لاجا

نقارہ موت کا باجا کہ آخر خاک ہو جانا

(پنجاب میں اُردو صفحہ ۱۹۵)

۵۸۔ محمد امین

یہ عالم گیر بادشاہ کے زمانے میں ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنی مثنوی یوسف زلیخا ۱۱۰۹ھ میں گوجری ہندی میں نظم کی ہے۔ :-

سُنو مطلب لے ہے اب یو امیں کا ۔۔۔ لکھی گوجری منے یوسف زلیخا

ہریک جاگے ہے قصہ فارسی میں ۔۔۔ امیں اس کو اُتاری گوجری میں

کہ بوجھے ہر کدام اس کی حقیقت ۔۔۔ بڑی ہے گوجری جگ بیچ نعمت

۵۹۔ نواز اور دیوا

نواز ایک مسلمان شاعر نے اورنگ زیب کے لاڈلے فرزند محمد اعظم شاہ کی خواہش سے ۱۰۸۰ھ میں شکنتلا ناٹک لکھی اس شہزادے کے حکم سے مختلف گویوں نے مل کر مشہور

شاعر بہاری کی "ست ستی" کی تدوین کی۔ یہ نسخہ اشاعت اعظم شاہ کے نام سے منسوب ہے
ہندی کا مسلمان شاعر دیوا شاہ عالم اوّل سنہ ۱۱۲۴ھ کے دربار سے منسلک تھا۔

(پنجاب میں اردو صفحہ ۱۱۸)

۶۰۔ سید میراں بھیک چشتی

سید محمد سعید الملخاطب سید میراں بھیک چشتی صابری عہد عالم گیر کے بزرگ ہیں۔ ان کا انتقال سنہ ۱۱۳۱ھ میں ہوتا ہے۔ ہندی زبان کے قابل شاعر تھے۔ قوال ان کے اشعار ابھی تک گاتے ہیں۔ ان ہی کے مرید محبوب عالم عرف شیخ جیون ہیں۔

(پنجاب میں اردو صفحہ ۱۱۸)

چشتی صاحب کے علاوہ اس زمانے میں یعقوب خاں۔ عبدالرحمٰن نے عہد فرخ سیر میں تالیف کی۔ سید پہاڑ خلف سید پہاڑ اور سلیمان بھی ہندی کے مشہور شاعر گزرے ہیں۔

یعقوب خاں نے بندیلی ہندی میں کتاب "رس بھیوشن" لکھی "نکھ سکھ" مرزا عبدالرحمٰن نے عہد فرخ سیر میں تالیف کی۔ سید پہاڑ خلف سید حمزہ "رتناکر" ایک طبعی تالیف کے مصنف ہیں۔ شیخ سلیمان ایک معراج نامہ موسومہ بہ خالق نامہ کے ناظم ہیں۔
شیخ خوش محمد قادری متوفی سنہ ۱۱۲۰ھ فارسی و ہندی کے معقول شاعر تھے۔
افسوس کہ دست بردِ زمانہ کے ہاتھوں ان حضرات کا ہندی کلام محفوظ نہ رہ سکا۔ (پنجاب میں اردو صفحہ ۱۱۸)

۶۱۔ شیخ نصیر الحق

شیخ نصیر الحق، شیخ فاضل الدین کے مرید تھے۔ یہ فارسی۔ ہندی۔ پنجابی اور اردو کے شاعر ہیں۔ نصیر اور نصیر تخلص کرتے تھے۔
نمونہ کلام ملاحظہ ہو:۔

جوگن بھئی میں اے پیا ہو ہو تیری پکاری

فاضل سائیں پیا وہ پہو تیں اب تو بازی ہاردی

ہیڑے پڑے برہوں اگن جلنا پڑا بھر ین دن

مجھ کو بتا وہ وہ سجن دے وے خبر وار دی

راکس برہوں جب آئیا اس ماس سب چن کھائیا

اب ہاڈ کھاون تھائیا جو کب ہے اس خونخوار دی

دیو و دکھائی اے پیا تم بن سکوں کیوں کر جیا

برہوں مجھے بے کل کیا طاقت نہیں اس بھار کی

نس دن مجھے ہے رووناؔ اور دو مجھے جی کھونا

یہ موکھ لہو سیتی تھو دنا شتہ لگی ہے سار کی

کہہ اے نصیر اکیا کروں برہوں کی چکھیں جوڑیں

جھرتے نہ ہرگز دم بھروں یہ تھور نا گفتار کی

(پنجاب میں اردو صفحہ ۲۵۵-۲۵۶)

۶۲- فقیر اللہ

فقیر اللہ خانوادۂ نوشاہیہ سے بیعت ہیں اور شاہ امانت کے مُرید ہیں آپ مثنوی "دو پستوں" کے مصنف ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جو تصوف پر لکھی گئی ہے ۔ بہر حیوں کے طور پر اس میں دوہرے لائے گئے ہیں ۔ اس کی تاریخ تصنیف ۱۲۰۴ھ ہجری ہے ۔ اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے ۔

اللہ ثنا تیرے گن گاواں	ہردم تیرا نام دھیاواں
انند بھی ست گرس پایا	اچھا جاپ جس مجھے بتایا
کنت گنزا نے کیا پسارا	سوہنگ آہنگ آئے پکارا
اچھا جاپ جپاوے کو سوئے	جس کا ہردا نرمل ہوئے

باہر سو بھیتر اُدر آہنگ	اچھا جاپ ہے سوہنگ آہنگ
آپی ہر جی آپی توں	اُنا اُنا ہو بولیں توں
ہُو جاپ سے پاویں سُکھ	بن ہُو اور سبھی ہے دُکھ
ہُو جاپ ہے چوتھے پد کا	سا ہد و پاوے بھید اس جا کا
شاہ امانت بھید بتایا	تو ہیں انحد ناد بجایا

(پنجاب میں اردو صفحہ ۳۰۳-۳۰۴)

۶۳۔ رحمت شاہ

رحمت شاہ مثنوی شیریں فرہاد کا مالک ہے، جس میں ہر نو دس اشعار کے بعد بند کے طور پر دو ہرے آجاتے ہیں۔ اس مثنوی کی زبان بھاشا اور پنجابی آمیز ہے، اور لطف یہ ہے کہ کبھی پنجابی غالب ہے اور کبھی برج۔ رحمت شاہ نے اپنے متعلق کچھ نہیں لکھا تھی کہ ہم کتاب کے نام و تاریخ نیز مصنّف کے زمانے سے بھی بے خبر ہیں پوری وہ اپنا وطن بتاتا ہے۔ جہاں جگدیو کا استھان ہے، یہاں اس کے والدین آباد ہو جاتے ہیں اس کے والد نے سات مرتبہ حج کیا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو

اوّل نام صاحب کا لیجے	پاچھے تے سب کا رج کیجے
جیو جنت جو اس او پاوے	ہر ہر کرت سنگ لا ئے
اوہ داتا سبھن کا سائیں	پالے سبھن کو ہر جائیں
اوس مہان کیا کہوں بکھانو	اوسی جوت کی کلا نجانو
ہر ہر میں ہر ہے ہر جاتا	کون کرے ہر بن بیہ ناتا

اک نگر اُتّن بسے سہاوا	نگر بیچ تاں لوک ملاوا
پوری نام جگدیوا استھاناں	نگر لوک ات بہتر سُبھاناں
مات پتا ہمرو جب آیو	ایس نگر استھان بنایو

ہت نا بار حا جی ادہ بھئے   پھر جائے مدینے رہے

دوہا

انت کال اس نگر میں آئے کیا بسرام

سب کارج پورن ہوئے نال رب دے نام

(پنجاب میں اردو صفحہ ۳۰۵ - ۳۰۶)

۶۴ - پٹھان سلطان

شری رام چندر شکل نے اپنی تصنیف " ہندی ساہتیہ کا اتہاس "، کے صفحہ ۲۴۶ پر ہندی شاعر پٹھان سلطان کا ذکر کیا ہے لیکن اُن کے حالات سے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ فرماتے ہیں :-

" بہاری ست سئی کی بہت سی ٹیکائیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں پٹھان سلطان کی کنڈلیاں ان دوہوں پر بہت اچھی ہیں لیکن ادھوری ہیں "

اسی ضمن میں شکل جی نے دوسری ٹیکاؤں کا ذکر کرتے ہوئے سردار کوی کی ٹیکا کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن سردار کوی کی نسبت کچھ نہیں لکھا۔ ہاں یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ سردار کوی بھی ہندی گو شاعر تھے۔

۶۵ - گُل

مرزا اکبر علی خاں نام۔ گُل تخلّص۔ گل کے علاوہ نگار تخلّص بھی کرتے تھے۔ نیز ہندی کلام میں پھول تخلّص لاتے تھے۔ سکونت جے پور۔ کلیات گل $\frac{۱۷×۲۷}{۴}$ سائز کے ۷۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ میر تقی میر سے تلمذ ہے۔

جناب احترام الدین احمد شاغل مرحوم نے آپ کا ہندی کلام نمونۃً عطا فرمایا جو ہدیۂ ناظرین ہے :

اے گل تو میری بات سکھیاں انجان ... [illegible]

نکسا جائے پران مورا بن دیکھے تیرے
ایک پل کل نہ آئے جیا بے کل ہیں میرے

کہے بلبل سن پھول بچھڑ جو تو سے جاؤں
چاندنی کا سا جوگ تجھے میں کر دکھلاؤں
مل جاویں سب پنکھڑی گل کی ماٹی ماہیں
یہ دن چار بہار کے سپنا سا ہو جائیں
سپنا سا ہو جاویں گے دن جب پچھتاوے
سارا جگ تو ڈھونڈ پھری گل کو نہ پاوے
سن بلبل کہے پھول پھرے تو بھٹکی بھٹکی
پیچھے تنکے کسل جائیں سب تو سے کٹکی

آگ برہ کی ڈھا سے پل بھر میں سو بیر
سدا مورا تن بھیا جل بل راکھ کا ڈھیر
جل بل راکھ کا ڈھیر بھیا ہیں کارن تیرے
تن کے ماہیں چین پڑے نا کل من میرے
سن بلبل کہے پھول پریت جو تو کو ہوتی
پل آتے کل ناہ پریت ساری کھوتی

۶۶۔ دریا صاحب (بہار والے)

جن دنوں مارواڑ والے دریا صاحب موجود تھے انھیں دنوں بہار میں بھی ایک دریا صاحب نام کے بزرگ ہوئے۔ ان کی ولادت سمت ۱۷۳۱ بکرم میں "دھرکندھا" ضلع آرا نامی گاؤں میں ہوئی۔ کچھ لوگوں کا بیان ہے کہ یہ مسلمان تھے۔ لیکن دریا پنتھی

لوگ ان کو کھشتری بتاتے ہیں۔ کہتے ہیں خدا نے سادھو کے لباس میں ان کو درشن (دیدار) دے کر نام اور بھجن کا راستہ بتایا تھا۔ ان کے مرید ان کو کبیر کا اوتار مانتے ہیں۔ ۱۰۸ برس کی عمر پائی۔ کلام نمونہ دیکھئے:۔

دوہا

دریا دل دریا ؤ ہے اگم اپار بے انت
سب مہنگ تُم تُم میں سیجھے جانی مرم کوئی سنت

جنگم جوگی سیوڑا پڑے کال کے ہاتھ
کہہ دریا سوئی باچی ہے جو ست نام کے ساتھ

(رسالہ کلیان گورکھپور کا یوگ انک شراون سمت ۱۹۹۲ مطابق سنہ ۱۹۳۴ صفحہ ۹۶)

دریا صاحب (مارواڑ والے)

آپ مارواڑ کے "جے ہارن" نامی گاؤں میں بھادوں کرشن اشٹمی سمت ۱۷۳۳ بکرم کو پیدا ہوئے۔ سات برس کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ بعد میں آپ کی پرورش آپ کے نانا نے "رین" نامی گاؤں میں کی۔ پھر ساری عمر آپ اسی جگہ قیام پذیر رہے۔ آپ کے گورو پریمی جی تھے۔ وہ ایک صاحب کشف و کرامات صوفی بزرگ تھے۔ کہتے ہیں انھوں نے مارواڑ کے راجہ رنجیت سنگھ کو ایک مہلک مرض سے نجات دلائی تھی۔ دریا صاحب ۸۲ برس کی عمر پا کر راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ ان کے ہزاروں مرید مارواڑ میں موجود ہیں۔ ذیل میں نمونۂ کلام ملاحظہ ہو جس میں دریا صاحب فرماتے ہیں کہ سچا امرت کیا ہے اور کہاں ہے۔

امرت نیکا کہے سب کوئی	پیئے بنا امرت نہیں ہوئی
کوئی کہے امرت بسے پتال	نرک انت نت گراسے کال
کوئی کہے امرت [illegible]	[illegible]

کوئی کہے امرت سسی ہیں باس | گھٹے بڑھے کیوں دوا ہے ناس
کوئی کہے امرت سُرگاں ماہیں | دیوپتیں کیوں کھر کھر جاہیں
امرت ہے سنتن کے ساتھ | موکش پدارتھ جن کے ہاتھ

درؔیا امرت نام انت
جا کو پی پی امر بھئے سنت

رسالہ کلیان گورکھپور کا یوگ انک . . . شراون سمت ۱۹۹۲ بکرم مطابق اگست ۱۹۳۴ء صفحہ ۱۱

۶۸ - خاکی بابا۔ سید روشن علی شاہ اور سراج الدین شاہ

گورکھپور کے خاکی بابا بڑے مرتاض کامل۔ صاحب کشف و کرامات بزرگ ہوئے ہیں۔ انھوں نے گورکھپور سے نکل کر گمستی کے جنگل میں ڈیرہ لگایا۔ اس جنگل میں خونخوار درندے بہت رہتے ہیں۔ ایک دن مدھیاولی کا راجہ شکار کی غرض سے ادھر آنکلا۔ گھوڑے سے اتر کر باباجی کے قدموں پر سر رکھ کر عرض کی کہ مہاراج میرے گھر میں اولاد نہیں ہے۔ باباجی نے دعا دی کہ اچھا تمھارے گھر میں لڑکا تو ضرور پیدا ہوگا لیکن وہ حکومت نہیں کرے گا۔ یہ کہ کر باباجی نے راجہ کو اپنی دھونی کی وبھوتی پرشاد کے طور پر دے کر رخصت کیا۔ راجہ کے چلے جانے پر ایک شیر سوار ولی فقیر آیا۔ خاکی بابا کی نظر ان پر پڑی۔ شیر سے اتر کر وہ ولی فقیر خاکی بابا کو سلام کر کے یوں گویا ہوا۔

سنت شرومنی تم داں سنی پربھو تور | للچیو پدرج ہیتو سہج من مور
ردھی سدھی من بلراول رہی پجی ساج | پھب چھپ یہ اب نے ہی نہ کاج
سید روشن او دھیا کہہ سب لوگ | ہردے نپٹ اندھیار گون ات یوگ

خاکی بابا نے اس فقیر (سید روشن شاہ) کو اٹھا کر چھاتی سے لگایا اور کہا ؎

تھل میں جل میں نبھ میں من چھت لائے | پی اے کو سید تم واں بسر نہ جائے
جتنی اجھور اہو سے لینے ردھی سدھی ماہیں | جا ہو جی ات تم ہوں بھنگ ستا جن جاہیں

فقیر (سید روشن شاہ) نے کہا۔ مہاراج یہ ماما مرگ راج (شبیر) سراج الدین شاہ نامی میرا مرید ہے، یہ بھی آپ کی عنایتِ خاص کا متمنی ہے۔ اس لئے یہ بھی خدمتِ شریف حاضر ہوا ہے۔

خاکی بابا نے شیر کی طرف دیکھا تو وہ فوراً اپنی اصلی شکل میں آگیا اور خاکی بابا کے قدموں پر گر پڑا۔ اُسے بھی باباجی نے چھاتی سے لگایا اور سید روشن علی شاہ سے کہا یہ تمھارا مرشد ہے، مُرید نہیں ہے۔ یہ سُن کر سید صاحب حیران رہ گئے۔ دوسری طرف گانجے کا چلم جو دھونی کے پاس پڑا تھا، آپ سے آپ کھڑا ہو گیا۔ ملا ملایا تیار گانجا اُس میں بھر گیا۔ چمٹے نے خود بخود دھونی سے آگ اُٹھا کر اُس میں رکھ دی باباجی نے ایک دَم کھینچا اور رکھ دیا، اور اُپدیش کے طور پر کہا ؎

نام گانجا ہیو منوارو

جاکے پی اَت گیان وِرِدھ اُپجت سِدھ ہوت سب کارو

لے ہی بے ساہی کایا گڑھ ہٹیا دُرمتی دل چھنی ڈارو

دیا دھرم جل میل مل ہو بھل سُرتی سرتی سنوارو

ست چلم جھل ست کرنی پریم جمائے سدھارو

دست پناہ بھگتی اَردھارو گورو کو بچن انکارو

دَم پر دَم بھر پی آنو شاہ جی لوک لاج کری نیارو

خاکی باباجی نے یہ اُپدیش کر کے سراج الدین کو چلم دیا۔ سراج الدین دَم لگا کر مست ہو گیا۔ یہ حال دیکھ کر سید روشن علی شاہ دنگ رہ گئے۔ دل میں یہ خواہش گدگدا رہی تھی کہ ایک دم مجھے بھی پینے کو ملا ہوتا۔ اسی خیال میں وہ رونے لگے اور زبان سے یوں گویا ہوئے ؎

دھن دھن تو بھگیا دھن سراج   گیٹی گٹل ادھم موہی آون لاج

یہ سُن کر باباجی بڑے متاثر ہوئے اور کہنے لگے تم بھی پیو۔ سید صاحب نے چلم اُٹھایا اور پینے لگے۔ باباجی نے دونوں کو نصیحت کیا اور کہا کہ اپنے دین میں پکے رہنا

قلبی راحت اسی میں ہے مختلف مذاہب میں مارے مارے پھرنا روحانی اطمینان کھو دیتا ہے۔

اُچار رج سب پنتھ کے ایشور روپ بجھان
تا تے سب ہی مانئے گرہی نج پر ابھی مان
وِرڑ تا نج دھرم ہی بھلو بولے شری بھگوان
شانتی ڈائنی رہنی یہ جانت سنت سجان
بھی منگ کو نیشی کو ؤ آوے تہی گت تا ہی کرد
پرتی پرتیت بھاں جاکی تہاں تا کو کاج سرد

سید روشن علی شاہ نے باباجی سے جدا ہو کر گورکھپور میں آکر دھونی جمائی۔ اور سراج الدین شاہ بہار میں چلے گئے اور وہیں کٹیا بنا کر رہنے لگے اور خاکی بابا ان دونوں فقیروں کے آجانے پر چتر کوٹ چلے گئے، اور وہاں انھوں نے "مانس کلونتی ٹیکا" رام چرت مانس پر لکھی۔

در رسالہ کلیان گورکھپور کا یوگ دنک شراون سمت ۱۹۹۲ مطابق اگست ۱۹۳۴ء صفحہ ۸۰۷

۶۹ - بھیکا صاحب

بھیکا صاحب کا جنم سمت ۱۷۷۰ بکرم کے لگ بھگ ضلع اعظم گڑھ کے "خان پور بو ہلا" نامی گاؤں میں برہمن کے گھر ہوا تھا۔ ان کا پہلا نام بھیکا نند چوبے تھا۔ ان کو بچپن ہی سے فقیروں کی صحبت کا شوق تھا۔ بارہ برس کی عمر میں حقیقت کو معلوم کرنے کے لئے کسی مرشد کامل کی تلاش میں نکلے، اور گلال صاحب کی دھوم سن کر بمقام بھر کنڈ گلالی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بارہ برس اپنے مرشد کی خدمت کرتے رہے، اور روحانی دولت سے مالا مال ہو گئے۔ گلال صاحب کے جنت سدھارنے پر پچیس برس تک وہیں وعظ و نصیحت کرتے رہے۔ آخر اسی مقام پر پچاس برس کی عمر میں سمت ۱۸۲۰ بکرم میں انتقال کیا۔ وہاں ان کی۔ گلالی صاحب کی اور گلال صاحب کے مرشد کی خانقاہیں

اب تک موجود ہیں۔ دسہرے کے موقع پر ہر سال میلہ لگتا ہے۔ بھیکا صاحب نے کئی کتابیں روحانیات پر لکھیں۔ ان میں "رام جہاز" زیادہ مشہور ہے۔ نمونۂ کلام ؎

پربھو جی کرہو اپنو پھیر
ہیں تو سدا جنم کو رینیا لیہو لکھی موہی کیر
کام۔ کرودھ۔ مد۔ لوبھ۔ موہ یہ کرل سب بن جیر
نرا ہی نرا ہی مرنا گت آیئو پربھو کھو ہی بیر
جن بھیکا کو آرن کیجئے اب کا گد جن ہیر

رام سول کرو پریتی

رام سول کرو پریتی رے من۔ رام سول کرو پریتی
رام بنان کوؤ کام نہ آوے انت رہو رین بھیتی
لو بھی وچاری دیکھو جیہہ اپنو سہری بن ناہیں کوؤ ہیتی
گورو گلال کے چرن کمل رج دھرو بھیکھا انہ چلیتی

(رسالہ کلیات گورکھپور کا یوگ انک شراون سمت ۱۹۹۲ بکرم مطابق اگست سنہ ۱۹۳۴ء)

۷۰۔ نیچی اور دانا

عالم گیر اورنگ زیب جس کو اینگلو انڈین مورخ تعصب کے رنگ میں پیش کرتے ہیں بھاشا کے سب سے بڑے سرپرستوں میں سے ایک تھا۔ ظہیر اس کے دربار کا مشہور شاعر تھا جس نے بھاشا میں امتیازی درجہ حاصل کیا تھا۔ اس کا تخلص نیچی تھا۔ اس نے پرجاتک کا ترجمہ فارسی میں کیا جو علم موسیقی کی ایک مشہور کتاب تھی۔ اسی زمانے میں دوسرا ہندی شاعر متخلص بہ دانا ہوا ہے۔ یہ بھی بھاشا کا ایک اعلیٰ پیمانہ کا شاعر مانا جاتا ہے۔

(اقتباس از [illegible] علی گڑھ میگزین جلد نمبر ۶ شمارہ ۵ تا ۸ سنہ ۱۹۲۸ء)

۷۱۔ شیخ غلام مصطفیٰ

شیخ غلام مصطفیٰ مراد آباد کے رہنے والے تھے۔ یہ بھی عالمگیر ہی کے زمانے میں ہوئے۔ ان کو بھاشا پر اس قدر عبور حاصل تھا کہ سوائے چند برہمنوں کے اُس وقت ان کا کوئی مدِ مقابل نہ تھا اور بڑے بڑے ممتاز پنڈت اُن کا شاگرد ہونا فخر سمجھتے تھے۔ اسی زمانے میں رحمت اللہ اور نجیر الدین بھی جن کا انتقال ۱۱۸۰ھ میں ہوا، بھاشا زبان کے مشہور عالم اور شاعر تھے۔

(اقتباس از علی گڑھ میگزین جلد نمبر ۶ شمارہ ۵ تا ۸ ۱۹۲۸ء)

۷۲۔ ہنر

سیّد احمد نام۔ ہنر تخلص۔ سیّد محمد عشرتی کے بیٹے تھے۔ انھوں نے دکنی ہندی میں دو منظوم کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ نینہہ درپن اور اوتار درپن نینہہ درپن ۱۱۴۹ھ میں تمام ہوئی۔ اس میں راجہ راج کنور اور رانی کملتا دیوی کا فسانہ مذکور ہے۔ ہنر نے اسے ابنِ نشاطی کی پھول بن کے جواب میں لکھا ہے۔ چناں چہ دیباچہ میں کہتا ہے۔ ؎

بنایا پھول بن ابن نشاطی　　　سنھی باس اُس کی سب کے تیں خوش آتی
جواب اُس کا جو یو ہے نینہ درپن　　　ہے سچ وہ عشق کے اکھیا کا انجن

خاتمہ میں تاریخ تصنیف اس طرح لکھی ہے۔ ؎

سیتا سچ نینہ درپن نے یو جھیل کار　　　اگیارہ سو پو تھے چالیس پر چار

۷۳۔ مقصود علی شاہ

آپ قصبہ لہرپور۔ ضلع سیتا پور کے صوفی منش شاعر تھے۔ آپ کا مزار ماتا پور میں موجود ہے، جو نور پور کے قریب ہے جہاں راجہ ٹوڈر مل (وزیرِ اعظم اکبر

پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد معصوم علی شاہ تھے۔ آپ اُردو کے صاحبِ دیوان شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ہندی میں بھی خوب کہتے تھے مقصود تخلّص ہے۔ صوفی شاہ محمود آبادی نے آپ کے کلام کا نمونہ عطا فرمایا ہے جو پیش ہے ؂

تم تو جگت اجگت اُجیارا   نین دور ہمرے تمری اور
ہم چیتیں تم چیتوت ناہیں   اور بلم چت چور
مقصود کی آس لگی ہے   اب کی چیتود اور

(منقول از بیاض صوفی شاہ محمود آبادی بوساطت سید محمد اکبر رضوی عادل سیتاپوری)

۷۴۔ فسردہ

ان کا زمانہ بارھویں صدی ہجری ہے اُنکا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ ان کے صرف تخلّص کا علم ہو سکا۔ ان کے ہندی کلام کا ایک سلام دست یاب ہوا ہے، جس کا رنگ شاہی ہے جو قدیم زمانے کے مرثیہ گو شعرا کا ہے، اور کافی مشہور ہے۔ یہ سلام پوربی انداز کا ہے، نمونہ ملاحظہ ہو:۔

کہیں پانو میں سیس نواؤں کہاں موراسیاں تو میکا بسا گیو
موری ناؤ بھنور بیچ ڈار گیو اور آپن نیّا اُتار گیو
مورا بالک پیوَن نیر گیو وا کے پیاس بجھاون تیر گیو
مورا لال ندی بیں ڈبو یو دیو آپ ڈوبت ڈوبت پار گیو
موہے دھرتی اکاس نہ سوجھ پڑے مورے نین جو لاج بھرے سو بھرے
موری آنکھیں آگے اندھیر بھیو موری جوت نین ہے مار گیو
کہو کا ہے فسردہ تو مان کرے واکو شاہ نبی واکو شاہ غنی
وا نو اُمت کارن سیس دیو وہ تو بات اُمت کی سنوار گیو

(منقول از بیاض سید محمد اکبر رضوی عادل سیتاپوری
محافظ قلعہ معلی محمود آباد)

۵۷۔ شاہ محمد کاظم کاکوروی

شاہ محمد ۔: نام۔ کاظم تخلص۔ آپ مخدوم زادگان قصبہ کاکوری۔ ضلع لکھنؤ میں سے تھے۔ سلطان محمد شاہ بن جہاں دار شاہ بادشاہ دہلی کے عہد سلطنت میں ۱۷ رجب ۱۱۵۸ھ کو کاکوری میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد حضرت شاہ محمد کاشف چشتی سلسلہ چشتیہ سبز پوش کے ایک ممتاز بزرگ تھے۔ آپ نے مروجہ علوم مُلّا اسداللہ شارح مسلم سندیلوی اور مُلّا غلام یحیٰی بہاری سے حاصل کئے۔ جوانی میں اپنے ماموں نواب مظفرالدولہ کے ہمراہ گورکھپور چلے گئے اور وہیں نظامت کے سواروں میں ملازمت کر لی لیکن خدا پرستی اور خدا شناسی کا جذبہ اندر ہی اندر نشوو نما پاتا رہا۔ چنانچہ ایک دن بلا کسی اطلاع کے پیادہ پا گورکھپور سے دم گڑھ روانہ ہو گئے اور وہاں پہنچ کر مشہور بزرگ حضرت کلید عرفان کے زمرۂ معرفت میں داخل ہو گئے۔

آپ ذات زمانے کی اُن نامور خدا دوست اور خدا پرست ہستیوں میں سے تھے جن سے بے شمار کرامات منسوب کی جاتی ہیں۔ آپ نے تمام معقول و منقول تعلیمات حاصل کرنے کے بعد برج بھاشا میں دوہے، ٹھمریاں، چھند اور بھجن لکھنے شروع کئے آپ کے ہندی کلام کا مجموعہ "سانت رس" کے نام سے شرح کے ساتھ ۱۳۰۲ھ میں مطبع بہار اودھ لکھنؤ نے شائع کیا۔ جو شاہ صاحب کی ہندی شاعری کا ایک شاہکار ہے آپ کا وصال بماہ ربیع الثانی ۱۲۲۱ھ۔ کاکوری ضلع لکھنؤ میں ہوا اور اپنے بزرگوں کی خانقاہ میں دفن کئے گئے۔ نمونۂ کلام ؎

جب سے بھئی ست گرو کی کرپا	پیا ڈارے گرے باہیں
گھر باہر اب وہی ہے کاظم	ہم ناہیں ناہیں۔ ناہیں

(تذکرہ اذکار الابرار۔ صفحہ ۱۳۳)

شاہ کاظم کے کلام میں وحدت الوجود کے دقیق مسائل ہیں۔ ایک خالق کہ حسن متمثل بھی ہے اور نور مجسم بھی۔ کبھی یہ جلوے دکھاتا ہے، کبھی روپوش ہوتا ہے۔

اس نازک خیال کو کس لطیف انداز سے ادا کیا ہے۔ مثلاً ؎

یہ نیند یا کاہے کو آئی موری بیرن ‌ ‌ ‌ جاگ پڑت روئی پچھتائی
رات آئے پیا بہت دن ما ‌ ‌ ‌ پھر گئے جب موہے سووت پائی
تنک ٹھار ہو ٹیکے کہہ گئے یہ ‌ ‌ ‌ پائی نیند کب دیکھ اُڑجائی
دھن دھن ری ہر سنیاں دھن دھن ‌ ‌ ‌ کوئی دیکھے برہن کی سوائی
سووے سنجوگن جاگے بیوگن ‌ ‌ ‌ آنکھ لگی کبھوں آنکھ لگائی
نیکے بھاگ جو ہوت سکھی میرے ‌ ‌ ‌ پیا آوت موہے لیت جگائی

میں بل جاؤں کاظم کے بھاگ کے
بھلی بھئی پیا گھر اُن کی سہائی

(ماخوذ از ماہنامہ آج کل دہلی جون ۱۹۵۶ء صفحہ ۵)

۷۶۔ شاہ تراب کاکوری

تراب علی نام۔ تراب تخلص۔ بانی تکیہ شریف کاکوری۔ شاہ محمد کاظم قلندر کے صاحب زادے۔ علوی نسب۔ مخدوم نظام الدین قاری عرف شاہ بھیکہ کاکوروی کی اولاد میں سے تھے۔ شریعت۔ طریقت اور حقیقت کے جامع۔ علوم ظاہری و باطنی سے آراستہ۔ نیز ادب و تاریخ و فقہ میں عالم و فاضل تھے۔ ۱۱۸۱ھ میں پیدا ہوئے۔ ملّا قدرت اللہ بلگرامی اور مولوی معین الدین بنگالی سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ نجم الدین علی خاں سے عروض اور مولوی فضل اللہ سے فقہ پڑھی۔

آپ کا کلام اُردو۔ فارسی اور ہندی تینوں زبانوں میں ہے۔ اور شاعری اُردو ہو کہ فارسی یا ہندی سرتاپا تاثیر اور سوز میں ڈوبی ہوئی ہے۔ کلیات اُردو سات آٹھ مرتبہ مطبع نول کشور میں طبع ہو چکا ہے۔ اس میں اُردو اصناف سخن کے علاوہ ہندی ٹھمریاں بھی شامل کی گئی ہیں۔ ۱۴ جمادی الاول ۱۲۷۵ھ میں ۹۴ سال کی عمر میں رحلت فرمائی۔

افسوس کہ ان کا ہندی کلام باوجود تلاش کے دست یاب نہ ہو سکا۔
(ماخوذ ماہنامہ آج کل دہلی جون ۱۹۵۶ء صفحہ ۲۹)

۷۷۔ قطبی

انڈیا آفس میں "تیرہ ماسہ" کا جو قلمی نسخہ محفوظ ہے، اُسے غلطی سے قطبی دکھنی کا مخطوطہ سمجھ لیا گیا ہے۔ حال آں کہ یہ "تیرہ ماسہ" بالکل بکٹ کہانی کی طرز پہ اُس قطبی نے لکھا ہے جو شمالی ہند کا رہنے والا اور غالباً مظہر جانِ جاناں کا مُرید تھا۔ اس کا زمانہ بارھویں صدی ہجری بہ عہد محمد شاہ بادشاہ دہلی خیال کیا جاتا ہے۔ خاتمہ میں قطبی نے لکھا ہے ؎

محمد شاہ کی ہے بادشاہی   لگا ہے سن تیرہ از فضل الٰہی

میرے قطبی کا جگ جگ راج ہو   گنگا جمنا جب تالگ بہو

یہ تیرہ ماسہ ۱۱۴۶ھ میں مرتب ہوا۔ قطبی کے حالات کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔
(ماہنامہ معارف اعظم گڑھ جلد ۷۶ شمارہ نمبر ۱ صفحہ ۶۴)

۷۸۔ حضرت شاہ غلام حسین ایلچ پوری

آپ ایلچ پور ضلع امراؤتی۔ صوبہ بمبئی کے رہنے والے تھے۔ آپ کا خاندان قصبہ جائس۔ ضلع رائے بریلی (اودھ) سے آکر یہاں آباد ہو گیا تھا۔ شاہ صاحبؒ یہیں پیدا ہوئے اور تعلیم و تربیت بھی یہیں پائی۔ جب سنِ شعور کو پہنچے تو شاہ اسمٰعیل چشتی کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے جو حضرت شاہ نظام الدین اورنگ آبادی کے مُرید اور خلیفہ تھے۔ تمام زندگی درویشانہ استغنا اور قناعت میں بسر کی۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ صاحب کی خدمت میں نواب آصف جاہ ثانی (نظام دکن) شرفِ قدم بوسی کے لئے حاضر ہوئے تھے، اور ایک بہت بڑی جاگیر نذر کرنی چاہی، مگر شاہ صاحب نے انکار کر دیا۔

شاہ صاحب اُردو۔ فارسی اور ہندی کے ایک قادرالکلام شاعر تھے۔ آپ کی مثنوی "من لگن" ہندی کے عام فہم اسلوب بیان کا شاہ کار سمجھی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک مختصر مثنوی "یک رنگ نامہ" غیر مطبوعہ بھی ڈاکٹر نعیم الدین کے پاس محفوظ ہے۔

شاہ صاحب کا وصال ۱۷۹۵ء مطابق ۱۲۱۰ھ میں بمقام ایلچ پور ہوا۔

نمونہ کلام

اندھی رہے گی جو کوئی غفلت سوں اس جگت میں

اندھیچ ہو اُٹھے گی آخر کون آخرت میں

پھیر پنجرے کے بھیتر آتا نہیں دوبارا

ست پنجرے کو خالی جاتا ہے جانے ہارا

ہندو مسلم اتحاد پر

یہ دونوں جنے ایک جاگہ سوں آئے	جگت میں مسلمان ہندو کہائے
گھڑا ہے کمہار ایک ماٹی کے بھانڈے	ہوا کوئی مُلّا، ہوا کوئی پانڈے
یہ دونوں جنے کیوں بھٹکنے چلے ہیں	کدھر سوں کدھر کوں بھٹکنے چلے ہیں
مسلمان مسجد میں سجدے کو جاویں	وہ ہندو بھی مالا کھٹکل کے دکھاویں
مسلمان اللہ کا نام بولیں	وہ ہندو بھی ہر ہر جپیں رام بولیں

عجب کنت کنس آگا سانچار تن ہے

غلام حسین وحسن کا بچن ہے

(سہ ماہی نوائے ادب بمبئی اپریل ۱۹۵۸ء صفحہ ۵۸ تا ۶۰)

۷۹۔ نواز

کبیشور نواز ایک مسلمان شاعر نے فرخ سیر کی حسب خواہش شکنتلا کا ترجمہ برج بھاشا میں کیا۔

(ماخوذ از بیاض قلمی جناب نادم سیتاپوری بحوالہ تذکرہ طبقات الشعراء صفحہ ۲۶)

۸۰۔ مرزائی

محمد علی خاں مرزائی، بیٹا نعیم اللہ خاں کا۔ نواب شجاع الدولہ کی خدمت میں رہتا تھا۔ اس کو ہندی شعر گوئی اور علم موسیقی میں کمال حاصل تھا۔ اس نے ایک کتاب "بدیا درپن" اور دوسری کتاب "اودھ بلاس" اودھی بھاکا میں لکھی۔ اس میں "راما" کا بیان ہے اور ان علوم و فنون کا بیان ہے جن سے ہندوستانی واقف ہیں۔ یہ کتاب بہت عجیب تصور کی گئی ہے۔

(تذکرہ طبقات الشعرا، از مولوی کرم الدین دہلوی صفحہ ۱۷)

۸۱۔ فگار

یہ فقیر اللہ فقیر کے پوتے تھے جو عہد شاہ عالم میں دربار سے وابستہ تھے اور اُردو کے علاوہ شاہ عالم کی طرح ہندی میں بھی دوہے اور گیت لکھتے تھے۔ فگار عاشق مزاج آدمی تھے۔ شیفتہ نے انھیں غالب کا شاگرد لکھا ہے اور سخن شعرا میں وہ ممنون کے شاگرد بیان کئے گئے ہیں۔ ممکن ہے دونوں سے استفادہ کیا ہو۔ تذکروں میں صرف اُردو کے اشعار ملتے ہیں ہندی کا گیت نہیں ملا۔

(بحوالہ تذکرہ گلشنِ بے خار صفحہ ۱۵۲ و سخن شعرا صفحہ ۳۷۲ و بزم سخن صفحہ ۹۳
تلامذۂ غالب از مالک رام۔ صفحہ ۲۴۶)

۸۲۔ اشرف

اشرف تخلص۔ حافظ اشرف خلف امام الدین لکھنوی۔ یہ ایک جوان صالح آزاد وضع حافظ قرآن تھا بسبب مناسبت طبع اور ذہانت کے بڑی دسترس علم موسیقی میں رکھتا تھا۔ خط نسخ اچھا لکھتا تھا۔ علوم دینیہ میں ماہر تھا۔ اس نے ایک تفسیر قرآن شریف کی نظم میں لکھی ہے۔ خیال اور ریختہ، ترانہ اور ٹھمری بناتا تھا۔ ایک ساز

اس نے ایجاد کیا ہے۔ اس کا نام "سندر بین" رکھا ہے۔ اس کے اشعار بازار والوں کو بہت یاد ہیں۔ بازاریوں سے محبت بھی بہت رکھتا تھا۔ ہولی میں بھی میں نے اس کے شعر بازاریوں کو پڑھتے ہوئے پایا ہے۔ اس کو بیس برس کا عرصہ ہوا یعنی ۱۲۰۷ھ کہ وفات پائی۔ (تذکرہ طبقات الشعرا صفحہ ۴۵۲-۴۵۳)

افسوس کہ تذکرہ نگار نے کوئی گیت یا ٹھمری بطور نمونہ درج نہیں کی

۸۳۔ مولوی سید محبوب حسین مرحوم سیدانوی جائسی

سیدانہ کے رہنے والے، اردو، فارسی اور ہندی تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، فارسی میں آپ کی مثنوی مظہر العجائب مشہور ہے۔ اردو کے دیوان کے آخر میں بھاشا کے دوہے، اور بھارتا کا کلام بھی موجود ہے۔ آپ کا انتقال ۱۲۷۹ھ میں ہوا بھاشا کا نمونہ کلام دیکھئے۔

تن لاگے جانے سنسار من لاگے مانے منہار

پریت کو دکھ تپا سکھ راج پوت تپیا دکھ تاٹے کاج

پیت کے ڈکھ میں باڑھے ہت ڈکھ ہٹے نرسے ناچت

دوہا

من کے لوبھی جل بوجھے آئے نہ سرپیکھ

بے من لاگے جو کرے واکو یہی بسیکھ

(ماخوذ از بیاض قلمی حضرت جہر جائسی مرحوم)

۸۴۔ روگانیاں

مردوں کے پہلو بہ پہلو عورتیں بھی ہندی شاعری میں حصہ لیتی رہی ہیں، ان میں ایک روگانیاں بھی تھیں۔ یہ ہندی کی شاعرہ تیلن تھی۔ اس نے اپنے ڈھنگ کی بہت پہیلیاں اور کہاوتیں لکھی ہیں۔ ان کہاوتوں کا ڈھنگ ٹھیک ویسا ہے جیسا کہ عورتیں

گھروں میں بچوں سے کہا کرتی ہیں۔ کلام نایاب ہے۔
(از بیاض قلمی جناب یوگندر پال صابر اورنگ آبادی)

۸۵۔ احمد رامپوری

حضرت شاہ احمد علی خاں نام۔ احمد تخلص۔ والد کا نام مولوی مصری خاں۔ مولد رام پور۔ سالِ ولادت ۱۲۲۵ہ ہجری۔ آپ امام الدین خاں صاحب انور کے خلیفہ اور شاگرد تھے۔ اردو۔ فارسی۔ ہندی تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ آپ کا وصال ستاون برس کی عمر میں ۲۹ شوال ۱۲۸۲ہ ہجری کو رامپور میں ہوا۔ اپنے ذاتی مکان واقع کوچہ بھاگ مل میں دفن ہوئے۔ نمونہ کلام ہے

سلگ گیا مراسُن تانے بدن

کیسے مورے آس پروسی ... موسے ہرئے چھرسے وہ نگری

بیٹی کہہ کے نہ کوئی پکارے ... کہہ کے نہ ساتھی کوئی نہ کوئے

تہتی نہ گئیاں گو ہی آدے

سب ہی کہو یں احمد مو کو دھن دھن

تریا کو بندلی پیاری ہنسلی پیاری رکھے کاجل یار

مردوں کو پیاری تیغ دھنک دل کو گرد غبار

سور چڑھیں جب رن کو باندھیں ہر ہی تمہارا نام لے

گردِ عزا خاں کے تم بچا کر جن سے دہلے سنسار

سجن کا دوار جھلمل جھمکے ... نرمل جوت نینن میں جھکے

آج براجیں انگنا مورے ... خوشیوں سے مورا جوڑا دمکے

(ماخوذ از ماہنامہ آجکل دہلی۔ ماہ جنوری ۱۹۵۶ء صفحہ ۴۱-۴۲)

۸۶ - نیاز، بریلوی

قطب عالم حضرت مولانا شاہ نیاز احمد بریلویؒ ۲۵ ربیع الاول ۱۱۵۵ھ ہجری کو بمقام سرہند پیدا ہوئے۔ ۱۵ برس کی عمر میں آپ علوم ظاہر سے فارغ ہو کر علوم باطن کی طرف راغب ہوئے اور اپنے استاد حضرت مولانا فخرالدین محمد دہلوی کے مرید ہوئے۔ عرصہ تک آپ نے شیخ کے مدرسہ فخریہ میں درس و تدریس کا کام انجام دیا۔ مشہور شاعر غلام ہمدانی مصحفی بھی آپ کے شاگردوں کے زمرے میں داخل تھے۔ چنانچہ ریاض الفصحی میں مصحفی خود لکھتے ہیں :-

"چندے روز میران ہم از ایشان در شاہجہان آباد خوانده بود"

(ریاض الفصحا۔ صفحہ ۳۲۹)

آپ کا وصال ۶ جمادی الثانی ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۸۳۴ء کو ہوا اور بریلی میں مدفون ہوئے۔ وصال سے ۲۵ سال پہلے شعر گوئی ترک کر دی تھی۔

نمونہ کلام ہندی

اچرج دیکھ سوریرو اسدا رہت موہے گھر ناہیں
ہوں اگیانی گھر ناہیں کھوجت بھٹکت جاہیں تاہیں
ست گرو کی کرپا کنیو پیا پائے ڈارے گرباہیں
گھر باہر آپ وہی ہے نیاز ہوں ناہیں ہوں ناہیں

ہوری کھیلیں شیام سے ہیں چلی برج کی نگریا
ہاتھ میں تھال عبیر گلال کو سر پہ رنگ کی گگریا
جب پیا ہمرے پچونہ چھر کے میں بورو وں اکی پگریا
نیاز کچھو نہ جانت بوجھت کہو یہ بات ہے یہ ڈگریا

ہلسات جیا پیا دکھین کو، نہ سُہاوت مُونہہ برہن کو
دو نینن بھیے جھر کے جھر ناما نوں بدا ہیں آت ساون کو
پیا پیا تیرت پری ہوں رہی پیا او کھت ہی یا بیدن کو
توری بَل بَل جاؤں نیاز پیا دُکھ دور کرو مورے تن من کو
(ماخوذ از مضمون "نیاز بریلوی کی ہندی شاعری" ماہنامہ آجکل دہلی ۱۹۶۰ء صفحہ ۹ تا ۱۲)

۸۷۔ شاہ تراب چشتی

شاہ تراب چشتی ترنامل (مدراس) کے رہنے والے تھے۔ والد کا نام عبداللطیف تھا۔ بارھویں صدی ہجری کے دکنی صوفیائے کرام میں شاہ تراب چشتی کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں۔ وہ اسلامی تصوف کے ساتھ اہلِ ہنود کے مذہبی فلسفے اور عقائد سے بھی بخوبی واقف تھے۔ ان کے پیر و مرشد پیر پادشاہ حسینی بھی صوفی کامل تھے۔ شاہ تراب صحیح معنوں میں ہندو مسلم ایکتا کے نقیب تھے۔ ان کی تصانیف مذہبی یگانگت اور محبت کے گنگا جمنی میل جول کی مظہر ہیں۔

آپ اُردو کے پہلو بہ پہلو ہندی کے بھی اچھے شاعر تھے۔ ان کی ہندی نظم "من سمجھاون" زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہے۔ تین مثنویاں غیر مطبوعہ ہیں۔ ایک اور ہندی نظم "گیان سروپ" مرتب ہو چکی ہے۔ آپ نے اپنے کلام میں جہاں حضرت علیؓ کی مدح سرائی کی ہے، وہاں شری کرشن جی سے اپنی والہانہ محبت و عقیدت کا اظہار بھی کیا ہے۔ شاہ تراب کی کرشن بھگتی کے پیش نظر یہ کہنا عین روا ہے کہ انھوں نے رام اور رحیم کے تفاوت کو مٹانے کی سعی کی ہے۔ نمونہ کلام دیکھیے :-

لگا ہے دل مرا اُس سوں کہ جو مُرلی مراری ہے
سلونا سانولا دلبر، گرر جس کی سواری ہے
بجا مرلی نے مرلی آگیا من باولا میرا
او گو بند و بنار دھن کی دُھن مُرلی کی پیاری ہے

چتربھج نام ہے اوس کا کہ جس کو داس دیو کہتے

چھبیلی چھب اور دامودر کی ترِبھنگ پیاری ہے

سہس سر جس کوں گوبن دیہے سب پاس سب ساں دُور

اُبھوگی بھوگ لے سب کا اگوچر برم چاری ہے

سیہ نگہ بسیہ کا کُل کھلی جگدیش مادھو کی

پریشاں، شانہ کیوں نہ ہووے کہ رنگ تارتاری ہے

مُراری کی مروّت ہو دامودر کے درسن کا

ہوے چاکھا سو ست گر سیں وہی اب لگ خماری ہے

سُونا اپدیش گر تک سیس مکند ہے نام ہرجی کا

تو اُس کا بولنا اُستت زہے خدمت گزاری ہے

نہ ہندو نہ مسلماں کے اوسیٹرا قید میں ہرگز

ترا آب مبتلا کے تئیں دریا جو بے قراری ہے

آپ کی تاریخ ولادت و رحلت کا پتہ نہیں چل سکا۔

(ماخوذ از "ہماری زبان" یکم فروری ۱۹۷۱ء صفحہ ۴)

۹۸۔ سیّد شبیر علی حسینی

گیارھویں صدی ہجری کے آخر اور بارھویں صدی ہجری کے اوائل زمانہ کے مشہور بزرگ گزرے ہیں۔ "تکیہ میر شبیر علی" جائس کے باہر پورب کی طرف آپ کی یادگار ہے۔ آپ عابد، شب زندہ دار اور مرجع خاص و عام بزرگ تھے۔ آپ کی وفات ۱۱۲۰ھ میں واقع ہوئی۔ آپ نے "صدائے ناقوس" کا ترجمہ ہندی میں ایسا کیا تھا کہ جب آپ اُس کو لحن سے پڑھتے تو لوگ جمع ہو جاتے تھے اور اُس کے الفاظ سے ایسی آواز پیدا ہوتی کہ جیسے گھنٹے کی آواز ہوتی ہے۔ آپ اُردو اور ہندی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ہندی کے نمونہ کلام میں سے آپ کا دوہا درج ذیل ہے۔ ؎

آپ سجیں، دُلدُل سجیں سجی برتیا کو جات ہے
باتھہ پکڑ واں کی اماں روئے وُرلٹہا مت جا رے
کہے حسینؑ تھری میّا ہے بابا کہاں حسین تھر اگھر بسا
کہاں حسن تھری لاگی لگنیا۔ سجنی برتیا کو جات ہے
مکہ مدینہ موری میّا ہے بابا۔ بیچ جنگل مور اگھر بنا
کربل موری لاگی لگنیا۔ سجنی برتیا کو جات ہے
بادل نہ چھوڑے اپنی بادلی۔ دھرتی نہ چھوڑے ہری دبیا
امّاں نہ چھوڑے اپنی گود کا للوا جس کے بنا جگ سون ہے
(ماخوذ از بیاض قلمی مہر جائسی مرحوم)

۸۹۔ دلمبر

دلمبر ایک صاحبِ دیوان . . . بزرگ گزرے ہیں۔ آپ کا نام منوّر خاں، تخلّص دلمبر اور وطن میرٹھ تھا۔ ۱۸۵۰ء میں کچھ نظمیں سہ بانوی ہندی میں لکھ کر ابوظفر بہادر شاہ کے حضور میں پیش کیں۔ بادشاہ نے بہت داد دی، اور خلعت و انعام سے نوازا۔
نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

حمدِ خدا

تیں پاتی سوں مانس کینا	سو بجھ بوجھ مت سُدھ بُدھ دینا
تیرے ساجے انیک نرالے	جن سانچوں لکھ کا پاڈھالے
انبر دھرتی۔ سورج چندر	دیوی۔ دیوتا۔ پیر پیمبر
سب تیری ڈیوڑھی سیس نوائیں	تجھے نے پوجیں تجھے نے گا دیں
جے توں اپنا بھیو دکھاوے	انبر دھرتی پھو ہو جاوے
توں ہی مارے توں ہی نواجے	تیرا ڈھولشا انبر باجے

نبی صاحب کے چار سپائی — جنھاں نے نلکوں دھومیں ٹھائی
کر دیئے ٹکھوں ہنیم کے بندے — نرمل ہو گئے مانس گندے
جو کوئی واکی گیل نہ چالا — واکا دو جگ مہرا کالا
ڈوب گیو وہ کرموں ہینیا — جن حجرت کا سنگ نہ دینا

۹۰۔ حسین

ان کا زمانۂ شاعری ۱۶۵۱ء عیسوی ہے۔ "کانی داس ہزارہ" میں ان کے اشعار ملتے ہیں۔

۹۱۔ میر رستم

ان کی ترقی کا زمانہ ۱۶۷۰ء مانا گیا ہے۔ ان کے اشعار بھی کانی داس ہزارہ میں ملتے ہیں۔

۹۲۔ دانش خاں

یہ اورنگ زیب بادشاہ دہلی کے دربار میں رہتے تھے۔ ۱۶۸۰ء عیسوی ان کی ترقی کا زمانہ مانا گیا ہے۔

۹۳۔ نواز اللہ بلگرامی

انھوں نے "سار چندرکا" نامی کتاب لکھی ہے۔ ۱۷۷۳ء ان کی شاعری کا زمانہ ہے۔

۹۴۔ خاکی

سید محمد جمال الدین قادری نام ہے۔ ان کی شاعری کا زمانہ ۱۷۲۲ء کے

قریب کا ہے۔ (گل رعنا صفحہ ۱۱)

ریختی کال کے شعرا کی فہرست طویل ہے۔ مندرجہ بالا شعرا کے علاوہ بیسیوں مسلمان شعرا ایسے ہیں جن کے حالات پردۂ اخفا میں ہیں۔ افسوس ہے کہ ان شعرا کی گوشہ نشینی اور عزلت نشینی تذکرہ نگاروں کو ایسے دھندلکے میں چھوڑ دیتی ہے جہاں کچھ سجھائی نہیں دیتا۔

۹۵۔ موج اکبرآبادی

رسالہ شاعر آگرہ بابت ماہ دسمبر ۱۹۳۸ء میں مولانا انتظام اللہ شہابی نے نظیر اکبرآبادی سے متعلق ایک مقالہ لکھا ہے۔ اُس میں صفحہ ۳ پر نظیر اکبرآبادی کے تلامذہ کا ذکر کیا ہے۔ جن میں موج کا ذکر یوں کیا گیا ہے:-

"موج - خدا بخش نام - یہ ہندی کے کہنے والے تھے۔ سکونت محلہ تاج گنج میں تھی۔ فن موسیقی سے بڑے ماہر تھے۔ درجہ گندھرب کا رکھتے تھے۔ قوالی شغل قرار دے دیا تھا۔ جہاں جاتے وہاں نظیر کا کلام سناتے اُردو میں بھی کچھ کہتے تھے اور میاں نظیر کو دکھا لیتے۔ واجد علی شاہ کے جلسہ تاج پوشی پہ بلائے گئے۔ مالا مال ہو کر آئے۔ مجموعۂ کلام ان کا موجود ہے۔ سنہ ۱۲۴۲ھ میں انتقال کیا۔"

افسوس کہ راقم الحروف کو ان کے ہندی کلام کا نمونہ نہیں مل سکا۔

آدھونک کال

(دَورِ حاضرہ)

(سمت ۱۹۰۰ بکرم سے اب تک)

۱۸۵۳ء کے قریب ہندی سنسکرت کے جیّد عالم پنڈت شردھا رام پھلوری کی وفات سے ہندی کی ادبی دنیا میں ایک ایسے ادیب کی ضرورت تھی جو اپنے زورِ قلم۔ جوشِ طبع اور زبان کی بے پناہ محبت کے زیرِ اثر لوگوں کو سوجان سے ہندی کا شیدا بنا دے اور ہندی ادب کا ایسا سوتا نکالے جو مقتضائے حال کے مطابق، اور علم دوست حضرات کی دل کشی کا موجب ہو۔ اس اہم ترین کام کو زیورِ تکمیل سے آراستہ کرنے کے لئے قدرت نے ۱۸۵۰ء میں بھارت اندو ہریش چندر کو بھیجا۔ ہوش سنبھالتے ہی ان کے قلم معجز رقم نے وہ جوہر دکھائے کہ جہاں ہندی نثر کی زبان پاک۔ سلیس۔ سادہ۔ دل کش اور فصیح ہوگئی، وہاں ہندی شاعری بھی ایک نئی امنگ لے کر ایک نئے رستے پر چل نکلی۔ انھوں نے سولہ سال کی عمر سے شاعری شروع کی۔ اس میدان میں قدم رکھتے ہی آپ نے محسوس کیا کہ بہت سے ہندی الفاظ ایسے ہیں جو کئی سال سے عام بول چال میں استعمال نہیں کئے جاتے لیکن کتبوں اور سوئیوں میں برابر لائے جاتے ہیں، جس کے سبب ہندی نظم عوام کی سمجھ سے بالاتر ہوتی جاتی ہے۔ یہ سوچ کر آپ نے ایسے ناگوار۔ غیر مانوس اور بعید الفہم الفاظ کے استعمال کے خلاف آواز اٹھائی اور عام بول چال کی صاف ستھری، نکھری ہوئی زبان

میں اپنی تخلیقات پیش کیں۔ جابجا اس قسم کی اصلاحی انجمنیں قائم کیں، اور باقاعدہ طرحی مشاعروں کا انتظام کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری ادب کا یہ جدید دورِ ارتقائے فن و شعر کے لحاظ سے ایک اہم ترین ہمہ گیری و تنوع کا دور بن گیا۔ اس میں شعر گوئی کے ساتھ ساتھ شاعر کے جذبات و تخیلات اور اس کی انفرادی خصوصیات کی چھان بین کی جانے لگی۔ پنڈت رام چندر شکل۔ لالہ بھگوان دت۔ ڈاکٹر پیتامبر دت۔ پنڈت شانتی پریہ دویدی۔ پروفیسر نگیندر۔ سمترانندن پنت وغیرہ نکتہ رس ناقدین نے متعدد شعرائے قدیم و جدید کی طرزِ نگارش پر بہمہ وجوہ بحث کی۔ جس میں شاعر کے ادراک اور فکر و فن کی بنیادی قدروں کی تلاش کی گئی محض حسن و قبح یا ذاتی پسندیدگی کی حدود سے آگے بڑھ کر سماج۔ معاشرت۔ تہذیب نفسیات اور لسانیات کو باہم مربوط کر کے تحقیق و تنقید کا متوازن انداز قائم کیا گیا۔ ہندی شعرا کے شعور اس حد تک بیدار ہوئے کہ اُن کی دور بین نگاہیں انگلینڈ کی گلیوں سے نکل کر فرانس جرمن اور روس کے صحافتی اور ادبی میدانوں کو روندنے لگیں۔ ان شعرا کی حقیقت پسندی نے جذبات تخیلات کے داخلی تصورات کی بجائے خارجی زندگی کی عکاسی کو اپنا لائحہ عمل قرار دیا۔ گویا سماجی شعور کے پہلو بہ پہلو شدتِ احساس بھی جلوہ گر ہوئی۔ انھیں دنوں مارکس اور فرائڈ کے ادبی و فکری کارناموں نے سارے یورپ میں انقلاب پیدا کر دیا اور دنیا کو دو گروہوں میں بانٹ دیا۔ ایک طرف سرمایہ داری، اور دوسری طرف مزدوری۔

ہندوستان میں بھی ادب نواز اور علم دوست طبقے پر ان تعلیمات کا گہرا اثر پڑا۔ آزادی۔ جمہوریت اور مساوات کے نعرے جو مارکس نے لگائے تھے، یہاں بھی قبول کئے جانے لگے۔ ترقی پسند شعرا نے اپنی تخلیقات میں پرانے اور نئے ادب کا تجزیہ مادی جدلیت کی روشنی میں پیش کیا۔ جس کے زیرِ اثر ہندوستان کی دوسری زبانوں کے فن کار بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اُردو اور ہندی کے شعرا ایک ہی قطار میں کھڑے ہو گئے، اور آہستہ آہستہ اس تحریک نے ہمہ رس، ہمہ گیر انسان دوستی سے آگے

بڑھ کر سیاست سے رابطۂ اتحاد مضبوط کیا، جس کے نتیجے کے طور پر ادبی وشعری اسالیب کی جگہ سیاسی اور ہنگامی چیزیں پیش کی جانے لگیں۔ گویا ہندوستانی عبودیت اور روحانیت، نیز مغرب کی رومانیت پر نظر کرکے یہ کہنا عین بجا ہے کہ جدید ہندی ادبیات کا پس منظر مشرق اور مغرب کے فلسفیانہ امتزاج سے وجود میں آیا ہے۔

ایک طرف تو یہ عملی تعلیم اثر انداز ہوئی۔ دوسری طرف ملک بھر میں فرائڈ کی تعلیمات نے ہندی فن کاروں کو تحلیل نفسی اور تحت الشعور کی طرف جھکایا۔ ان مقلدوں میں وانتسائن اگیئے سب سے پیش پیش ہیں۔ انھوں نے ایک جدید ذہن کے ساتھ تاثر کی تخلیق ہی کو شاعری کا ایمان ٹھہرایا، اور اپنی شاعری کا آغاز چھایاواد سے کیا۔ ساتھ ہی ماورائی عناصر میں عقل کو بھی شامل رکھا۔ بعض نے ادبی وشعری اسلوب کی بجائے سیاسی وہنگامی نظمیں لکھنی شروع کیں۔ بعض نے اشتراکیت کا راگ الاپا اور عملی سیاست سے قریبی رشتہ استوار کرنے کی کوشش کی۔ ان سب پہلوؤں کو یکجا کرکے اس دور کا نام "سوچھند دھارا" رکھا گیا۔ آخر سمت ۱۹۹۰ بکرم سے عوام الناس کے جذبات میں نئی قسم کا جوش وخروش نمودار ہوا۔ لوگ وطن دوستی، بنی نوع انسان سے محبت، مساوات اور مذہبی آزادی کے لئے ہمہ تن مصروف نظر آنے لگے۔ ایک طرف مزدوروں، کسانوں اور اچھوتوں کو اُبھارا گیا اور دوسری طرف حب الوطنی کے گیت گاکر وطن کی آزادی کے خواب دیکھے گئے۔ کہیں دولت مندوں کو کوسا گیا اور غریبوں کو دلاسا دیا گیا۔ کسی طرف اونچے اونچے محلوں میں رہنے والوں کی خبر لی گئی۔ گویا خلقِ خدا کے اندر درد وغم کے جذبات بدرجہ اتم جمع ہو گئے۔ اس زمانے کا نام کرانتی کاری یا پرگتی یگ (انقلابی دور) رکھا گیا۔

آخر ۹ اگست ۱۹۴۲ء کو راشٹرپتی مہاتما گاندھی نے "انگریزو بھارت چھوڑو" کا نعرہ لگایا۔ اُسی دن سب نیتاؤں کو پکڑ کر جیل میں ٹھونس دیا گیا۔ پھر کیا تھا۔ انتقام کی حشر خیز آگ بھڑک اُٹھی۔ جگہ جگہ بغاوت کے آثار نمودار ہو گئے۔ ہمارے ادباء وشعرا بھی زمانے کے رنگ میں رنگے گئے۔ سینکڑوں کتابیں اسی مضمون کو لے کر معرض وجود

میں آئیں۔ ابھی یہ دَور چل ہی رہا تھا کہ نیتاجی اور آزاد ہند فوج کے کارنامے ظہور پذیر
ہوئے۔ "جے ہند" اور "چلو دہلی" کے فلک شگاف نعروں سے زمین و آسمان گونج
اُٹھے، ہر بوڑھے اور نوجوان قلم کار نے قلم سنبھالے۔ وطن کی محبت۔ آزادی کی تمنا
مل بیٹھنے کا شوق۔ مساوات کا جوش۔ قومی یک جہتی ایسے جذبات تھے جنھوں نے
سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پھر بنگال کے قحط سے روٹی اور شکم پری کا سوال پیدا
ہوا۔ مزدوروں، غریبوں، کسانوں اور اچھوتوں کو اوپر اُٹھانے کی فکر دامن گیر ہوئی
جس سے اسی مضمون پر بیسیوں کتابیں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئیں۔ آگے بڑھ کر ۱۹۴۷ء
میں تقسیم وطن کا انسانیت سوز اور ہیبت کوش منظر سامنے آیا۔ جس کے زیر اثر آزادی
اور بربادی کے عنوان سے بہت کچھ لکھا گیا۔ دونوں قسم کا کلام اس موقع پر ملتا ہے۔
تباہ حالوں کی تباہی کے عبرت انگیز و دلخراش مناظر اور شادکاموں کے آزادانہ ترانے
ساتھ ہی اتحاد، ہندو مسلم اتفاق۔ حب الوطنی۔ یگانگی۔ اچھوت اُدّھار۔ وطن دوستی کے
گیتوں کا الاپ شروع ہوا اور دکھیوں و مہاجروں کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا گیا۔ ابھی
اس تباہی کا زخم تازہ ہی تھا کہ ۱۹۴۸ء میں مہاتما گاندھی جی ہم سے جدا ہو گئے۔ اس سانحۂ
جان کاہ پر بھی ہزاروں طریق سے ماتم کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب ہندی شاعری نکھر
کر مہذب ممالک کی شاعری سے لگا کھاتی ہے۔ مجلسی۔ مدنی۔ سماجی۔ سیاسی اور اخلاقی
مضامین کا دریا ہے کہ اُمنڈا چلا آتا ہے۔ مختلف تحریکات کی ہنگامہ آرائیاں نئے نئے اسالیب
اور جدید رجحانات زبان کو مالا مال کر رہے ہیں۔ گویا اب ہندی ادب کے سامنے ایک وسیع
میدان ہے۔ مزید برایں سرکاری و درباری زبان کی سرفرازی کے سبب ارتقا و عروج
کے امکانات نمایاں ہو گئے ہیں۔

دَورِ حاضرہ کے ہندی گو مسلمان بھائیوں کے حالات عرض کرنے سے پہلے اس
امر کا انکشاف بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بعض حضرات نے متعدد تاکیدی عرض داشتوں
کے باوجود کروٹ نہ بدلی۔ آخر مجبوری و معذوری کے عالم میں جو کچھ مواد مل سکا
ہدیۂ ناظرین ہے۔

۱ - سیّد امیر علی میرؔ

آپ ۱۸۷۳ء میں صوبجات متوسط کے ایک قصبہ ساگرنامی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام میر رستم علی تھا۔ بچپن ہی میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ آپ کے چچا میر رحمت علی نے جو دیوری میں ملازم تھے آپ کی پرورش کی۔ آپ کی ابتدائی تعلیم دیوری میں ہوئی۔ ۱۸۹۰ء میں ٹیچرز ٹریننگ کلاس جبل پور کے نارمل اسکول میں داخل ہوگئے ۱۸۹۲ء میں یہ امتحان پاس کرنے کے بعد جبل پور کے اسلامیہ ہائی اسکول میں بطور ڈرائنگ ماسٹر ملازم ہوگئے۔ کچھ عرصہ بعد اسلامیہ اسکول کی ملازمت چھوڑ کر دیوری میں ملازمت کرلی۔ پرائمری کی اول مدرسی سے بتدریج ترقی یاب ہوتے ہوئے مجسٹریٹ درجہ دوم تک پہنچے۔ آپ دورحاضرہ کے بہترین ہندی شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔ گئو رکھشا کے زبردست حامی ہیں۔ دسہرہ اور دوسرے ہندو تہواروں پر بھی نظمیں کہی ہیں۔ نمونہ کلام ؎

ہندوستانی طلبا سے خطاب

اُٹھو بھوپ جن پد کے ہتکر　　بھارت کے جیون آدھار
پُورَو پُرش گَورَو کے وَردھک　　شاستروِت گن کے بھنڈار

اُوچہ منورتھ پنکھ کے رُوپی　　پر بیٹھا کمیدن کے راکیش
آشا بھر نین سے تو مکھ　　دیکھ رہا ہے بھارت دیش

کنڈلیاں

مینا تو تن باسنی پڑی پنجرے آن　　جان دیو گتی تاہی میں ہے شانت سُکھ مان
ہے شانت سکھ مان مان کومل تے اپنی　　سب پکش سردار تو ہی کوی کو دبرنی
کہے میر کوی نت بولتی مدھرے بَینا　　تو بھی تجھ کو دھنیہ بنی تو آج ہتوں میں نا

(مینا کو تن نا یعنی میں نہیں ہوں کہا ہے اور خود کو نیست کہہ کر ہستی کا ثبوت دیا ہے)

بگلا بیٹھا دھیان میں پر اتہ جل کے تیر | مانو تپسی تپ کرے مل کر بھسم شریر
مل کر بھسم تیر جب دیکھی مچھلی | کہیں مہیر گر سی چونچ سمو جی فوراً نگلی
پھر بھی آوین شرن و پر جو نچ کے اگلا | اُن کے بھی تو پران ہرے لیے پچھی بگلا

آپ کا ایک دوہا بہت لاجواب ہے ؎

جا نچ بن پھل دیہو جو دانا ہوا داتار | کرم دیکھوں تو تار یو تو کیسے کرتار

(منقول از ماہنامہ رہنمائے تعلیم لاہور- اکتوبر ۱۹۳۶ء صفحہ ۲۷ تا ۲۹)

۲- میر امداد علی علوی قلندر تھانوی

آپ کی ولادت مردم خیز خطہ تھانہ (مظفر نگر) میں حضرت پیر نجابت علی علوی تھانوی کے گھر ۱۲۵۵ھ ہجری میں ہوئی۔ آپ نے اُردو فارسی کی تعلیم اپنے والد ماجد سے پائی۔ عنفوانِ شباب میں شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ تصوف اور علم کا بے حد شوق تھا۔ ۱۲۸۵ھ ہجری میں حیدر آباد (دکن) آئے وہاں حضرت میر غلام حسین المعروف بہ مرزا سردار بیگ آزاد قلندرؒ کی قدم بوسی حاصل کی ۱۲۹۰ھ میں ارادت کا درجہ نصیب ہوا۔ آپ کوئی پچیس سال اپنے مرشد کی صحبت میں رہے اور وحید عالم۔ صوفی۔ فقیہہ۔ قلندر آزاد۔ فارسی۔ اُردو اور بھاشا کے بے مثل شاعر اور سرمستِ بادۂ الست بن گئے۔ آپ نے تینوں زبانوں میں کافی سرمایہ چھوڑا ہے اُردو، فارسی دواوین کے علاوہ بھاشا میں "رنگیلا" اور "رنگیلی" نام کے دو دیوان چھوڑے ہیں۔ ریختی میں عصمت اور دہقانی۔ پوربی زبان میں نادر تخلص فرماتے تھے۔ داغ دہلوی۔ امیر مینائی۔ جلال لکھنوی۔ ظہیر دہلوی آپ کے ہم عصر تھے۔

ہندی کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو ؎

نرنجن۔ نرمنی۔ نردیہہ | نرکھ نرگن نرنکار
سرب گن۔ سرب رنگھ | سرب روپی جگت کرتار

بانسریا گن گا دے رے موہن بانسریا گن گا دے
پی کی شبد سُنا دے رے موہن بانسریا گن گا دے ... الخ

بادرینا بجلی چمک رہی بادرینا
سنا بر قہ نینن سنبس جوت نجریا او چمک رہی بادرینا
بجری چمک رہی
سُلگت ہیرا ۔ دہکت جیرا دائے نینن نین کمٹک رہی ۔ بادرینا
بجری چمک رہی

نندن گہ دھاری موہن پھیری ہوں بھاری
چھپ چھپ مارت ہے پچکاری ایسو جنز کھلاری
جب ماری مکھ او پر ماری، سُدہ بسرا دیو ساری
سانو ری برج بہاری نندن گہ دھاری . . . .
(منقول از ماہ نامہ آجکل دہلی ستمبر ۱۹۵۸ء صفحہ ۴)

۳ ۔ امداد حسین خاں ۔ رضاؔ

رضاؔ صاحب کے حالات معلوم نہیں ہو سکے، صرف ان کا ایک قطعہ تاریخ دست یاب ہوا ہے جو انھوں نے سید فدا علی فداؔ کی تصنیف " ہنسا کہانی " کے لئے لکھا ہے، کتاب مذکور ۱۳۰۲ھ میں طبع ہوئی ہے ۔ قطعہ تاریخ یہ ہے ؎

رہے میرے راجہ پہ داتا کی کرپا بھرا گنگا جمنا میں جبتک ہے پانی
ڈھنڈورا پٹے بھیر نگر میں اسی کا ملے اس کو بھر اس کی دھرتی پرانی
رضاؔ پیچھے پیچھے چلا چل فداؔ کے گنی نے بھلی بات ہے دل میں ٹھانی
لگائی ہے باتوں کی پھلواری اس نے ہے اس کی بوٹا کہ [illegible] پیشانی

رضا اپنے جی میں بجا برا یہ ہیں نے — لگی ہاتھ چاتر کو "ہنسا کہانی" ۱۳۰۲ھ

(منقول از ماہ نامہ آج کل دہلی جون ۱۹۶۰ء صفحہ ۴)

۴ ۔ مولوی سید فخرالدین

آپ مولانا حکیم سید عبدالحی مرحوم مصنف "تذکرہ گل رعنا" کے والد بزرگ وار تھے۔ آپ کا اسم گرامی مولوی سید فخرالدین اور آپ کے والد سید عبدالعلی سادات قطبیہ حسینیہ کے چشم و چراغ تھے۔

آپ کی ولادت تکیہ شاہ علم اللہ بیرون شہر رائے بریلی میں ۱۲۵۶ھ میں ہوئی۔ تیرہ برس کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ سرکار نے کچھ وظیفۂ تعلیم مقرر کر دیا جو عرصہ تک ملتا رہا۔ آپ نے اپنے نانا سید محمد طاہر مرحوم کے دامنِ تربیت میں پرورش پائی اپنے نانا کی وفات کے بعد لکھنؤ تشریف لائے، اور مولانا محمد نعیم فرنگی محلی کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے اور طب کی کتابیں حکیم محمد یعقوب لکھنوی سے شروع کیں۔ شعر و سخن کا ذوق ناگور میں حکیم احمد جان کی صحبت میں پیدا ہوا۔ آپ علمی فضل و کمال کے ساتھ فارسی، اردو اور خاص کر بھاشا کے بہت اچھے شاعر تھے۔ لکھنؤ پہنچ کر وہ شوق تازہ ہو گیا اور شیخ امیر اللہ تسلیم کے شاگرد ہو گئے۔ اردو فارسی اشعار میں فخر اور فخری نیز بھاشا کے کلام میں میر تخلص کیا۔ تصنیفات میں اردو، فارسی کے دو اوین کے علاوہ بھاشا کا دیوان موسوم بہ "پریم راگ" ملتا ہے۔ ۱۰ رمضان ۱۳۲۶ھ میں وفات پائی۔

نمونہ کلام (راگ بھیروں ۶ گھڑی سے ۹ گھڑی دن تک موسم بارش میں)

ہد ریا گھیرے پیا ماہیں آئے رے

کبری سوت جس بادر گرجت — آئس جوئیں رت پاوس کیری رے

ہیت کبھوں دامن جس چمکے — وہ کی گلن نت بھیسری رے

بچھو ورن ساونوں کیسری رتیاں — بھور دھوپ پرلے کیسری رے

نس اندھیاری پنتھ نہ سوجھے　　　میر پیا تھیں اب کت ہیری رے

(راگ الہیا ۹ گھڑی دن سے ۱۱ گھڑی دن تک)

جاؤ جی تم کشن کنہیا

تم الگر جی اپنے گرجے　　　پھر کنوڑ کے ناہیں سُنئیا

میر کہوں کیا یام کی گھاتیں　　　ہے چھلا بٹ کالیو یا

(راگ سارنگا دھے دن سے ۳ گھڑی دن تک)

ٹھنڈی ہی بھبیاں بنیا بُھاوں

بسریا ڈولے جیرا لسائے　　　بولے کوئلیا لے پیا نانوں

بپیہا کوکو۔ مورو ابولے　　　میر پیا کا کہہ بدھ پانوں

(ماخوذ از تذکرہ "گل رعنا" صفحہ ۵۲۲ تا ۵۴۶)

۵ - سیّد وزیر علی شاہ وزیر

وزیر علی شاہ نام۔ وزیر تخلص۔ ولد سیّد امام علی ولد سیّد اکبر علی۔ قوم سیّد حسنی حسینی۔ آپ کے دادا گھوڑوں کی تجارت کرتے تھے۔ آپ کے والد رام پور میں آئے اور محلہ "دو محلہ" میں سکونت اختیار کی۔ آپ ۱۲۲۶ھ میں اسی محلہ میں پیدا ہوئے۔ فارسی۔ عربی۔ دونوں میں دستگاہ تھی۔ شاعری کا بھی شوق تھا۔ فارسی۔ اُردو۔ ہندی تینوں زبانوں میں کبھی کبھی کچھ موزوں کرتے تھے۔ شاہ کمال الدین خاں عرف بھورے میاں سے نقش بندی طریقہ میں خلافت پائی۔ ۲۷ شوال ۱۲۹۶ ہجری میں انتقال کیا۔ مزار گنبد دار محلہ دو محلہ میں موجود ہے۔ انتخاب یادگار میں آپ کی ولدیت محمد علی لکھی ہے وہ غلط ہے۔

(تذکرہ کاملان رام پور صفحہ ۴۴۰)

افسوس ہے کہ نمونہ کلام دستیاب نہیں ہو سکا۔

۶ ۔ کالے خاں فقیر

ان کی تاریخ ولادت کا پتہ نہیں چل سکا۔ بھگت مال میں لکھا ہے کہ کالے خاں ایک رنگریز تھے۔ ایک برہمن لڑکے سے اُن کی دوستی ہو گئی۔ برہمن دوست کی صحبت کا یہ اثر ہوا کہ کالے خاں کرشن جی کی بھگتی کرنے لگے۔ نماز چھوڑ کر کرشن جی کا نام جپنے لگے۔ اس میں ان کو قلبی مسرت حاصل ہوتی تھی۔ ایک دن کسی کام کے لئے وہ اپنے گاؤں سے باہر گئے ہوئے تھے۔ اُن کی غیبت میں اُن دوست برہمن لڑکے کی موت ہو گئی۔ واپسی پر جب کالے خاں کو اپنے دوست کی موت کا حال معلوم ہوا تو بہت ماتم زدہ اور غمگین ہو کر پریشانی کے عالم میں شمشان گھاٹ پہنچے۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے دیکھا کہ لڑکے کو چتا پر رکھا جا رہا ہے۔ انھوں نے دُور ہی سے پکار کر کہا "خبردار زندہ آدمی کو چتا پر نہ رکھو"

یہ سُن کر لوگ حیران رہ گئے۔ کالے خاں نے چتا کے پاس پہنچ کر کہا "اُٹھو! دوست میں آ گیا۔ جب اتنا کہنے پر لڑکا نہ اُٹھا، تو انھوں نے اپنے معبود بھگوان کرشن کی مدح سرائی شروع کی اور وہیں کھڑے کھڑے ۱۰۸ کبت کہہ ڈالے۔ جب آخر کا کبت ختم ہوا تو وہ برہمن لڑکا اسی طرح اُٹھ بیٹھا جس طرح ایک سویا ہوا آدمی خواب سے بیدار ہو کر اُٹھتا ہے۔ سب لوگ کالے خاں کی کرشن بھگتی کی تعریف کرنے لگے۔ اُن کی کرشن بھگتی کا نمونہ اُن کے مندرجہ ذیل کبت میں ملاحظہ ہو۔ ؎

برندا بن کیرت ونود کنج میں آنند کے کند لال مورتی گوپال کی
کالی دیہہ کوی کالے بیال پنچھ ناگ ناتھیو کنیکی کے پھول توری لائے مالا ہار کی
برست ہی پوتنا پرم گتی پائے گئی بلک ہی پار لیوٴ آجا مل نار کی
گود گدگان ہار چھانچھ کے! گاہن ہار آیو نہ اہیر کیوں ہماری بار بار کی

کالے خاں فقیر تھے۔ انھوں نے شادی نہیں کی۔ دردمندوں اور محتاجوں کی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اُن کے متعلق روایت ہے کہ ایک بار شری کرشن بھگوان نے اُن کو اپنا دیدار عطا فرمایا تھا اور اپنے دست مبارک سے اُن کا سر دبایا تھا (بھگت مال صفحہ ۲۴۶)

۷۔ نبی بخش ۔ فلک

نبی بخش نام ۔ فلک تخلص ۔ وطن دتیا (مدھیہ پردیش) اُردو اور ہندی دونوں زبانوں کے کامیاب شاعر تھے ۔ ابتدا میں اُردو غزل گوئی کا شوق رہا ۔ پھر ہندی کی طرف مائل ہوئے ۔ ہندی میں آپ نے بھگتی سے بھرپور نظمیں اور گیت لکھے ہیں ۔ آپ کی آواز بڑی شیریں اور لحن بڑا سُریلا تھا ۔ سویّا اور دھنا کھشری پڑھنے میں لاثانی تھے ۔ اکھل بھارتیہ کوی سمیلنوں میں فلک صاحب کو خاص مقام اور خاص اہمیت حاصل تھی ۔ آپ کی زبان برج بھاشا ہے اور کہیں کہیں کھڑی بولی کا عنصر بھی نمایاں ہے ۔ آپ نے سماج سدھار ۔ ہندو مسلم یکجہتی پر زور دیا ہے ۔ وہ اپنی نسبت یوں فرماتے ہیں ؎

کبت

رام یا رحیم رحمان کا نہ بھید مان مندر میں مسجد روج (روز) روج جاتا ہوں

قرآن کریم ، حدیث شریف کے ۔ وید و پُران کے سدیوگیت گاتا ہوں

میرے یہاں کاشی اور کعبہ میں بھید بھاؤ سادھوؤں فقیروں پہ سر نتا دکھاتا ہوں

ہندی کی زبان ہندی اُردو کا گمان مجھے ذبنیاؔ نواسی کوئی فلک کہاتا ہوں

بات بھی ایسی ہی تھی ، فلک صاحب باقاعدگی کے ساتھ پانچ وقت نماز پڑھتے تھے ۔ پابندی کے ساتھ روزے رکھتے تھے ۔ ساتھ ہی ہندو دیوی دیوتاؤں کا احترام تہ دل سے کرتے تھے ۔ ایک جگہ بھگوان سے اپنی عقیدت کا اظہار یوں کیا ہے ؎

دوہا

جن پد پدمن سوبھئی سُرسری پوجیہ جہان

تِن پد پنکج کو ورت سدا فلک میاں آن

کبت

جون پد ہی سوں پوجیہ گنگا کو پرواہ بھئو

جون پد چھوائے بہا گوتم کی تاری ہے

جوں پد پوجن کیو ہے دھرم راج پدنی
جون پد دھوئے گنگی کیوٹ سدھاری ہے
جون پد پریم سوں پلوٹیں مہارانی رماں جاکے گن شاد سپاری گائے ہاری ہے
سوئی پد پنکج کی پریم پنیت بھور موری سنجونی سو فلک سیس دھاری ہے

کنڈلی

گورو نانک کی بھاونا دینی یہ پدیش
بھید بھاؤ کو تیاگ کر نر بھئے رہو ہمیش
نر بھئے رہو ہمیش سمجھو پر بھو کو مالک
سکل جگت کا ایک ہی کرتا پر بھو ہی پالک
کرنے کو دکھ دور بھگت کے دکھ بھیانک
لیتے ہیں اوتار فلک جگ میں گورو نانک

۱۹۵۰ء کے قریب ۸۰ برس کی عمر میں وفات پائی۔ ان کی کرشن بھگتی کہہ رہی ہے کہ فلک صاحب دورِ حاضرہ کے رس کھان تھے۔

(از سپتاہک پرتاپ ۱۴ر جولائی ۱۹۵۸ء)

۸۔ خلیل

امین الدولہ امیر الملک نواب حافظ محمد ابراہیم علی خاں صولت جنگ والئ ریاست ٹونک، اردو میں خلیل اور ہندی میں ابراہیم تخلص کرتے تھے۔ ۲۲ ماہ ذی الحجہ ۱۲۶۵ھ کو پیدا ہوئے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں ۱۲۸۴ء میں مسند نشین ریاست ٹونک ہوئے۔ آپ پنڈاروں کے مشہور سردار امیر خاں کے پوتے اور نواب محمد علی خاں کے صاحب زادے ہیں۔ آپ اردو۔ فارسی اور ہندی تینوں زبانوں کے بلند پایہ شاعر ہیں۔ آپ کے تین دیوان اردو۔ فارسی۔ ہندی موجود ہیں۔ آپ نے ۲۶ سال حکومت کی۔ جون ۱۹۳۰ء میں وفات پائی۔

نمونۂ کلام

جاڑن کی دھوپ نیکو۔ شبد مدھر نیکو
کہن سوں چوپ نیکو۔ دھیر نیکو کام کو
اوتم اسیس نیکو۔ بھجے سو سیس نیکو
ٹکے سو بیس نیکو۔ نیکو گیان سیام کو

رہے تو بھرم نیکو۔ بچے تو دھرم نیکو | خلیل کرم نیکو نیکو ربّ اسلام کو
چلن کو پاؤں نیکو۔ رہن کو ٹھاؤں نیکو | جپن کو ناؤں نیکو۔ ناؤں نیکو رام کو

ٹھمری

رس میں رسیا مگن بھئے رے | آت بسنت بہار رنگ بارے
پریتم پیا نے بس کر راکھے | من میں سوچے کرت سکھیا رے
ابراہیم کہا پُھو کیجیے | جون ہو وے سدپل بسنت بہیر رے

رس میں رسیا مگن بھئے رے

ٹھمری

رنگ میں آج بسنت بھلے رے | کچھ لتون میں کسم کھلی رے
کوئل گونج بھنور گنجت ہیں | پون مُدر رکر ند چلی رے
ابراہیم سجن سجنے دور | ہل ہل پھول بہار لہی رے

(عطیہ ولی احمد قدسی جے پوری)

۹۔ سحر

صاحب زادہ محمد شفیق خاں خلف صاحب زادہ عبد الحکیم خاں مرحوم، ابن صاحب زادہ حافظ محمد جلال خاں مرحوم ابن نواب امیر الدولہ والیٔ ٹونک سنِ ولادت ۱۲۸۵ھ ہے درسی کتابیں حکیم محمد اصغر آبروؔ سے پڑھیں لیکن دیگر فنون مثلاً شناخت وساخت کبوتران پری پرواز، و مرغانِ جنگ باز، سے زیادہ رغبت رہی۔ شعر اُردو میں کم کہتے تھے۔ بھاشا اور موسیقی میں اچھی مداخلت رکھتے تھے۔ نمونۂ کلام

ٹھمری

پیا بن تڑپت ہوں دن رتیاں
اُن بن جیا گھبراوے۔ چین نہیں آوے۔ کاسے کہوں میں سکھی ری۔ اپنے من کی بتیاں
پیا بن تڑپت ہوں دن رتیاں

نس اندھیاری کاری۔ جیا ڑاڑا دے۔ سحر پیا پردیس سدھارے۔ جا کے کوئی آئی جھا

دھڑکت ہیں موری چھتیاں

پیا بن ترپت ہوں دن رتیاں

ہولی

موری رنگ سے بھجوئے ڈاری سگری چندر

بسو جھیل تھے کیوا لیسو نا مختی جانت تم کو شیام سندر ۔۔۔۔ موری رنگ سے ۔۔۔۔

سحر پیا تم سے ہوری نہ کھیلیوں۔ جات رہے اجی دیکھو موے منڈ ۔۔۔ موری رنگ سے ۔۔۔۔

ملہار

آئی گھٹا اِت جھوم بیاری بیاری

کارے کارے بادل چھائے۔ چمکے دامنی نیاری نیاری ۔۔۔۔۔ آئی گھٹا ۔۔۔۔

ہا ہا کھات وا کے پیا پرت ہوں۔ یار بار ڈاکی منتی کرت ہوں ۔۔۔۔۔ آئی گھٹا ۔۔۔۔

سحر پیا موری مانت ناہیں۔ تو ہی سکھی سمجھائے جاری ۔۔۔۔ آئی گھٹا ۔۔۔

(تاریخ محمدی المعروف تاریخ راجستھان ٹونک صفحہ ۳۶۹ لغایت ۳۷۱)

۱۰۔ آبرو

حکیم سید محمد اصغر علی نام۔ آبرو تخلص۔ حکیم سید انور علی رامپوری کے بیٹے تھے۔ سنہ ۱۲۶۹ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد رام پور سے آکر نواب امیر الدولہ والئی ٹونک کے ملازم ہوئے۔ آبرو کے والد کا انتقال کم سنی میں ہو گیا۔ اس نے تعلقات قدیمہ کا لحاظ کرتے ہوئے نواب ٹونک نے ان کی پرورش کی۔ ابتدائی تعلیم ٹونک میں حاصل کی۔ پھر تکمیل کے لئے رام پور آئے، جہاں سے علوم مروجہ میں مہارت حاصل کر کے واپس ٹونک چلے گئے اور تمام عمر دربار ٹونک سے منسلک رہے۔ ملک الشعرا اور معتمد الملک کا خطاب پایا۔ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ اردو۔ فارسی اور ہندی کے زود گو اور کامیاب شاعر تھے۔

نمونۂ کلام

آ بہروسے برہا کا تورے ناؤ دکھ بھیلو جات
چھب پیا بیچے نت توری نت جیپےگھن توری کات
ڈوبے پچھی تو ڈال ڈال ڈالوں بھوں پات پات
بروا بھی ابن ہونہار۔ آئی گھٹا ساقیا....
(تاریخ محمدی ۱۳۱۰ھ المعروف حدیقۂ راجستھان ٹونک)

۱۱۔ یوسف ہندی

حکیم یوسف علی نام۔ ننھے صاحب عرفیت۔ یوسف تخلص۔ آپ کے والد حکیم بندہ علی بانس بریلی کے سیّد زادے تھے۔ انقلاب ۱۸۵۷ء سے پہلے تلاشِ معاش میں بریلی سے لکھنؤ پھر عہد واجدی میں محمود آباد (ضلع سیتاپور) میں سکونت اختیار کی۔ یہاں ۱۸۶۹ء میں یوسف ہندی پیدا ہوئے۔ آپ کے آبا و اجداد فنونِ سپاہ گری کے ماہرین میں سے تھے، لیکن یوسف کی ابتدائی زندگی ٹھیکہ داری سے شروع ہوئی۔ عہد انگریزی میں سیتاپور اور محمود آباد کے قرب و جوار میں اکثر سڑکوں پر ادنٹ گاڑیوں کی ڈاک چلا کرتی تھی اُس کا ٹھیکہ مستقل طور پر یوسف کے پاس تھا۔ جب ریلوے لائن جاری ہوگئی تو یہ کاروبار ختم ہوگیا اور آپ ریاست محمود آباد کی ملازمت سے وابستہ ہوگئے۔ یہاں ۱۹۵۷ء تک اپنے فرائض انجام دیتے رہے اور اب پیرانہ سالی کے باعث خود علیحدہ ہوگئے ہیں۔ ان کے کلام کا زیادہ حصّہ تلف ہوگیا۔ نعتیہ کلام کے علاوہ ان کی ہندی نظم "جنگنامۂ خیبر" ہندی کی ایک بہترین رزمیہ نظم کہی جاسکتی ہے۔ علاوہ ازیں آپ نے تلسی داس کے دوہوں پر اُردو شاعری کے انداز سے تضمین کی ہے۔

نمونۂ کلام

ناہیں یوسف تورے بن اب جیو کو مورے چین
نینن نیر بہا دت ہوں، او رتڑپت ہوں دن رین

ڈوج کا چندرماں

امی کہن چڑھی ہوں ایہہ کارن بن اُنّا پہ ہوبے چین
کہ پا بھئی جو ایشور کی، تو ملہیں نین سے نین

آج چندرما ڈوج ہے کہ جگ چتوت اوٹے اور
مورے اُورنند لال کے اَب ہوئیں نین اک ٹھور

دوہا

گجرامرگ اس نین ما جور اجس سندر نار
اسچرج ہے یا سنسار کہے بھئی کیہوں سانجھ سکار
نترنرک اِس بھجکرہے اور متے چھونوار
امیں ہلاہل مدبھرے سویت شیام تنار
جیئت مرت جھک جھک پرت جہہ چتوت یکبار
(عطیہ سید محمد کبیر صاحب عادل سیتا پوری محافظ قلعہ معلی محمود آباد)

۱۲۔ رونق

احمد علی خاں نام ۔ رونق تخلّص ۔ ہندی میں احمد تخلّص ۔ نواب زادہ خاندانی اعزاز ۔ اصل وطن ٹونک (ریاست) تھا مگر مستقلاً سکونت جے پور اختیار کی۔ آپ نواب امیر خاں بانی ریاست ٹونک کے فرزند ہفتم تھے۔ بعد وفات نواب صاحب موصوف جب آپ کے برادرِ کلاں نواب وزیرالدولہ سریرآرائے ریاست ہوئے تو انھوں نے آپ کا بیس ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کیا۔ مگر آپ کا مطالبہ ایک لاکھ روپیہ سالانہ کا تھا جو نامنظور ہونے کے باعث ناخوش ہوکر ٹونک سے جے پور آگئے۔ مہاراجہ سوائی رام سنگھ والیٔ جے پور سے حسبِ دستور ریاست ملاقات ہوئی۔ جنھوں نے آپ کے ذاتی و اضافی اوصاف کی قدر کی اور دوستانہ طریق سے پیش آئے۔ پانچ سو روپیہ ماہوار

مقرر کیا اور رہائش کے لئے ایک وسیع احاطہ عطا کیا۔ نیز خاص امرا کے درباری اعزاز بھی عطا ہوئے۔ وہ مکان اب آپ کے پوتے صاحب زادہ ولی احمد خاں قدسی ایم اے کے قبضہ میں ہے۔ آپ کو سن شعور ہی سے شعر و سخن سے دل چسپی تھی۔ نوازش علی خاں تنویر امراؤ مرزا انور۔ اور اُستاد ظہیر سے استفادہ کیا۔ ۱۴ اکتوبر ۱۸۹۰ء کو جے پور میں انتقال کیا۔ ایک مطبوعہ اور ایک غیر مطبوعہ دیوان اُردو یادگار چھوڑے۔

آپ کے ہندی کلام کا نمونہ درج ذیل ہے۔

دوہا

احمد بالک پڑھن میں کہو کس بدھ جھولا کھائے
وِدّیا تن رتن گھٹ ہے بھرت ہلائے ہلائے

حاکم انرتھ۔ نردھن مَنش۔ ویشیہ انگ کرنگ
کہو احمد کیسے بنے بِن ہتھیاروں جنگ

تنک کنکری پڑتے ہی نین ہووت بے چین
اُن نینن میں چین کہاں جب گڑے نین میں نین

اچرا اے دیپک چلی درشٹ بڑی بجھوائے
ہر دھنت ہے کر بنا کس کس بدیگراں جائے

(عطیہ صاحب زادہ ولی احمد خاں قدسی جے پوری۔ ایم۔ اے)

۱۲۔ عظمت اللہ خاں

ہندی کے پنگل اور اُردو کے عروض کو ایک دوسرے سے قریب لانے والے پہلے شاعر اگر کوئی عظمت اللہ خاں ہیں۔ اُردو شاعری میں انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد جالی

اور آزاد نے جو تبدیلیاں شروع کی تھیں عظمت اللہ خاں نے اُنھیں ہندی میں سموکر بہت کچھ مقصد حاصل کیا۔ آپ نے نہ صرف اُردو عروض میں تبدیلیاں کیں بلکہ ہندی کے پنگل کو بھی اسی لحاظ سے بدلا تاکہ ان دونوں زبانوں کی شعری ضرورتیں بدلے ہوئے حالات کا ساتھ دے سکیں۔

عظمت اللہ خاں کی اس تحریک کی ابتدا ۱۹۲۰ء سے ہوئی، اور یہ وہی زمانہ ہے جب علامہ نظم طباطبائی نے پہلی بار اُردو شاعری کو ردیف و قافیہ کی قید سے آزاد کرنے کی کوشش شروع کی تھی۔ عظمت اللہ خاں نے ۱۹۲۴ء میں "اُردو عروض اور ہندی پنگل" میں ردّ و بدل کرنے کے لئے رسالہ "اُردو حیدرآباد دکن" میں ایک مضمون شائع کیا۔ جو کافی مقبول ہوا، اور یہی مضمون ان کی اس تحریک کا آغاز و اختتام کہا جاتا ہے۔ افسوس کہ آپ کے حالاتِ زندگی ہنوز سامنے نہیں آئے۔ صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۲۷ء میں وفات پائی۔

"اُردو زبان و ادب" میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے عظمت کی ہندی شاعری کا یہ نمونہ پیش کیا ہے۔ ۵

تری ناگن کی سی آنکھ ترے بال کالے کالے
اس میں موتی کی سی آب یہ موج سے لہراتے
تری بانکی منوالی ناک ترے ہونٹ امرت والے
وہ حسن کی گویا جان، یہ جان کو گرماتے

(مرسلہ نادم سیتاپوری) - ۵ اُردو زبان و ادب۔ صفحہ ۱۶۰
از ڈاکٹر مسعود حسین مطبوعہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۴۹ء

۱۴۔ حسرت موہانی

سید فضل الحسن نام اور حسرت تخلص تھا۔ والد کا نام سیّد اظہر حسن تھا۔ آپ خاندان سادات کے نمایاں افراد میں سے تھے۔ آپ کے جدّ اعلیٰ سیّد محمود نیشاپور سے موہان ضلع

اناؤ (یو۔پی) وارد ہوئے تھے۔ گھر میں ابتدائی تعلیم ہوئی۔ علی گڑھ کالج سے ۱۹۰۳ء میں بی۔اے پاس کیا۔ ابتدا ہی سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ امیر اللہ تسلیم لکھنوی سے تلمذ اختیار کیا۔ دلّی کا رنگ آپ میں نمایاں تھا، مگر لکھنؤ کا اثر بھی زبان پر کافی پڑا۔ آخر دم تک کانگرس کے حامی رہے۔ جہاں اُردو ادب کے مجددین میں آپ کا شمار ہے، وہاں ہندی شاعری میں بھی خوب جوہر دکھائے ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

مو پر رنگ نہ ڈارو مراری　　منتی کرت ہوں تہاری
پنیا بھرن کو جائے نہ دیہیں　　شیام بھرے پچکاری
تھر تھر کانپت لاجن حسرت　　دیکھت ہیں نر ناری

کہاں چھاڑ ہے گردھاری　　اور ن پل سُدھ بھول ہماری
روَت۔ دھووت۔ تلپت بلکت　　نینن میں رین گئی کٹ ساری
جیا جلت بر کھا رُت حسرت　　دیکھ دیکھ بدریا کاری

برہا کی رین کٹے نہ پہاڑ　　سونی نگریا پڑی اُجاڑ

۵۱۔ علی امجد حسین

علی امجد حسین (مولوی۔ قاضی۔ امجد الافاضل) ابن مولوی فضل حسن، شیوخ صدیقی۔ محمدی ساکن بدایوں تھے۔ ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۸۳۴ء میں پیدا ہوئے۔ اُردو۔ فارسی۔ انگریزی اور سنسکرت میں شعر کہتے تھے۔ تین دیوان اُردو کے۔ دو دیوان فارسی کے مطبوعہ ہیں۔ علاوہ ازیں اکثر کتب اور رسالے اُردو۔ فارسی بھاشا میں تصنیف و تالیف کئے۔ مولانا مذاق بدایونی کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ ۱۳۰۶ھ مطابق ۱۸۸۸ء میں عرب و حجاز وغیرہ کا سفر کیا۔ چہاردہ معصومین علیہم السّلام کے زائر تھے۔ فریضۂ حج و زیارت مدینہ منورہ سے مشرف ہوئے۔ سلطانِ ایران کی طرف سے ان کو "امجد الافاضل"

اور ان کے چھوٹے بھائی حکیم جعفر حسن کو (جو ان کے ہم سفر تھے) شمس الاطباء کا خطاب ملا۔ اپنے وطن بدایوں میں ایک امام باڑہ تعمیر کر کے وقف کر دیا سرکار انگریزی کی طرف سے قاضی شہر تھے۔ ۱۳۳۷ھ مطابق ۱۹۱۸ء میں ان کی وفات ہوئی اور اپنے تعمیر کردہ امام باڑہ میں دفن ہوئے۔ (قاموس المشاہیر جلد دوم صفحہ ۹۳)

۱۶۔ قدر بلگرامی

مولوی غلام حسین ولد سید غلف علی۔ قدر تخلص۔ بلگرام ضلع ہردوئی کے باشندے نسبتاً زیدی سادات۔ ۱۲۴۹ھ مطابق ۱۸۳۳ء میں بمقام بلگرام پیدا ہوئے۔ علوم عربیہ لکھنؤ میں حاصل کئے۔ ابتدائے شاعری میں برق و سحر سے اصلاح لی۔ بعدہ شیخ امداد علی بحر سے تلمذ کیا۔ غدر کے بعد دلی چلے آئے اور مرزا غالب کے شاگرد ہوئے۔ آخر عمر میں سرکار آصفیہ میں ملازم ہو گئے۔ "قواعد العروض" اور "اعجاز خسروی" کا حاشیہ لکھا۔ صنائع بدائع و عروض سے کافی واقفیت تھی۔ پنگل یعنی عروض ہندی بھی جانتے تھے۔ ۲۳ ذی قعدہ ۱۳۰۱ھ مطابق ۱۸۸۳ء میں لکھنؤ میں انتقال ہوا۔

(قاموس المشاہیر۔ جلد دوم۔ صفحہ ۱۴۰)

۱۷۔ ابو الجمال محمد احسن سخن

آپ صوبہ بہار کے ایک کہنہ مشق شاعر گزرے ہیں۔ اردو شعر و ادب کی آپ برابر خدمت کرتے رہے۔ ۱۹۰۲ء سے کر جب تک اخبار "الپنچ" قائم رہا آپ سرگرم لکھنے والوں میں رہے۔ اردو۔ فارسی کے علاوہ ہندی بھاشا پر بھی آپ کو کافی قدرت حاصل تھی۔ آپ کا انتقال ۱۹۳۶ء میں ہوا۔

(بہار اور اردو شاعری۔ صفحہ ۱۲۲)

۱۸۔ سید مقبول حسین

سید مقبول حسین۔ باپ کا نام سید عابد حسین۔ سال ولادت ۱۹۰۵ء وطن اور جائے ولادت قصبہ احمد پور ضلع بارہ بنکی، ملک اودھ۔ بچپن کا زمانہ احمد پور کے مقامی مدرسہ میں گزرا۔ حافظ مولوی وکیل احمد سے فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ علم دینیات مولوی ذوالفقار علی رحمتہ اللہ علیہ سے حاصل کیا، تصوّف و طریقت کا فیض پیر ابو احمد کی صحبت سے اُٹھایا۔ جہاں گیریہ ہائی اسکول بھوپال سے میٹرک اور آگرہ کالج سے بی۔ اے پاس کیا۔ کچھ دن ملازمت بھی کی۔ چیف کورٹ لکھنؤ میں ترجمان بھی رہے۔ آپ کو ہندی کا شوق ورثہ میں ملا تھا۔ آپ کے والد بہت اچھی ہندی جانتے تھے۔ اس لئے اُنھوں نے آپ کو ہندی کی تعلیم دی۔ امین الدین وارثی سے ہندی کلام کی اصلاح لی اور ہندی شعر کہتے کہتے کوی راج بن گئے۔ نمونہ کلام ؎

میگھ ملہار

لاگ اساڑھ چلی پوروَیا گھورے بدرا چھائے
کرے کلیل بچھیڑا بَن میں، گوالا شور مچائے
جھیل کنارے بگلا ڈولے سارس دوڑ لگائے
چھائیں مائیں کھیلن بالک، بالک گوڑ ڈھول بجائے
بوندا برسیں، ہَوا چلے اور برچھ جھکولے کھائے
لاگ اساڑھ چلی پوروَیا، گھورے بدرا چھائے

گیت

تن بیاکل من بھولا   بھری نین کی گاگریا
شیام برن نے منموہن نے   کیسی بجائی بانسریا

نعت

جب سے آئی صدا سہانی   آدھی دُنیا ہے دیوانی

ختم ہوئی تم پر سرداری — دُکھی دلوں میں آس تمہاری
سنو پکارے کوئی بھکاری — کملی والے شیام مراری

پورب سے پردیسی آیا
بوجھ پاپ کا سر پر بھاری

بھجن

بنسی دھر مہراج ہمارے — ہردے کنج میں بنسی بجاؤ
سب بھگتوں کے راجہ ہو تم — گیان دھیان کی راہ سمجھاؤ

رادھا سوامی انتریامی
پریم بھجن سے من کو رجھاؤ

(منقول از رسالہ رہنمائے تعلیم، لاہور نومبر ۱۹۴۰ء صفحہ ۲۸ تا ۳۱)

۱۹۔ آغا حشر کاشمیری

آغا حشر کاشمیر مرحوم بھاشا کے نہایت اچھے فاضل تھے، اور اس زبان کی نظم و نثر پر انھیں پوری قدرت حاصل تھی۔ آپ ہندی شعر گوئی کے علاوہ ڈراما کے آسمان کے درخشندہ ستارے تھے۔ آپ سے پہلے ڈراموں میں ایک ہی پلاٹ، ایک وقت میں دکھانے کا التزام تھا۔ آپ کی تنوع پرور طبیعت نے دو پلاٹ ایک ہی کھیل میں دکھائے۔ آپ نے اُردو کے علاوہ ہندی ڈرامانگاری میں بھی کمالِ فن کا ثبوت دیا۔ آپ کی تصانیفِ ہندی و اُردو کی فہرست طویل ہے۔ آپ کے ہندی ناٹک "سورداس"۔ "گنگا وترن" "بن دیوی"۔ "مدھر مرلی" مشہور ہیں۔ (رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور، ماہ ستمبر ۱۹۳۵ء صفحہ ۸)

۲۰۔ آغا شاعر قزلباش دہلوی

آغا ظفر علی بیگ نام۔ قزلباش خاندانی لقب۔ شاعر تخلّص۔ دہلی کے رہنے والے۔ ۱۸۷۱ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ دنیائے شاعری میں خاص شہرت کے مالک ہیں

طبیعت لڑکپن ہی سے چلبلی اور شوخ تھی، اس پر حضرت داغ کی صحبت سونے پر سہاگہ ثابت ہوئی۔ داغ کے خاص تلامذہ میں سے تھے۔ پہلے نواب احمد سعید خاں طالب رئیس لوہارو پھر حیدر آباد دکن میں مہاراجہ کشن پرشاد کے پاس رہے۔ پھر نواب نصیر الملک داماد بیگم صاحبہ مرشد آباد کے مصاحب رہے۔ وہاں سے افسر الشعراء کا خطاب پایا۔ آخر میں مہاراجہ جھالاواڑ کے درباری شاعر رہے۔ بقول مؤلف خم خانۂ جاوید ان کی طبع رسا ان کے جوہر تغزل کی اصل شان ہیں۔ ان کا ایک مختصر اردو دیوان "تیر و نشتر" کے نام سے یادگار ہے۔ علاوہ ازیں قرآن مجید کا ترجمہ اردو نظم میں کیا۔ ان سب خوبیوں کے ساتھ ساتھ ہندی کے بھی دلدادہ تھے اور ہندی بھاشا میں خوب کہتے تھے۔ تاریخ وفات کا پتہ نہیں چل سکا۔

نمونۂ کلام ہندی۔ ـــ

بھگوان کرشن سے خطاب

اے بنسی دھر اس بنسی کے پھر بول سنا دے متوالے
پھر برکھا رت گھر آئی ہے پھر بادل ہیں کالے کالے
سرسبز ہیں کنجیں بھارت کی لبریز ہیں دریا کے پیالے
پھر کاشی جی سے ابر اٹھا پھر جل تھل ہیں ندی نالے
پھر گائے بھینسیں دودھ بھری گھی مکھن بھوگ لگاتے ہیں
پھر چھم چھم مینہا برست ہے پھر سارس شور مچاتے ہیں

اے نرگسی آنکھوں والے تو کچھ ایسا منتر پھونک یہاں
شاعر کی طرح سے دیش بھگت سب قومیں ملکر ہوں قرباں
سب بھائی برادر بن جائیں سب لال ہوں اس کے ایک ہے ماں
سب کشت ہمالے کٹ جائیں بیکنٹھ بنے یہ ہندستاں
سب دیش پجاری بھارت کے خود اپنے دلوں پہ راج کریں
[illegible] وہ آج کریں

جب کالی گھٹائیں گھرتی ہیں اور برکھا نیر بہاتی ہے
اے بیتم پیارے کہاں ہو تم، یہ برکھا آہ ستاتی ہے
جن جن کے پتی ہیں گھر اپنے، وہ سکھیاں خوش خوش گاتی ہیں
یاں ہجر کی اکیلے پن سے پیا، اُف نیند نہیں اب آتی ہے
کیا ساون کا میں ذکر کروں یہ بھادوں بھی تو بیت چلا
تم جان مری کس دیس گئے کیوں کوئی خبر نہیں آتی ہے
(منقول از ماہنامہ اوم دہلی بابت ماہ اگست ۱۹۶۱ء صفحہ ۳۱)

۱۷۔ سلیم چھنّاروی

شیخ سلیم چھنّاروی مقام چھندواڑہ مدھیہ پردیش میں انگریزی کلکٹر آفس میں گرام سیوک ہیں۔ وطن چھنّاروی ہے۔ آپ کی ولادت مورخہ ۲۸ دسمبر ۱۹۴۰ء میں ہوئی۔ میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ نے ملازمت اختیار کر لی۔ اُردو اور ہندی دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ مشاعروں اور کوی سمیلنوں میں آپ کو مقبولیت حاصل۔ اُردو میں عاشق چھندواڑوی سے اصلاح لیتے ہیں، اور ہندی میں بذاتِ خود عبور رکھتے ہوئے کہتے ہیں۔ بڑے پُرخلوص اور ملنسار آدمی ہیں۔ نمونہ کلام ہندی ملاحظہ ہو

گیت

بولو کس کو گیت کہوں میں کس کو اپنا پن دے ڈالوں
اپنوں کے چہروں کے پیچھے چہرے کتنے بے گانے ہیں
کون چھپا کس کھال میں بیٹھا کون ہرے میں کیا ٹھانے ہیں
پگ پگ کپٹ جہاں پلتا ہے، چھل کی لگتی نت نت گھاتیں
چھری بغل میں داب بہار، پر دیش دھرم کے پیار کی باتیں
بولو کس کو گیت کہوں میں، کس کو اپنا پن دے ڈالوں

مُسکانوں پر ہے پابندی، مادھو ماسوں کو نت جھڑ گھیرے
پھولوں پر شولوں کے آنکش، آپ ہیں پر بدھکوں کے پہرے
پات پات کھپت شندکا سے پاندھ پاندھ بھی بھیت جہاں ہو
وچلت آہیں ٹوٹا ٹوٹا، شو اسنسوں کا سنگیت جہاں ہو
بولو کس کو گیت کہوں میں کس کو اپنا پن دے ڈالوں
ہردے کی سو آہیں نہیں کھلتا، پیار ہردے سے نش کا ستا ہے
ستیہ سسکتا پیپتوں میں، جھوٹ سنگھاسن پر آسنت ہے
کھرے کھرنا کے پاتر جہاں پر گیتوں کی پوجا ہوتی ہے
جہاں اپیکشت کر مٹھتا ہے، چھپا پوس مالا کا موتی
بولو کس کو گیت کہوں میں کس کو اپنا پن دے ڈالوں

۲۲ - سردار

یہ کاشی کے راجہ مہاراج ایشوری نارائن سنگھ کے درباری شاعر تھے۔ ان کی شاعری کا زمانہ سمت ۱۹۱۲ بکرم سے سمت ۱۹۴۰ بکرم تک کہا جا سکتا ہے۔ یہ ہندی شاعری کے بہت ہی مشہور مستند اور مسلم الثبوت استاد تھے۔ انھوں نے ہندی شعر و ادب کے ماتحت بہت سی کتابیں لکھی ہیں مثلاً "ساہتیہ سرسی"، "واگ ولاس"، "کھٹ رتو"، "ہنومت بھوشن"، "تلسی بھوشن"، "شرنگار سنگرہ"، "رام رتناکر"، "ساہتیہ سدھاکر"، "رام لیلا پرکاش"۔ ان کتب کے علاوہ انھوں نے ہندی کی پرانی شاعری پر نقد و نظر سے متعلق کتب لکھی ہیں۔ مثلاً کوی پریہ، رسک پریہ، سور کے دِشٹی کوٹ اور بہاری ست سئی پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ (ہندی ساہتیہ کا اتہاس۔ از رام چندر شکل صفحہ ۵۷۸)

۲۳ - حلم

محمد جمال الدین خاں نام، مرزا قلی بیگ بہادر خطاب، حلمؔ تخلص، حیدرآباد کے

رہنے والے رہے۔ ۱۳۴۷ھ میں انتقال کیا۔ مدت تک نواب عثمان علی خان بہادر، حیدرآباد دکن کے اے۔ ڈی۔ سی رہے۔ اردو شعر گوئی کے علاوہ بھاشا میں ٹھمریاں خوب کہتے تھے ان کو دکن کا امیر خسرو کہا جاتا ہے۔ "پیت کی ریت" کے نام سے ان کی ٹھمریاں ان کے فرزند دلبند محمد نظام الدین خاں صبر نے ۱۳۵۲ھ میں طبع کرائی تھیں۔ ہر ٹھمری کے ساتھ راگ کا نام اور وقت درج کر دیا گیا ہے۔ ان کی ٹھمریاں سامعین پر ایک وجدانی کیفیت پیدا کر دیتی ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو:-

ٹھمری

راگ گوری　　　وقت مغرب

کس کی صورت ہے ہر گھٹ میں ... سادھو

آپ گورو جی، آپ ہی چیلے　　آپ ہیں اپنے مٹ میں ... سادھو
کس کو پڑی ہے بھیت گھٹ جائے　　کون پڑے کھٹ پٹ میں ... سادھو
کاہے کو ڈھونڈت حلم پیا کو　　تورا پیا گھونگھٹ میں ... سادھو

راگ کھماچ　ٹھمری　نو بجے رات کے

نیند کی ماتی میں کو جگا کر　　کیسی بتیاں میں پھنسائے ... سکھی ری
سوتی تو کیوں دکھتی دکھوا　　ناحک چونکی میں ہائے ... سکھی ری
من سے بھلا کر وہ پچھلی باتیں　　حلم ہی نام دھرائے ... سکھی ری

راگ ملار　ٹھمری　موسم برسات

ہیم کی چوٹ ہے بالے پن سے　　بیکل ہوں میں بہت دنن سے
ڈولی ڈولا کچھ بھی لاؤ　　آجھو جا کے ملوں گی سجن سے
حلم برہ کا بھولوں گی دکھ　　لاگ رہوں گی وا کے چرن سے

۲۴۔ عثمان

نواب میر عثمان علی خان بہادر شہریار دکن، ۲۹ جمادی الاول ۱۳۰۳ھ مطابق ۵ اپریل ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے۔ پانچ سال کی عمر میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہوا۔

مولانا انوار اللہ خاں سے عربی اور مذہبی تعلیم پائی۔ نواب عماد الملک سے اُردو اور آغا سید علی شوستری سے فارسی اور مسٹر ایجرٹن سے انگریزی کی تکمیل کی۔ ۲۹ راگست ۱۹۱۱ء کو تخت نشینی کی رسم ادا ہوئی۔ تخت نشینی کے بعد آپ نے رعایا کی فلاح و بہبود کے لئے ہر ممکن سعی فرمائی۔ ۱۳۳۶ھ میں حیدرآباد میں عثمانیہ یونیورسٹی قائم کی۔ شعر و سخن کا شوق بچپن سے تھا۔ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں شعر گوئی کے علاوہ برج بھاشا میں بھی ان کا کلام بڑا بلند پایہ ہے۔ اردو میں جلیل سے مشورۂ سخن کیا۔ آپ نواب میر محبوب علی خاں شاہِ دکن کے بڑے فرزند ہیں۔ چند سال ہوئے انتقال کیا۔ ہندی میں آپ اپنا تخلص ساجن اور اردو میں عثمان فرماتے ہیں۔ نمونہ کلام

ٹھمری

نکلنا ری ہیں کو مارت ہے پچکاری	گاگر میں کیسا رنگ بھرا ہے
وہ بھی کھرا رنگاری	ساجن پپیا تو لے تین رسیلے

وار لگا ایسی کاری

گیت

مارے جوبنا پہ ہاتھ کس نے ڈالا سکھی
لاج گنوائی جگ میں بھی ساجن کیسی ٹھول نکالا سکھی

(بعطیہ جناب عبدالرزاق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اُردو حیدرآباد (دکن) یکم نومبر ۱۹۵۹ء)

نوٹ:۔ سید تسکین عابدی نے اپنی تصنیف "سخنورانِ دکن" میں نواب صاحب مذکور کی تاریخ ولادت سنہ جمادی الثانی ۱۳۰۲ھ اور تاریخ تخت نشینی ۲۹ رمضان ۱۳۲۹ھ لکھی ہے۔ (راقم ظہیر منظر)

۲۵۔ احسان

محمد احسان علی خاں نام۔ احسان تخلص۔ میاں عرفیت۔ حاجی محمد علی خاں کے فرزند ہیں۔ حضرت داغ کے نواسے ہوتے ہیں۔ آپ کے جدِ امجد رام پور سے جے پور آئے۔ آپ کے والد ماجد رام پور میں پیدا ہوئے۔ لیکن احسان ۱۱ محرم ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۰ اکتوبر

۱۸۸۵ء بروز پنج شنبہ جے پور میں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم و تربیت پائی۔ ریاست میں آپ کا سلسلہ ملازمت نائب ناظم سے شروع ہوا اور نائب فوجدار کے عہدے تک پہنچے۔ موسیقی اور شعر و سخن سے بڑی رغبت تھی شعر گوئی کا چسکا مرزا داغ نے لگایا۔ گویا آپ حضرت داغ کے تلمذ کا شرف رکھتے ہیں۔ اردو شاعری کے علاوہ آپنے ہندی شاعری میں بھی کمال حاصل کیا ہے۔ نمونہ کلام

دادرا — تال کہروا

لاگی کلیجوا میں چوٹ نینن کی تورے — احسان پیا تم بڑے ہرجائی
ایسی کچھ نیناں کی کھوٹ نینن میں تورے — لاگی کلیجوا میں چوٹ ......

دیگر — تال کہروا

سکھی ری دیکھو پیا موا بی ترسائے — احسان پیا توری بنتی کرت ہوں
کاہے کا گروا لگائے — سکھی ری

دیگر — دادرا

جاؤ جاؤ مورے پاس ناہیں آؤ — جن سنگ سگری رین گجاری (گزاری)
اب انہیں کو گروا لگاؤ — جاؤ جاؤ ....
احسان پیا اب چھیڑو نا نینا — سوتنیا سے نیہا لگا
جاؤ جاؤ مورے پاس ناہیں آؤ

دیگر — دادرا

جاگت جاگت رین گجاری — سونے دے میکا مورکھ ناری
ہا ہا کھات توری بنتی کرت ہوں — احسان پیا تورے جاؤں بلہاری

بسمل

بسمل صاحب کے صاحبزادے سید مصباح الرحمٰن نے ۳ ستمبر ۱۹۵۸ء کو آپ کے حالات و نمونہ کلام عطا فرمایا، جو بصد شکریہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

حالات

رئیس الشعرا مولوی سید انوار الرحمٰن صاحب بسمل نیازی جیپوری کے جد امجد امام العارفین حضرت سید قربان علی صاحب نقش بندی مجددی مہاراجہ رام سنگھ آنجہانی کی خواہش پر آگرہ سے ترک سکونت کر کے جے پور میں آ بسے تھے۔ حضرت بسمل کی ولادت بمقام جے پور ۱۹ اپریل ۱۸۶۶ء مطابق ۲ جمادی الثانی ۱۲۸۳ھ میں ہوئی۔ ممتاز علما سے عربی، فارسی نیز انگریزی زبانوں اور تمام علوم متداولہ کی تحصیل کے علاوہ علم جیوتش بھی پنڈتوں سے سیکھا، جس کے لیے ہندی و سنسکرت سے واقفیت ضروری تھی۔ علمی مشاغل میں حضرت بسمل بچپن سے وفات تک منہمک رہے۔ متعدد تصانیف تاریخ و تصوف کے مضامین پر آپ کی طبع آزمائی ہو چکی ہے۔ شعر گوئی کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ آپ نے عربی۔ فارسی۔ اُردو نیز ہندی میں ہر صنفِ سخن پر طبع آزمائی فرمائی ہے۔ تصوف آپ کا خاص موضوع ہے۔ آپ جے پور کے جاگیردار تھے۔ ۱۹۴۵ء میں بعمر ۷۹ سال جے پور میں وفات پائی۔ "تذکرہ بسمل" مرتبہ سید مصباح الرحمٰن مجددی شائع ہو چکا ہے۔

نمونۂ کلام

سس بن سونی رین — گیان بن ہردے سونا
گڑھ سونا بن پتّر — بات بن تہ در سونا
گج سونا بن دنت — نلت بن سرور سونا
پشپ سونا سگندھ بن — دیپک بن مندر سونا
سنگرام سونا ساونت بن — گھٹا سونی بن دامنی
بیتال سونا بن بکرم — گھر سونا بن کامنی

۲۷۔ حبیب

حبیب تخلص۔ محمد حبیب اللہ نام۔ سلیم جعفر اُردو میں اور بدلیش ہندی میں قلمی نام۔ والد بزرگوار کا نام محمد نور اللہ۔ اصلی وطن کُرسی ضلع بارہ بنکی۔ نسباً قریشی

نقیا کیانی۔ مولوی احمدی نقش بندی۔ آپ ۱۳۱۱ھ بروز شب برات گرسی میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں جے پور اس وجہ سے آگئے کہ آپ کے والد یہاں ریاست میں ملازم تھے۔ اول گھر پر تعلیم پائی۔ پھر یہیں کے مدارس سے منشی عالم اور ایف۔ اے پاس کیا۔ ہندی اور سنسکرت کے عالموں سے یہ دونوں زبانیں سیکھیں اور کثرت مطالعہ سے اچھی استعداد پیدا کی۔ ۱۹۴۸ء میں آپ پاکستان چلے گئے۔ (اقتباس از تذکرہ شعرائے جے پور صفحہ ۲۲)

افسوس کہ آپ کے ہندی کلام کا نمونہ دستیاب نہیں ہو سکا۔

۲۸۔ خلیل

خلیل تخلص۔ شاہ محمد خلیل الرحمٰن نام۔ وطن و مولد سرساوہ ضلع سہارن پور۔ حضرت حاجی الحرمین شاہ محمد حبیب الرحمٰن جمال کے فرزند اکبر اور ان کے خلیفہ و جانشین تھے۔ آپ حضرت چہار قطب ہانسوی کی اولاد میں ہیں۔ ۱۲۷۱ھ میں تولد ہوئے۔ ۷۲ سال کی عمر میں ۱۲ رمضان ۱۳۴۳ھ کو وصال ہوا۔ اور سرساوہ ہی میں آپ کا مزار ہے۔ آپ کے دیوان دوم مطبوعہ ۱۳۲۶ھ میں اردو۔ فارسی کے علاوہ ہندی اشعار بھی ہیں جو اردو رسم الخط میں طبع ہوئے ہیں۔

(اقتباس از تذکرہ شعرائے جے پور صفحہ ۲۲۹/۲۲)

آپ کا دوسرا دیوان مل نہیں سکا ورنہ ہندی کلام کا نمونہ پیش کیا جاتا۔

۲۹۔ عاصم

عاصم تخلص۔ محمد عبدالوہاب خاں نام۔ آپ کی ولادت ۲ مارچ ۱۹۰۰ء کو بروز جمعہ قبل نماز فجر ریاست جے پور راجپوتانہ میں ہوئی۔ والد کا نام محمد وارث خاں تھا۔ چار سال چار ماہ کچھ دن کی عمر میں تعلیم کی بسم اللہ ہوئی۔ قرآن مجید ختم کرنے کے بعد حساب۔ اردو۔ ہندی اور انگریزی کی ابتدائی تعلیم اول مکان پر، پھر اسکول میں ہوئی۔ ۱۹۲۲ء میں منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۲۹ء میں فارسی میں ایم۔ اے کیا۔ ۱۹۲۹ عیسوی

ہیں ایم۔ او۔ ایل کی اعزازی ڈگری ملی۔ اس کے علاوہ مکان پر فارسی۔ ہندی اور سنسکرت کا سلسلہ جاری رہا۔ مزاج لڑکپن ہی سے شاعرانہ پایا تھا۔ حضرت سخا اور مرزا مائل سے بے فیض حاصل کیا۔ اُردو دیوان کے علاوہ ہندی کا دیوان "رتی کلیان" ہے۔ تقسیم وطن کے بعد پاکستان چلے گئے۔ نمونۂ کلام نہیں مل سکا۔

(اقتباس از تذکرہ شعرائے جے پور صفحہ ۳۲۰/۲۲۴)

۳۰۔ ناطق

ناطق تخلص۔ اشتیاق حسین نام۔ نسبتاً سید۔ بریلی کے رہنے والے، اور حضرت امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ بتلاشِ معاش جے پور آئے اور "شیو پول اسکول میں مدرس ہو گئے۔ یہیں انتقال کیا۔ عربی۔ فارسی کے منتہی تھے۔ جے پور میں آپ سے بہت سے لوگوں نے تعلیم حاصل کی اور متعدد اصحابِ شعر و سخن کی اصلاح بھی لیتے تھے۔ عربی، فارسی، اُردو اور کسی قدر ہندی میں بھی آپ کا کلام تھا۔ مگر اب ناپید ہے۔ آپ کے دیکھنے والے تو اب بھی جے پور میں موجود ہیں، مگر کلام کسی کو یاد نہیں۔ ایک پیرانے نعمت خاں محمد نصیر الدین قریشی سے نعت کے دو شعر مخلوط زبان میں میسر آسکے مجبوراً انھیں پر اکتفا کرنا پڑا۔

لَمْ یَاتِ نَظِیْرُکَ فِی نَظَرِیْ مثلِ تو نہ شد پیدا جانا

جگ راج کا تاج ترے سر سو ہے تجھ کو شہہ ہردو سرا جانا

اَلْمَوْجُ عَلَاءُ الْبَحْرِ طَغٰی۔ من بیکس و طوفاں ہوش رُبا

منجدھار میں ہوں بگڑی ہے ہوا۔ موری نیا پار لگا جانا

(منقول از تذکرہ شعرائے جے پور صفحہ ۴۸۵-۴۸۶)

۳۱۔ عزیز سلیمانی

حافظ مولانا محمد یوسف نام عزیز تخلص عزیز سلیمانی کے نام سے شہرت رکھتے ہیں جناب صادق

آلِ محمد علیہ السلام کی اولاد امجاد سے ہیں۔ والد کا نام افضل علی خاں۔ آپ کے نانا کا نام آزاد خاں۔ یہ دونوں بزرگ صوبات مضافات کابل سے ٹونک وارد ہوئے۔ آپ کی ولادت بمقام ٹونک سنہ ۱۸۹۰ء میں ہوئی۔ دس مہینے کے تھے کہ یتیم ہو گئے۔ پہلے آپ کے نانا، پھر خالو نے آپ کی تعلیم و تربیت کی۔ جملہ علوم متداولہ کی تکمیل کے بعد سنہ ۱۹۰۹ء میں جے پور کے محکمۂ بخشی خانہ فوج میں سپاہی حساب کے جمع خرچ نویس مقرر ہوئے۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں دہلی جا کر آزادیٔ ملک کی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا۔ آپ حنفی مذہب، صوفی مشرب، مانے ہوئے مرثیہ گو، مقبول فریقین حدیث خواں تھے۔ ہندی میں ودیا کے سودھ بہ پنڈت مدوسودن جی راج گورو کے ہم نشین رہے۔ اکثر ست سنگ میں آتما گیان پر آپ کے اُپدیش سے سینکڑوں لوگوں نے رستہ پایا۔ آپ نے جانکیہ نیتی کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

دیا لو اور وہ گمبھیر ہوں ہم ۔۔۔ نہ آنے پائے آنکھوں میں بھی لالی
اہنسا کے چیلوں سے شناختی ہو ۔۔۔ عزیز اس باغ کا اک اک ہو مالی

اُس کی مایا ہی جو جنت میں ہے ۔۔۔ کہنا پڑتا ہے اُس کو انت میں "ہے"
کیوں اُٹھاتے ہیں سنت اونچی لے ۔۔۔ وہ تو انساں کی بھاونا میں ہے

گیانی ہو کرم ہو کہ بھگتی ہو ۔۔۔ آنکھ ہر پل اُسی کو تکتی ہو

پڑھیں اشلوک آپ گیتا کا ۔۔۔ کونسا ہے وہ "یگے یگے" والا
وہ نراکار ہے نرنجن ہے ۔۔۔ آنکھ ساکار ہے، وہ انجن ہے

چلتی کشتی میں بیٹھنے والا ۔۔۔ دیکھئے کیا اور چھور دریا کا
یہ ندی ناؤ کا سہیوگ ہمیں ۔۔۔ کہہ رہا ہے پریم سے بیٹھیں

۲۳۲۔ یحییٰ امیٹھوی

جناب سید مقبول حسین صاحب احمد پوری اپنے ایک مضمون "شاہ امین الدین وارثی" میں لکھتے ہیں :-

"بارہ بنکی میں یحییٰ امیٹھوی کی ہستی اس وقت بھی ایسی ہے جس کا مقابلہ بھاشا زبان میں شاید ہندو بھی نہ کر سکیں۔ خود راقم نے دیکھا ہے کہ مسلمان کسان جب دن بھر کی محنتوں سے تھک کر شام کو یک جا ہوتے ہیں تو یحییٰ امیٹھوی کے ہندی نعتیہ نغمے گاتے ہیں۔ ان کے صحیح ہندی تلفظ اور غلط فارسی تلفظ سے جو وجدانی سماں بندھ جاتا ہے اُس کا لطف سننے پر موقوف ہے۔ مثلاً ؎

آن بسا دیں تو سے اب حال لیجا کا ہم — اپنی نگری ماں تو یوسف کا بھر رہی دام

ڈھیر سدا رہیے دھرتی پہ پدر تو سے ہم

من بیدل جمال تو عجب حیرانم — اللہ اللہ چہ جمال است بدیں بوالعجبی"

(منقول از مجلہ اُردو، اورنگ آباد (دکن)، جولائی ۱۹۳۱ء)

۲۳۳۔ حضرت حاجی سید شاہ وارث علیؒ

"ہنس جواہر بھاشا" اور "پدماوت" وغیرہ کتابوں سے دل چسپی رکھنے والوں پر ظاہر ہے کہ حضرت حاجی سید وارث علی شاہ کو بھاشا زبان سے کس قدر دل چسپی تھی۔ آپ عموماً "پدماوت" پڑھا کرتے تھے اور آپ کے پڑھنے پر ہندو، مسلمان، یہودی اور نصاریٰ غرض کہ ہر مذہب و ملت کے لوگ خواہ زبان سمجھتے ہوں یا نہ سمجھتے ہوں ایک وجدانی کیفیت میں ڈوبے ہوئے نظر آنے لگتے تھے۔"

(اقتباس از مضمون سید مقبول حسین احمد پوری مطبوعہ مجلہ اُردو، اورنگ آباد، دکن، جولائی ۱۹۳۱ء)

آپ کی ہندی نوازی کا فیض ہے کہ وارثی شعرا میں متعدد حضرات ہندی گو ہیں۔

افسوس کہ محترم و فاضل مضمون نگار نے ہندی کلام کا نمونہ نہیں دیا۔

۴۳۔ شاہ امین الدین وارثیؒ

آپ کے حالات سید مقبول حسین، احمد پوری نے رسالہ "اردو" اورنگ آباد دکن بابت جولائی ۱۹۳۱ء میں شائع کئے تھے۔ اُس میں سے ضروری اقتباس ذیل میں دیا جاتا ہے:۔

آپ کی جائے ولادت احمد پور، ضلع بارہ بنکی ہے۔ یہ نہیں معلوم کب پیدا ہوئے۔ لیکن وفات کے وقت آپ کی عمر اسی پچاسی برس سے کم نہ ہوگی۔ آپ کی وفات ۱۹۲۷ء میں ہوئی۔ آپ کے والد ماجد شیخ تہور علی صاحب تمام عمر لکھنؤ میں رہے۔ شاہ صاحب نے خود ایک شعر میں اپنے والد صاحب کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے۔ ؎

تہور علی شیخ ابرارا　　　عابد زاہد سدہ کرتارا

آپ نے اپنے پیر حاجی سید وارث علی کے تتبع پر بھاشا زبان میں طبع آزمائی کی، اور جو کچھ لکھا خوب لکھا۔ آپ کے کلام میں پدماوت کا سا کیف، اور تلسی جواہر کا سا بانکپن پایا جاتا ہے۔ بھاشا شاعری کی ابتدا آپ نے حاجی صاحب قدس سرہٗ کی حیات ہی سے کی۔ ہندی میں آپ کی پہلی تصنیف "وارث پاوں بکنٹھ پٹھاوں" ہے، جو طبع ہو چکی ہے۔ دوسری تصنیف "پیم کہانی" ۱۳۳۰ھ میں بمقام حیدرآباد طبع ہوئی۔ پیم کہانی کا پہلا شعر یہ ہے ؎

ہیرا چرج من دیکھی بھلاتا　　　آپ صورت پہ آپ لبھاتا

آپ کا انتقال ردولی شریف میں ہوا۔ وہیں مدفون بھی ہوئے۔

نمونۂ کلام

ہر سوں کون کہے موری باتا　　　پیت کروں کہہ بھانتا
ماتھے وا کے چندر براجے　　　مشک بھولن کی باسا
ہر سوں کون کہے موری باتا

امین الدین وارث ہر راجی ۔۔ یہی سلن کی گھا ۔۔تا
ہر سوں کون کہے موری باتا

سب ماں ہو مہاراج ۔۔ من من میں من راج
جر نر ابار ماگن گیانی ۔۔ بھانت بھانت کرتا رکاج
سب ماں ہو مہاراج

دیو دیال دیا جگ وانی ۔۔ کرپا کرت کی لاج
امین الدین وارث گوروانی ۔۔ بجھیا درب سماج
سب ماں ہو مہاراج

آپ نے بھجن ۔ ٹھمری ۔ ملہار ۔ نعتیہ نغمے اور قصیدے بھاشا زبان میں کہے ہیں۔

۳۵۔ بے دم وارثی

جناب سید محمد اکبر صاحب عادل سیتاپوری نے بیدم صاحب کے حالات عطا فرمائے ہیں جو درج ذیل ہیں :۔

مولانا بیدم شاہ وارثی اٹاوہ میں پیدا ہوئے ۔ آپ سلسلہ وارثیہ میں بلند شخصیت کے مالک اور ایک بلند پایہ شاعر تھے ۔ آپ حضرت حاجی شاہ وارث علی شاہؒ کے آستانہ دیوی شریف میں تا مرگ حاضر، اور اس آستانہ سے وابستہ رہے ۔ آپ کا انتقال ۸ رمضان ۱۳۵۴ھ مطابق ۱۹۳۵ء کو واقع ہوا ۔ آپ قبرستان شاہ روشن دیوی شریف میں دفن ہوئے ۔ آپ کے صاحب زادے وارث حسین میاں بیدار اور ایاز وارث کلو میاں وارثی ہوئے ۔

آپ کی تصانیف میں " ارمغانِ بیدم " اور " مصحفِ بیدم " وغیرہ ہیں ۔ آپ کا ایک سلام ہندی بھاشا میں لکھا ملا جو حاضر ہے :۔

میرے وارثؒ جگ اُجیارے تم پہ لاکھوں سلام

دیویٰ نگر استھان بنایو۔ سارے ہند کو بھاگ جگایو۔ برم ٹپ سکھ دکھلایو

تم ہو مدینہ والے تم پہ لاکھوں سلام

نیّا بھنور میں آن پھنسی ہے۔ جھک جھورن سے ٹوٹ چلی ہے۔ تم سے سبّا آس لگی ہے

تم بِن کون سنبھالے، تم پہ لاکھوں سلام

تم اللہ نبی کے پیارے۔ مولا علیؓ کے راج دلارے۔ فاطمہؓ بی بی کی آنکھ کے تارے

سب کے نام اُدھارے، تم پہ لاکھوں سلام

تمرے دوار نوبت نِت باجے۔ تمرے اس راج مہاراجے۔ مُکھ تمرے سہرا ساجے

دولھا ہو ہر یالے، تم پہ لاکھوں سلام

بیدم تج کے اپنی نگریا۔ آن پڑو ہے تمری دہریا۔ تمرے ہاتھ ہے لاج سنوریا

وارثؒ دیوے والے، تم پہ لاکھوں سلام

(منقول از کتاب ست گرو وارث صفحہ ۳۲)

۳۴۔ الف شاہ وارثیؒ

آپ نے اپنی تصنیف منیف "ست گرو وارث" میں اپنے حالات خود لکھے ہیں اُن میں سے مختصر اقتباس ذیل میں دیا جاتا ہے:۔

آپ کا آبائی وطن موضع دومرا یان ہے۔ جو مضافات گیا کے دامنِ کوہ میں مشہور معروف اور چند گھروں کی بستی ہے۔ آپ کی ولادت ایک بنیا کے گھر میں ہوئی اور آپ کا قدیم نام راج کشور رکھا گیا۔ پسماندہ علاقہ ہونے کے باعث آپ تعلیم سے محروم رہے۔ البتہ آپ کے ماموں نے کوشش کر کے ہندی میں کچھ شُدبُد کرا دی۔

آپ رامائن اور بھاگوت کا مطالعہ کرنے لگے جس سے آپ کے باطنی شوق میں جوش پیدا ہوا۔ اس جوشِ شوق نے آپ کو سید عبدالاحد شاہ کی خدمت میں "شاہ جہاں نگر" پہنچا دیا اور اُن کے انتقال پر حضرت حاجی وارث شاہ کی خدمت میں دیوہ شریف کی

زیارت سے مشرف کیا اور اس آستانہ سے بیعت کرکے مسلمان ہوگئے اور الف شاہ وارثی نام پایا۔ آپ پر عجیب کیفیت طاری رہنے لگی۔ محویت کے عالم میں بھاشا زبان میں بے ساختہ زبان سے شعر نکلنے لگے۔ آخر آپ کے ارشادات "دوست گرو وارث" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو گئے۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے:-

چوپائی

پا لیو سب کدھی گوسائیں　　وارث داتا سب کا سائیں

کرتا دھرتا وارث داتا　　جن چرن سے ہووے بھو سنتا

مسجد مندر ایک بتاوے　　دل کی دُبدھا دور بھگاوے

دوہرا

ناشاستر نا دیدمت نا پنگل ہم جان　　الف نادان نے الف کہا دونوں کے ہمان

سندر روپ ہیں وارث نام دھرائے　　جو کوئی آوے سرن میں واکے پاپ مٹائے

دادرا

نبی آئے مدینہ مگن ہو چلو

تن من دھن انھیں پر وارد　　پریم کی گٹھڑی سر پر دھرتے چلو

نبی آئے مدینہ مگن ہو چلو

بھجن

گرو بن کون ہرے مورے پیر

کوئی مسجد کوئی مندر جاوے　　گرو کا ناہیں ادھین

جب پڑے کا دن آوے　　کون بندھاوے دھیر

گرو بن کون ہرے مورے پیر

۳۷۔ اکبر وارثی

آپ کے حالات اور شعروں کلام کے لئے نہایت مگ و دو کرنی پڑی۔ اس پر

بھی جو کچھ حاصل ہوا وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ پہلے درگاہ دیوی شریف میں نیازنامہ پیش کیا۔ اُدھر سے حضرت نجم آفندی کی خدمت میں حاضر ہونے کا حکم ہوا۔ پھر بذریعہ خط حضرت موصوف کے آستان بلند نشان تک پہنچا۔ آپ نے جناب مسکین اکبری کے درِ دولت تک پہنچایا، اور حضرتِ مسکین نے تسکین میرٹھی کی خدمت میں حاضر کیا۔ مولانا موصوف نے نیازنامہ کے جواب میں جو کچھ ارشاد فرمایا، درج ذیل ہے :۔

میرٹھ
یکم مئی ۱۹۷۶ء

مکرمی! تسلیم

مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے جوابی خط کا جواب بہت تاخیر سے دے رہا ہوں۔ مجھے یہاں تحقیق کرنے پر صرف اتنا معلوم ہوا کہ اکبر صاحب وارثی میرٹھی ایک بہت اچھے نعت گو شاعر تھے۔ بڑی جستجو کے بعد ایک صاحب نے اُن کے کلام کا مطبوعہ مجموعہ مجھے آج لا کر دیا۔ تفصیل حسب ذیل ہے۔

میلاد شریف اکبر مکمل۔ باغ کلام اکبر (نعتیہ)، نہال رُدِ شُنۂ اکبر۔ ریاضِ اکبر۔ گلستانِ اکبر۔ یہ سب کلام نعت و منقبت میں ہے۔ ان دیوانوں میں کوئی کوئی نعت یا منقبت ہندی (برج بھاشا) میں ہے مثلاً ؎

بیچ منجدھر تختے بولیں ناؤ جھکولے کھائے
موری نیا ڈوبی جائے

بہرکیف متاسف ہوں کہ آپ کی فرمائش پوری نہ کر سکا۔

(تسکین میرٹھی)

۳۸ - شائق وارثی

آپ کے حالات دستیاب نہیں ہو سکے۔ البتہ آپ کے ہندی کلام کے دو مجموعے "بھجن شایق وارثی" اور "پریم لیلا" نظر نواز ہوئے۔ اُن کے مطالعے سے کلام کے ساتھ ساتھ یہ پتہ بھی چل گیا کہ آپ کا نام مولوی دیندار شاہ اور تخلص شایق ہے وطن ملواراہے۔ کیوں کہ پریم لیلا کے سرورق پر آپ کا نام یوں لکھا ہوا ہے:-

"وارثی پنڈت مولوی دیندار شاہ صاحب شائق وارثی
ملواری مہیسری اندوری مقیم دربار وارثیہ دیوی شریف
زاد اللہ حرمتہٗ"

نمونۂ کلام ۔ دوہا

پریم پلیتھ میں پریت بن جگ ماں کچھو نا اَور
پریمی پیا پاس ہے اور کہیں نہ ٹھور

"

جاگن کے دن سوگیا، اور ہر کو دیا بھلائے
دیا دھرم سب چھانڈ کے اکرت جنم گنوائے

"

شایق کسی کی ذات پات کبھو نہ پوچھے کوے
دن رین جو ہر کو بھجے وہی تو ہر کا ہوے

ٹھمری کانگڑا

چیت کرو گوری بہار ڈار وانگنا   آوت ہوئی ہے پیاسے مورے سجنا
جھاڑ بہار کے سجیا بچھاؤ   کر کے سنگار مناؤ وارث اپنا
چیت کرو گوری بہار ڈار وانگنا

بھجن

(راضی)
راجی رہنا بھلا موسے سجنا

موہنی صورت پہ بل بل جاؤں   چرنن ملو تو رے نینا

راجی رہنا بھلا موسے سجنا

گھونگھٹ کھولو مکھ سے بولو   شایق کا ہے بس یہی کہنا

راجی رہنا بھلا موسے سجنا

۳۹ - نادم وارثی

آپ حضرت حاجی سید شاہ وارث علیؒ کے قدیم خرقہ پوش فقیر ہیں۔ رحیم شاہ نام اور نادم تخلص۔ آپ عرصہ تک خادم خاص کے ممتاز عہدہ پر مامور رہے۔ قبلۂ عالم کی مدح سرائی کر کے آپ نے اپنے جذبات قلبی کا اظہار زبان بھاکا میں کیا۔ حتیٰ کہ اپنا تخلص بھی حضور کی اجازت سے نادم رکھا۔ آپ کی تصانیف کا مجموعہ ۱۳۱۵ھ میں "یادگار نادم" کے نام سے چھپ گیا ہے۔ اس کی ابتدا اس بھجن سے ہے ۔

پربھو ہم دیکھی تمھاری پربھونائی

جل کے اوپر بھسم بچھایو پرتھی دیہو بسائی

بِنا ٹیک کے گگن ٹھہرایو یک چھن ٹھہر نہ پائی

گھٹ سے جب پٹ کھٹ ہوئے وارث تب ہو درس دکھائی

نرکھٹ موہ گئیو من نادم نین صورت سمائی

پربھو ہم دیکھی تمھاری پربھونائی

ٹھمری

وارث موری نیّا کے تمھیں کھویا

اگم اتھاہ پریم کی ندیا جور بہت ہے دھار

تہہ بیچ آئے پڑے بن کھبوٹ کوئی نہ سبھارن ہار

لکھ مکھ لہر آپار سمندر کی ڈرلاگے ادھکار
جیا لرجے، تن تھر تھر کانپے من نہیں پکڑے کرار
وارث موری نیّا کے تمھیں رکھوار

ٹھمری

لاگے ہین کا وارث چھب پیاری | بھولی بھالی صورت پہ واری
سندر روپ سلونے نینا | چہہ چتوت تہہ مارت کٹاری
نادم جیا ترسے بن درشن | کب درشن دیہن موہن مراری

(حیاتِ وارث صفحہ ۴۶۴ - ۴۶۵)

۴۰۔ نوّاب وارثی

شاہ امین الدین وارثی کے ہم عصر۔ ماہر زبان بھاکا شیخ حسین علی صاحب وارثی متخلص بہ نواب۔ متوطن و زمیندار ساوہ متو۔ ضلع بارہ بنکی۔ اپنے زمانہ کے مستند ادیب گو کبشیر تھے جن کا بارگاہ وارثی میں قدیم اور مخصوص ارادت مندوں میں شمار ہے۔

اِن کا یہ طریقہ تھا کہ جب یہ اشتیاق زیارت حاضر خدمت ہوتے تو ہر مرتبہ اپنی تازہ تصنیف ضرور سناتے۔ ایک مرتبہ آپ کا تازہ کبت جو آپ نے بر جستہ لکھا تھا سن کر حضور قبلہ عالم نے فرمایا۔ "حسین علیؔ تم اپنے وقت کے کوی گنگ ہو!"

زبان بھاشا میں ۰۰۰ آپ ایسے قادر الکلام شاعر تھے کہ حسب ایمائے سرکار عالم پناہ آپ نے پورا واقعۂ کربلا نظم کیا تھا، جو تاریخی واقعات اور مستند روایات کی حیثیت سے اپنی شان میں یگانہ مرثیہ اور کتاب سیر الشہادتین کا صحیح ترجمہ تھا۔

(منقول از حیاتِ وارث صفحہ ۴۷۰)

افسوس کہ مصنف "حیات وارث" نے آپ کے کلام کا نمونہ نہیں دیا۔

۱۸۔ اَوگھٹ شاہ وارثی

حاجی اوگھٹ شاہ صاحب وارثی بچھرایونی جو حضور قبلۂ عالم کے قدیم خرقہ پوش فقیر ہیں، ہندی نظم کے پردے میں اپنے تخیلات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔ ~

دیوکی باسنی کنور کنھیا، موہن پیارے بنسی دھاری
جنم کے راجہ سُندر چھبیلا۔ مور گوشائیں شام بہاری
بانکی سج دھج۔ ٹھاٹھ انوکھا، چال بھی چنچل، پیاری تبیاں
سانولی صورت، نین رسیلے۔ ترچھی چتون، چھل بل نیاری

دوہا

اوگھٹ چیلا وُہی گنی جو بِن گُرو تجے نہ سانس
سوتے جگتے دھیان رہے، گرو کو راکھے پاس

"

اوگھٹ گھٹ میں پران بسے اور پران بیچ اک چور
جو پکڑے اس چور کو وہ جوگی سب سرجور

"

مدھوا پیو پریم کا بن میں کرو استھان
من موہن کے دھیان میں اوگھٹ تجو پران

"

اوگھٹ چیلا وہی گنی جو اپنی سُدھ بسرائے
گیان رہے اور دھیان رکھے اور سانس نہ خالی جائے

(منقول از حیاتِ وارث صفحہ ۱۷۴)

۴۲۔ انیس

جناب لوگندر پال صابر تنکوہ آبادی ایم۔ اے کی بیاض سے انیس۔ سید پھیدا شاہ۔ الفت رائے راجا مست پیا۔ مقصود۔ سندر کلی۔ یک رنگ اور حفیظ اللہ ہندی گو مسلمان شعرا کا پتہ چلتا ہے۔ صاحب لکھتے ہیں کہ یہ دورِ حاضر کے بر سرِ آوردہ ہندی شاعر ہیں۔ انیس کا زمانہ شاعری ۱۹۱۱ء ہے۔ ان کا مندرجہ ذیل چھند دگ وجے بھوشن میں ملتا ہے۔

پھٹکر چھند

سنیئے وِرپ پربھو نہپ نہارے ہم
شاخ دیو ہیں تو شو بھا شوری بڑھائی ہے
تج ہئوں پرکھی کے تو ولگ نہ سوچے کچھ
جہاں جہاں جے ہے تہاں دلوں لپٹ کھائے ہے

سندر کلی اور مقصود کے بارہ ماسے یکرنگ کی ہولی ٹھمری۔ دادرا۔ دوہرا پہیلیاں اور کجلی دیکھ کر ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ مسلمان ہندی گو شعرا نے اپنے ہندی کلام میں جو بلند خیالی۔ سلاست صفائی۔ دل کشی اور محاکات کے نمونے پیش کئے ہیں وہ قابل صد داد ہیں۔

۴۳۔ نواب محمد کلب علی خاں بہادر ریاست رامپور

نواب تخلص۔ نواب محمد کلب علی خاں نام۔ ابن محمد یوسف علی خان بہادر، ناظم تخلص۔ فردوس منزل۔ آپ ۲۱ر اپریل ۱۸۶۵ء کو مسند آرائے حکومت ہوئے۔ آپ نے اپنے عہد حکومت میں رعایا پروری کے ساتھ ساتھ رفاہِ عام کے کاموں میں خاص حصہ لیا۔ ۲۲ر رمضان ۱۲۸۷ھ کو زیارت بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔ آپ فارسی، اردو۔ ہندی تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے نمونے کے طور پر ایک ہندی کبت جو انتخاب

یادگار از امیر مینائی میں مندرج ہے، یہاں درج کیا جاتا ہے :-

کبت در تعریف سراپائے معشوق

گیند گت من ہرن سُد ہا دہ ہرن چند بدن بسیلی باز کاری تن ہیں
برہا کے دُکھ کو بید ہیں سری سو بھا سُکھ دین بھرو دھن نین مدہ ہیں مگن ہیں
سنکھ گل کام دھین ہی سرل اُبھسرا سی اُدیک اُچپل من سے، اون ہیں
کو مسرتر باج گھونگھٹ بر نواب دھن کی تن ساگر یہ چودہ رتن ہیں

شرح :- گیند گت بمعنی ہاتھی کی سی چال یعنی مستانہ وار- من ہرن بمعنی دل رُبا- - سدھا دہرن یعنی آبِ حیات سے شیریں ہونٹ - چند بدن یعنی چاند سا چہرہ - بسیلی باز کاری تن ہیں بمعنی زہریں بھرے ہوئے سیاہ ہیں - برہا کے دُکھ کو بید ہیں - یعنی جدائی کے درد کو اس کی باتیں دور کرتی ہیں - سری سو بھا سُکھ دین - مچھلی کی مانند خوبصورت ' اور راحت رساں ہیں - بھرو دہن . . بمعنی ابرو کمان نین مدہ مگن بمعنی آنکھیں شراب کی مستی میں مست ہیں - سنکھ گل بمعنی سنکھ کی مانند گلا ہے - کام دھین سرسرل بمعنی گائے کی مانند مطیع یا شریف -

اُبھسرا سی ادیک اُچپل بمعنی آسمانی ستاروں سے بھی زیادہ شوخ - مین ہی ادن ہیں - بمعنی موتیوں جیسے دانت ہیں کو سرتر بمعنی قد مانند درخت طوبیٰ کے ہے - باج گھونگھٹ بر بمعنی گھوڑے کی مانند اُس کا گھونگھٹ پسندیدہ ہے -

نواب دھن کی تن ساگر یہ چودہ رتن ہیں - بمعنی اے نواب بدن معشوق کا سمندر ہے جس میں یہ چودہ رتن ہیں -

چودہ رتن کے نام یوں لائے گئے - گجراج - سُدھا - چند - بجھ - بید - سری دھن - مدہ - سنکھ - کام دھین - اُبھسرا - من - سرتر باج -

(انتخاب یادگار طبقہ اول از امیر مینائی
صفحہ ۱۶۷ - ۱۶۸)

۴۴ تاب

تابؔ تخلص۔ صاحبزادہ امداد اللہ خاں نام۔ ابن صاحبزادہ کفایت اللہ خاں کفایتؔ تخلص۔ اخوند زادے احمد خاں غفلتؔ کے شاگرد رشید۔ یہ بزرگ جامع صفات کمال لو رجوانی میں بہت صاحب حسن و جمال تھے۔ فنون متداولہ میں کم تر ہی کوئی ایسا فن ہوگا جس میں دخل تام نہ تھا۔ زبان بھاکا اور اردو دونوں میں استاد تھے۔ اکسٹھ برس کی عمر پائی۔ جمادی الآخر کی پہلی تاریخ بارہ سو اناسی ہجری میں رحلت فرمائی۔ کلام اکثر تلف ہو گیا۔ جو کچھ ہاتھ آیا اس میں سے تیمناً و تبرکاً چند اشعار بطور نمونہ پیش خدمت ہیں:۔

کبت در تعریف معشوقہ

دہان تو بدھ یہاں بھال ہرت بندی دجی کنبہ کج چکھ میں گرا دبسی ہے
بھرکٹی پناک بھج تلا مکتا نچھتر بھوم ست سیس پھول سکر آرسی ہے
مانگ سمس تار کہو کیس پہ بیکھ نتھ کا بخر ہو بادر او ربیلا ہسی ہے
جگنو ہی کرتیکا کنٹ متنگھ نس سسر گ میں سبھی کید ہوں تیا مکھ سسی ہے

شرح:۔ (دہان تو بدھ یہاں بھال ہرت بندی اجی) بدھ بمعنی عطارد جس کا رنگ سبز ہے
بھال بمعنی پیشانی۔ ہرت بمعنی سبز۔ بندی بمعنی ٹیکا۔
حاصل معنی یہ کہ جس طرح فلک پر عطارد تابناک ہے ویسا ہی پیشانی معشوق پر سبز ٹیکا چمکتا ہے۔
(کنبہ کج) کنبہ بمعنی دلو اور کج بمعنی پستان) (چکھ بمعنی آنکھ۔ مین بمعنی مچھلی۔
(گرا دبسی ہے) گر بمعنی مشتری اور بسی بمعنی دہگدی۔
(بھرکٹی پناک) = بھرکٹی بمعنی ابرو۔ پناک بمعنی قوس و قزح۔
(بھج تلا) = بھج بمعنی بازو۔ تلا بمعنی ترازو۔
(مکتا نچھتر) مکتا بمعنی موتی۔ نچھتر بمعنی ستارے
(بھوم ست سیس پھول) = بھوم ست بمعنی مریخ۔ سیس پھول = اس زیور کا نام ہے

شرح = جو پھول کی صورت ہوتا ہے، اور سر پر پہنا جاتا ہے۔
(سُکر آرسی ہے) = سُکر بمعنی زہرہ۔ آرسی مشہور زیور ہے۔
گویا پستان مانند دلو کے اور آنکھ مانند ماہی کے۔ ابرو مانند قوس قزح کے، اور بازو مانند ترازو کے۔ موتی اس کے ستارے ہیں، اور سر کا پھول مریخ ہے آرسی مانند شمس کے ہے۔
(مانگ سِس مار) یعنی اُس کی مانگ مانند کہکشاں کے ہے۔
(کھو کیس) اُس کے بال سیاہی میں اندھیری رات کی مانند ہیں۔
(ربہ بیکھ نتھ) چاند کا حلقہ اُس کی نتھ کا ہالہ ہے۔
(کاجو ہو بادر) یعنی کاجل بادل ہے۔ (چپلا ہنسی ہے) = اُس کی ہنسی بجلی ہے۔
(جگنو ہے کرنکا)۔ ثریا اُس کا جگنو ہے (کٹ سنگھ) اُس کی کمر شیر کی کمر کی طرح ہے۔
(گنگا لبس)، اُس کی پوشاک سفید ہے۔ (سرگ میں سسی کیدہوں تیا مکھ سسی ہے) یعنی آسمان پر چاند ہے یا معشوقہ کا مُنہ چاند ہے۔
(انتخاب یادگار از امیر مینائی صفحہ ۸۶/۸۵)

کبت

رَس بن راگ جیسے پھول بِن باگ جیسے تری بن باگ جیسے دُکھ بِن ڈار ہے
گج بن دنت جیسے جوگ بِن سنت، جیسے ناری بن کنت جیسے کنت بن نار ہے
گورل بن کان جیسے مال بن دان جیسے ہن بن بان جیسے ناد بن تار ہے
بھون بن بار جیسے کھرگ بِن دھار جیسے پُرکھ بن نار جیسے بین بن سار ہے

کبت کا مطلب صاف ہے۔ شاہد نے ثابت کیا ہے کہ جو چیز جس کے واسطے وضع ہوئی ہے، وہ چیز بغیر اُس کے رایئگاں ہے۔ (انتخاب یادگار۔ صفحہ ۸۸)

۴۵۔ حسین

سید حسین شاہ ابن سید خلیل شاہ قدس سرہ صورتاً نورِ مجسم، سیرتاً نفوس قدسیہ کا عالم، شب بیدار، تہجد گزار، باہمہ تقدس باتیں رنگین، طبیعت حسین ہر طرح

کی صحبت میں باغ و بہار، بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی میں یکتائے روزگار۔ اُردو اور بھاکا دونوں زبانوں کے شاعر تھے۔ ہر طرح کے راگ کی گویائی پر قادر تھے۔ اخوند زادے احمد خاں غفلت کو کلام اُردو دکھایا۔ بھاکا بطور خود فرمایا چھپّن ۵۶ برس کی عمر پائی۔ یو بھی شعبان ۱۲۶۹ھ میں رحلت فرمائی۔ بھاکا میں حسین تخلص کرتے تھے۔ بھاکا زبان کا کلام اُن کا اکثر تلف ہوگیا۔ کچھ مسودات ہاتھ آئے۔ بطور نمونہ یہاں لکھے گئے۔ ؎

کبت در تعریف گرما

مندر رچے اوپر دوجی لگھ لٹکن ہیں کیورے سی چھڑکی کھس کھانی تیار ہیں
آرسی کی چھتوں پہ نہریں لہر کریں تھموں تھموں کھجانی پیاری بسیار ہیں
چندن کے تختن پر پھرس سیتل پانی گومیوں اور پھولن کی لاگے انبار ہیں
گرمی کی دوپہری ہے سراب ہے تجک ہے ہنسی پیاری حسین ہے پیار ہیں

کبت در منقبت

کاؤ کو گمان ہے بھوج لاؤ لسکر پر کاؤ کو بھروسا ہے ملک امر راد میں
کاؤ کو گرور ہے اپنے بل بھجن پے، کاؤ مغرور ہے جوبن دن چار میں
کاؤ انرات ہے جوگ اور روگ پر کوڈ پنڈتائی اور بیاکے اوچار ہیں
تہوری کرت حسین بو طالب کے لال مو کو اب تہارا ہی سہارو سنسار میں

(انتخاب یادگار از امیر مینائی، صفحہ ۱۱۶)

۴۶۔ رضا (رجا)

نواب محمد رضا علی خان بہادر نام۔ اُردو میں رضا اور ہندی میں رجا تخلص۔ آپ ریاست رام پور کے والی اور جانشین ہیں اور نواب حامد علی خاں بہادر مرحوم کے خلف الصدق فرزند ہیں۔ ختم زمینداری کے بعد آپ کوٹھی خاص باغ میں رہتے ہیں۔ جن کو آپ نے اپنی پسند خاطر سے تعمیر فرمایا ہے۔ آپ کو قومی کاموں سے کافی

شغف ہے۔ آپ ہندی اور اُردو دونوں میں شعر کہتے ہیں۔ آپ کا ہندی کلام واقعہ کربلا سے متعلق نوحہ کے نام شائع ہوا ہے۔ اس میں سے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

بالی سکینہ کہتی تھی بھیّا کدھر گیو ۔۔۔ بھیّا کدھر گیو مرے بابا کدھر گیو
پیاسی ہوں نین دریے پلا دے تنک سا جل ۔۔۔ اے دادی کے جہیز کی ندیا کدھر گیو
اتنا تو شتروں سے مجا کوؤ پوچھ لے ۔۔۔ من سے بنی دھرم رکھشا کدھر گیو

چار بیت (بسنت) تال تیتو

آئی تھی رُت بسنت کی ساجن تورے بنا
مرجھا چلا تھا آج مورا من تورے بنا

انترا

دیکھا نہ تمرے دھیان میں امواکی ڈال کو
ٹھکرا دیا چنبیلی کے پھولوں کی مال کو
کن انکھڑیوں سے دیکھتی گیہوں کے بال کو
میں تو بنی ہوئی بروگن تورے بنا
آئی تھی رُت بسنت کی ساجن تورے بنا

انترا

پھر چار جا پیا ہی کا تھا بات بات میں
چاروں پہر بتاتی تھی ملنے کی گھات میں
اور دیکھتی تھی سُوپن تمہارا ہی رات میں
ٹوٹا تھا کب ہے پریم کا بندھن تورے بنا
آئی تھی رُت بسنت کی ساجن تورے بنا

(عطیہ جناب سید محمد اکبر رضوی عادل سیتاپوری
دحضرت نادم سیتاپوری)

۴۸۔ سید ہمایوں مرزا

انتہائی سعی کرنے کے باوجود آپ کے حالات نہیں مل سکے، البتہ اُن کی اہلیہ محترمہ صغریٰ بیگم صاحبہ نے اُن کے ہندی کلام کا نمونہ عطا فرما کر ذرّہ نوازی فرمائی ۔ اُن کا ارشاد ہے کہ

"سید ہمایوں مرزا صاحب اُردو، ہندی دونوں زبانوں کے شاعر تھے ۔ اُن کا اُردو دیوان چھپ چکا ہے، جس کا نام "نشانِ فصاحت" ہے ۔ اُردو میں حقیر اور ہندی میں ہمایوں تخلص کرتے تھے ۔"

نمونۂ کلام ہندی ۔ لاونی

گل مت کاٹ اے باغباں گل سے گل کو ملنے دے

میں غریب بلبل میرا اس باغیچہ میں گھر بسنے دے

جن کلیوں کو تو توڑے ہے بڑی کٹھن سے ایں

پانی سینچ تو اس کی کرمالی پھولنے پھلنے دے ڈالی

منع مت کر دام بچھا کر جو آوے اُسے پھنسے دے

میں غریب بلبل میرا اس باغیچے میں گھر بسنے دے

بھجن بھیرویں

بیراگ جوگ کٹھن اُدھو ہم نہ کریں ہو

کیسو میں ابسو دس جٹا مکٹ کر بسیں

سکھم سیج چھانٹر بھبھیاں ہم نہ پریں ہو

بیراگ جوگ کٹھن اُدھو ہم نہ کریں ہو

تنبیہہ :۔ محترمہ مذکور کی تحریر گرامی اچھی طرح پڑھی نہیں گئی، اس لیے بھجن کے الفاظ مشکوک ہیں ۔ (مؤلف)

۴۸۔ خلیل

شاہ محمد معین اللہ نام خلیل احمد عرف خلیل تخلص۔ آپ صوفی منش بزرگ ہیں۔ قصبہ صفی پور ضلع اناؤ کے مشہور و معروف فقرا میں آپ کا شمار ہے۔ اُردو اور ہندی دونوں زبانوں میں آپ کا کلام دیوان میں ملتا ہے۔ یہ دیوان ۱۳۴۳ھ میں طبع ہو کر منظر عام پر آ چکا ہے۔

نمونۂ کلام

آئے پڑی ہوں تمری نگریا — لیو بلم اب موری کھبریا
بیاکل بھئی ہوں تمرے درشن بن — دیکھ کے سوُنی سجریا
سب سکھین کا گھائل کینہو — مار مار کے نین کٹریا

(منقول از بیاض قلمی سید محمد اکبر رضوی عادل سیتاپوری محافظ دفتر محمود آباد)

۴۹۔ نجم آفندی

راقم الحروف کی التجا پر جناب خاور نوری نے بکمال ایثار و مروت حضرت نجم آفندی کے حالات اپنے ۱۸ اگست ۵۹ء کے گرامی نامے میں حیدرآباد دکن نمبر ۲ سے عطا فرمائے جو بصد شکریہ ہدیۂ ناظرین ہیں۔

مرزا تجمل حسین نام، نجم تخلص۔ آفندی خاندانی خطاب۔ باعتبار قومیت مغل۔ آپ کا وطن اور مقام ولادت ارضِ تاج (اکبرآباد) ہے۔ حیدرآباد میں ایک ربع صدی سے بسلسلۂ ملازمت مقیم ہیں۔ شعر و شاعری کا فن چار پشتوں سے آپ کو ورثہ میں ملا ہے۔ آپ کو اس بات کا فخر ہے کہ آپ نے یادگار مومن نسیم دہلوی و منشی امیر اللہ تسلیم کے ساتھ مشاعرہ پڑھا ہے۔ مذہبی شاعری کے سلسلے میں آپ کو "شاعر اہلِ بیت" کا خطاب دیا گیا ہے۔ اُردو کے علاوہ ہندی کے بھی برگزیدہ شاعر ہیں۔ اس کے باوجود آپ نے اپنی کتاب "پریم کٹنگی" کے دیباچہ میں اپنی

انکساری اور کسرِ نفسی کا اظہار نہایت سادگی کے ساتھ یوں کیا ہے:۔
"میں ہندی بھاشا کا اُن پڑھ کوی ہوں۔ مجھے اپنی ہندی شاعری کی صحت و سلامتی پر کوئی بھروسا نہیں۔ اگر میرا نام ہندی شعرا میں شامل کر لیا جائے تو مجھے تعجب ہوگا"
آپ کا غیر مطبوعہ کلام بہت ہے جس کی اشاعت کی ابھی تک نوبت نہیں آئی۔ آج کل آپ ہندی زبان میں اسلام کی تاریخ "اسلام پوتھی" کے نام سے نظم کر رہے ہیں۔ آپ کی ہندی تصنیف "کربل نگری" منظوم نہایت درد انگیز اور رقت خیز ہے۔ نمونۂ کلام ؎

من کی جھولی

من کی جھولی بھر دے داتا، من کی جھولی بھر دے
داتا تیری دیا نرالی، پھول بھرے ہیں ڈالی ڈالی
مرے من کی گود ہے خالی ..... داتا

پریم کی بنسی

من میں باجی پریم کی بنسی جھوم گیو سنسار
ساجن جھوم گیو سنسار
دیپک جھومے۔ تارے جھومے
پریم کے سب متوارے جھومے
ساون رُت کا بادل جھوما۔ برسے امرت دھار
ساجن جھوم گیو سنسار

دوہے

پریمی بھیتر ایک ہے رب کہے یا رام | جو بھی نکسے پریم سے سو ہی میٹھا نام
من کو دیکھا پھیر کے پایا ست سبرام | پوتھی کھولی پریم کی نکسا تمرا نام

ہندے من کی جونب سے لڑیں دھرم کی ٹیک
مذہب جگ میں سینکڑوں مالک سب کا ایک

مجھی برہمن باور راست کو چھاڑت جائے
باہر دیکھو شانتی، بھیتر دیکھو ہائے

رُباعی

مایا مائی ہے اور دادنا ہے تو سنسار کی ہاٹ میں کھلونا ہے تو
سمجھا ہی آپ کو مورکھ لوبھی باہر بھیتر تمام سونا ہے تو

۵۰ ۔ شمس لکھنوی

سید آغا علی نام شمس تخلص ۔ ولادت سنہ ۱۲۳۲ھ ۔ وفات سنہ ۱۳۱۲ھ ۔ اصل ان کی خراسان سے ہے ۔ ابھی کمسن ہی تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا ۔ گیارہ سال کی عمر میں راجہ کندن لال اشکی نے ان کو اپنا پسر خواندہ قرار دیا ۔ خوش نویسی کی مشق شمس نے انھیں سے کی تھی ۔ انھیں کی وساطت سے محمد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے ان کو "رنگین رقم" "مشکیں قلم" اور سید آغا علی خان بہادر کا خطاب عطا ہوا ۔ نواب فخر الدولہ زخمی ان کی امیرانہ پرورش کرتے تھے ۔ راجہ کندن لال کے بعد عرصہ تک نواب محمد تقی خاں شاگرد رشید مرزا تسلیم کی سرکار سے توسط رہا ۔ ان کے بیٹے میر حیدر حسین صاحب حیدر مشہور مرثیہ گو تھے ۔ ملک الشعرا اختر کے شاگرد تھے ۔ تحقیق الفاظ اور صحت زبان میں کمال حاصل تھا ۔ اردو و فارسی کے علاوہ ان کے ہندی کلام کا ایک مجموعہ قابل دید ہے ۔ "گلستان سعدی" کے جواب میں ایک کتاب سنبلستان لکھی تھی ۔ نمونہ کلام ؎

گھر آئے بدرا لٹک لٹک میں کا سے کہوں جیرا کی للک
سکھی ری پھڑکن لاگے نین

کنور کندھاری جب سے گئے ل برت نہیں موہے چین

سکھی ری پھر گن لاگے نین

شمس پیا موسے بھول کے بیٹھے   تلپت ہوں دن رین

سکھی ری پھر گن لاگے نین

(ماخوذ از دیباچہ مثنوی طلعتہ الشمس)

۵۱۔ شیخ واجد علی شاہ محمود آبادی

شیخ واجد علی شاہ نام۔ واجد تخلص۔ آپ علی اللہ شاہ کے لقب سے بھی یاد کئے جاتے ہیں۔ آپ کے والد ماجد شیخ امام علی شاہ ہیں، جو صفویہ خانوادہ چشتیہ قادریہ طریقت پر تھے۔ قصبہ بوین۔ ضلع سیتاپور میں پہلے سکونت تھی۔ پھر محمود آباد آ گئے۔ آپ کی ولادت ۱۸۶۲ء مطابق ۱۲۷۸ھ کو قصبہ بانگر مئو، ضلع اناؤ میں ہوئی تھی اور ۱۳۶۴ھ مطابق ۱۹۴۵ء میں انتقال ہوا۔ آپ اپنے والد ماجد کی طرح صوفی مشرب تھے۔

نمونۂ کلام

نینن ماں موسے آئے رے سیّاں   سکھی سیّاں کے میں لاگو پیّاں

چھپ درشن کچھ بھاوت ناہیں   سیّاں لگی موری جب سے رے بھیّاں

تمرے سوا کوئی اور نہیں موہن   تم ہی ہو ہمرے مدام گو سیّاں

کہت واجد شاہ ولی سوں   تمری رہوں میں نِس دن چھیّاں

(عطیہ جناب سید محمد اکبر عادل سیتاپوری)

۵۲۔ کمال محمود آبادی

محمد علی نام۔ کمال تخلص۔ محمود آباد۔ ضلع سیتاپور وطن۔ مشاعروں میں شرکت کا شوق رکھتے ہیں۔ تاحال (۱۹۵۸ء) ریاست محمود آباد کی ملازمت میں ہیں۔ ۱۹۳۲ء میں ولادت ہوئی۔ والد ماجد کا اسم گرامی رحمت علی ہے۔

نمونۂ کلام ہندی پیش ہے جو واقعہ کربلا سے متعلق ہے ۔

ایک مسافر کربل کے بن ماں آئے پھنسا ہی بچارا
بپتا جو اوپر آن پڑی تو جب دکھڑا ہے دکھیارا
لشکر نے چاروں اور سے گھیرا تھا مگر ہے حق کا سہارا
دریا پیچھے بہتا ہے پیاسا مگر ہے بے چارا
(از بیاض قلمی جناب سید محمد اکبر رضوی عادل۔ سیتا پوری)

۵۳۔ چھبیدا شاہ

آپ محمود آباد۔ ضلع سیتا پور کے ایک صوفی منش بزرگ تھے۔ گونا بینا تھے مگر باطن کی آنکھیں خوب روشن تھیں۔ بڑے ذہین تھے۔ آپ نے ہندی میں "مینا متھ" کتاب لکھی ہے۔ آپ کا آبائی وطن تالگاؤں۔ ضلع سیتا پور تھا۔ آپ شعر کہہ کر دوسرے آدمی کی مدد سے کاغذ پر لکھوا لیتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ کے مُرید نے آپ کی کتاب کے جواب میں کتاب لکھ کر اپنے پیر و مرشد کو سُنائی۔ جس کو سُن کر آپ سخت ناراض ہوئے اور اپنے ہاتھوں کو مُرید کے ہاتھوں پر پھیر دیا جس سے کتاب کے کل الفاظ صاف اور محو ہو گئے۔ ایک شعر "کتاب مینا متھ کا جو تصوف میں ہے" حاضر کیا جاتا ہے۔

اِک چینگی کر دھمکا دینا ہم سلگائے کے بیت کر لینا
(عطیہ جناب سید محمد اکبر رضوی۔ عادل سیتا پوری)

۵۴۔ شیخ محی الدین

آپ موضع چوکھنڈی، ضلع بارہ بنکی کے رہنے والے صوفی مشرب بزرگ تھے آپ کا ہندی کلام "ہنس جواہر" کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔ چند اشعار آپ کے امام حسینؑ کے سفر کربلا سے متعلق بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں ؎

راہ مولا سُکھ پہچین مدینہ سے حسین چلے

مکہ روئے مدینہ روئے	روئے در و دیوار رے
فاطمہؑ رووں لاگیں بھر کر نین	مدینہ سے چلے حسینؑ

(عطیہ جناب سید محمد اکبر رضوی عادل سیتاپوری)

۵۵ - حزیں زیدپوری

شاکر حسین نام۔ حزیںؔ تخلص۔ زیدپور۔ ضلع بارہ بنکی وطن۔ آپ کا کلام نوحہ و سلام پر مشتمل ہوتا تھا۔ اُردو اور ہندی دونوں میں کہتے تھے۔ پُرانے رنگ کے شاعروں میں سے تھے۔ ایک پُرانی بیاض قلمی میں آپ کا کلام ملا ہے جو بطور نمونہ حاضر ہے۔ ؎

بسرت ماں بین کرے صغرا میں جینے سے بیچار بھئی
جلد آؤ بابا گھر اپنے میں مرنے پر تیار بھئی
اکبر کی راہ نہارت ہوئی درد و کربن تگار ہوں
دھیان آوت چھوٹے بھائی کا فرقت ماں میں بیمار بھئی
دھرتی سے لے آکاش تلک ہوا دریہی ہے شور حزیںؔ
زہرا کے لال سے ناحق بہ کربل ماں مارا مار بھئی

(عطیہ جناب عادل سیتاپوری از بیاض قلمی افضل محمود آبادی صاحب)

۵۶ - سید محمد شبیر رضوی سیتاپوری

سید محمد شبیر نام۔ شبیرؔ تخلص۔ سیتاپور وطن۔ والد ماجد سید محمد اکبر رضوی عادلؔ سیتاپوری جو ریاست محمود آباد کے دفتر میں محافظ دفتر ہیں۔ شبیر صاحب اُردو اور ہندی دونوں میں شعر کہتے ہیں۔ ولادت ۱۹۲۶ء میں ہوئی۔ فی الحال (۱۹۵۸ء) آپ حضرت گنج لکھنؤ کے ریلوے ہیڈ آفس میں اکاونٹ سیکشن میں ملازم ہیں۔

نمونہ کلام

صبح

بھور بھوا اُسر جا نکسا   بچھویں کا وہ لینا رستا
گرمی پا کر مُردے چونکے   سپنے کا ڈسا پھر اُٹھا جیتا

دیگر

سب کا یا پلٹ پھیر ہوتی ہے جب انکھیوں میں ہو اندھیارا
پھر سوجھ نہیں ہے پڑتا ہو جاے جیسا کلیارا
یہ مانس جیندہ رہ کر بھی کچھ ایسا ہے بے چارا
مُنہ تکتا وہ رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

(از بیاض قلمی سید محمد اکبر رضوی عادل سیتاپوری)

۵۷ - سید مبارک حسین محمود آبادی

سید مبارک حسین نام - ڈیوٹ تخلص - محمود آباد وطن - ہنرل گو شاعر ہیں۔ آپ کی ولادت ۱۹۱۱ء میں ہوئی - کلام نہایت نصیحت آمیز ہوتا ہے - ہندی اور اُردو دونوں میں شعر کہتے ہیں - آپ کے قدیم اجداد تلہر کے تھے - لیکن اب ترک سکونت کر کے محمود آباد میں مستقل قیام ہے اور ریاست محمود آباد ہی میں امین کے عہدہ پر فائز ہیں - آپ ہندی کے مشہور شاعر یوسف ہندی کے داماد ہیں - نہایت خوش گو شاعر ہیں - بھارت کے عنوان پر آپ کی ہندی نظم کے چند اشعار نمونۃً پیش کئے جاتے ہیں:

سُنتے ہیں جو آگنی کھائے گا فوراً اُگے گا انگارے
ہم جھلبھُل چرتے رہتے ہیں کیا تاب جو کوئی دم مارے
کیوں مونچھ کریں نیچی اپنی ہم لوگ نہیں ہیں ناکارے
جو من میں آیا کرتے ہیں کب دھونس ہے راجا پرجا کی
جے بولو بھارت ماتا کی جے بولو بھارت ماتا کی

(عطیہ جناب عادل سیتاپوری)

۵۸۔ نواب شیخواپوری

نواب بہت مشہور گو پراج ہیں جو موضع شیخواپور ضلع بارہ بنکی کے رہنے والے ہیں۔
نواب نام اور تخلص ہے۔ ایک واقعہ کربلا سے متعلق آپ فرماتے ہیں ؎

جیبھ کہاں جو بکھان کروں جس پیارے نبی جی کے کاندھے کھلیا
اُمت کی پت راکھن کو کرتار سے ہوا اقرار کریا
یزید بڑا من گھٹیا مہمان بولا کے رار بڑھیا
دیس چھوڑائس، کو دیس بلائس۔ پاچھے سے بیت کا بھاؤ گریا
آل نبی کو کہاں اس کی تاب بھلا کب پائی کو ہاتھ دیو یا
شام کی فوج کیو گھر پاں تو دیون لاگ لو ہار دوہیا
کو اِس بیر جو جھار بھیو جس آپ دھنی تلوار لڑیا
سر نائے دیو پہ شہید کیو نت تمری لیت نواب بلیا
دادا امام۔ امام کے باپ۔ امام کے پوت۔ امام کے بھیا

(عطیہ جناب سید محمد اکبر رضوی عادل سیتاپوری)

۵۹۔ زائر سیتاپوری

سید محمد اطہر رضوی نام، زائر تخلص، سیتاپور وطن۔ والد ماجد سید مقبل حسین صاحب
مرحوم۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں آپ کی ولادت ہوئی۔ سلسلۂ ملازمت سنہ ۱۹۳۲ء سے شروع
ہوا۔ ۱۵ / اگست سنہ ۱۹۵۵ء سے آپ ریاست محمود آباد ضلع سیتاپور میں بحیثیت مدار المہام
ریاست ممتاز ہیں۔ نہایت خوش گو شاعر اور ادیب ہیں۔ خوش اخلاقی اور مروت کا جذبہ
اپنے اجداد سے پایا ہے اور اسی سیرت کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔ چند کتابوں کے مصنف
ہیں۔ مثلاً ماتم کدہ۔ حقائق غم وغیرہ طبع ہو چکی ہیں۔ آپ سید محمد اکبر عادل سیتاپوری
(جو تذکرہ ہذا کی تالیف میں امداد فرما رہے ہیں) کے حقیقی بھائی ہیں، ہندی اور اردو

دونوں میں آپ کا کلام ملتا ہے۔ آپ طرزِ جدید کے باکمال شاعر ہیں۔

نمونۂ کلام

پھر چاند محرم کا نکلا، پھر جگ نے نیا چولا بدلا
گھنگھور گھٹائیں من سے اُٹھیں اور آنکھوں سے پانی برسا

بھونچال عرب اٹھا تھا سب دھرتی ڈگمگ کرتی ہے
وہ بن کر کھیون ہار اُٹھا، اور رہبر اُبڑھ کر تھام لیا

وہ ایک حسینا سوامی ہے اک دھرمی ہے اک گیانی ہے
وہ ست کی سیوا کرتا ہے، سچائی کا رکھوالا ہے

ہاں کہہ کے حسینا ٹوٹ پڑو سنسار کے سارے جھگڑوں پر
گر جوجھ گئے تو مکتی ہے اور جیتے بچے تو رن مارا

مت ریکھیو چنچل مایا پر یہ کایر ہے یہ ڈائن ہے
جو اس کے بھنور میں آن پھنسا اُبھرا نہ کبھی ایسا ڈوبا

(عطیہ جناب سیّد محمد اکبر رضوی عادل سیتاپوری)

۶۰۔ عادل سیتاپوری

سید محمد اکبر رضوی نام۔ عادل تخلص۔ سیتاپور وطن، والد ماجد سید مقبول حسین مرحوم، سالِ ولادت ۱۹۰۲ء۔ آپ نبیرہ سیّد ناظر حسین صاحب، وکیل ہیں جو بڑے قابل اور علم دوست بزرگ تھے۔ تا حال (۱۹۵۸ء) ریاست محمود آباد کے صدر دفتر میں محافظ دفتر کے عہدہ پر فائز ہیں۔ آپ کو تصنیف و تالیف کا شغف اور مضمون نگاری کا بڑا شوق ہے۔ واقعہ کربلا پر اردو اور ہندی کلام موجود ہے۔ تقریباً تئیس کتابوں کے مصنّف ہیں تا حال تاریخ سیتاپور (اودھ) کی تالیف میں مصروف ہیں۔ دیگر تالیفات میں حسین دنیا، محمدی دنیا۔ علوی دنیا۔ اسلامی دنیا۔ قرآنی دنیا، بین الاقوامی انداز کی کتابیں ہیں ایک تذکرہ مصوّر ہندوستان کے ممتاز شعرا کا ہے جو تذکرہ ارباب کمال، سے موسوم ہے

اسلامی ہندو اور ہندوانہ اسلام نئے انداز کی کتاب ہے جو ہندو مسلم مساوات کی آئینہ دار ہے۔ نمونۂ کلام ؎

کلجگ کا سمے ہے دھرتی پر شبیرؔ پہ بپتا آئی ہے
دی دھرم کی خاطر سب پونجی نہ ہیتر رہا نہ بھائی ہے

اک اور گھرا دل بادل ہے اور سہمے تھوڑے جیو ڈھلے ہے
یہ سینا حسینی بیرن کی لو ہو ہیں کیسی نہائی ہے

سب چھیجھن منہ سے نکالے ہیں اور ندیا نیر چمکتا ہے
سب بچے کھجر ٹھانے ہیں جل داتا کی دھوم مچائی ہے

اے لوگو من مان سوچو تو ہے ست کو کیا ست کیا
شبیرؔ نے اپنا جیون دے کیا دھرم کی بات بنائی ہے

(از گلشنِ افکار قلمی مولفہ عادل سیتاپوری)

شیخ بادشاہ حسین ایم اے

شیخ بادشاہ حسین نام۔ لوان ضلع سیتاپور وطن۔ آپ نہایت بلند ہستی کے مالک تھے۔ والد ماجد کا نام شیخ فدا حسین صاحب پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ شیخ بادشاہ حسین اکسائز انسپکٹر کے عہدے پر فائز تھے اور نہایت پرہیزگار شخصیت رکھتے تھے کبھی شراب یا دیگر مسکرات اپنی زبان سے مس نہیں کئے۔ آپ ہفت زبان تھے انگریزی میں ایم۔ اے تھے۔ اہلِ یورپ نے بھی آپ کی انگریزی کی مدح کی ہے۔ کیونکہ اخبارات میں آپ کے مضامین نکل چکے تھے۔ سنسکرت میں آپ نے مدھما کا امتحان ہندو یونیورسٹی بنارس سے دیا تھا۔ ہندی میں بھی آپ کو کمال حاصل تھا۔ دور دور کے اضلاع میں آپ کی قابلیت کا ہم پایہ نہ تھا۔ بارہ کتابیں آپ کی شائع ہوئی ہیں۔ آپ نے قرآن شریف کا ترجمہ انگریزی میں کیا تھا لیکن وہ کل طبع نہ ہو سکا۔ محض چند پارے طبع ہوئے تھے۔ ہندی سنسکرت کتابوں میں "پرنسپیا سنسکریا" "پورس ہندی" "بودپا ٹھاولی"

خصوصیت سے یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ کلام دستیاب نہیں ہو سکا لیکن کتابیں
آپ کی ہندی شاعری کی شاہد ہیں۔ ۵؍ اگست ۱۹۳۷ء میں بمقام بوان انتقال
فرمایا۔ آپ نہایت خوش اخلاق۔ نیک طبع اور بلند خیال تھے۔ مختصر یہ کہ سنسکرت
اور ہندی میں آپ کا جواب مسلمانوں میں تو کیا ہندوؤں میں بھی نہ تھا۔ آپ کی ہستی
یادگار ہستی ہے۔

(عطیہ جناب سید محمد اکبر رضوی عادل سیتاپوری)

۶۲۔ رضا

سید آل رضا نام۔ رضا تخلص۔ والد ماجد سید محمد رضا چیف جسٹس ہیں ۱۸۹۶ء
میں بمقام نیوتنی ضلع اناؤ، ولادت ہوئی۔ مختلف اضلاع میں اپنے والد کے ہمراہ رہے۔
زیادہ تر عرصہ سیتاپور میں گزرا۔ وہیں سے انٹرنس پاس کیا۔ ۱۹۲۰ء میں ایل۔ ایل
بی کا امتحان پاس کر کے پرتاپ گڑھ میں رہے۔ پھر لکھنؤ آئے۔ اردو کے علاوہ ہندی
کلام میں بھی آپ کو دخل ہے، مگر اسی قدر جو زبان کے لحاظ سے بار نہ ہو۔ نوائے رضا"
... کے نام سے مجموعہ کلام طبع ہو چکا ہے۔ نیز "شہادت سے پہلے اور شہادت
کے بعد" ایک مرثیہ طرز جدید میں طبع ہو چکا ہے۔ "ابلا بنتی" بھی .... ایک مختصر سی کتاب
شائع ہوئی ہے جو ۱۳۶۱ھ کی یادگار ہے۔ نمونہ کلام ؎

بھارت سے پچھم اور اُتر اک دیش عرب ہے دھرتی پر
تیرہ سو سال آج سے آگے اس دیش میں بستے تھے ابھاگے
ملک عرب کی پاپی جنتا، اونٹ چرانے والی جنتا
کچھ ایسی مورکھ جنتا تھی، حیوانوں کی اک دنیا تھی
دنیا کو دیا وہ سکھ چین مشہور ہوا اس کا نام حسینؑ

۶۳۔ سید محمد عبداللہ علم کانپوری

سید محمد عبداللہ نام۔ علم تخلص۔ مذہباً سید۔ آپ کانپور (یو۔پی) کے صاحبِ مشرب مسلک صوفی بزرگ تھے۔ میر ناصر علی اویس سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ چمڑے کے ایک مشہور تاجر تھے۔ عرصہ تک کان پور سے "علمی جنتری" کے نام سے ایک جنتری نکالتے رہے۔ اُردو، فارسی کے علاوہ وہ ہندی کے گیت بھی کہتے تھے۔ ہندی اور اُردو کلام کا ایک مجموعہ "نغمۂ طرب" المعروف بہ راگ چمن اکتوبر ۱۸۹۳ء میں مطبع محمدی کان پور سے شائع ہوا تھا۔ انقلاب ۱۹۴۷ء سے پہلے وفات پائی۔

نمونۂ کلام

اَرِے تے نے سگری عمریا کھوئی

لکھا کرم مان جو بدھنا نے میٹ سکے نا کوئی

لاکھ اُپاؤ کرو تم چاہے کرو سو ہوئی

اَرِے تے نے سگری عمریا کھوئی

ہر کا ابھوُن دھیان لگاؤ دُنیا ہے نرموہے

یہ دُنیا کا پاکھنڈ سگرو نتیرو ناہیں ہوئی

اَرِے تے نے سگری عمریا کھوئی

تم نے علم اس جگت مان بھس کر ساری گریا کھوئی

بیری درسٹ نے اب توری منجدھا کان ناؤ ڈبوئی

ارے تے نے سگری عمریا کھوئی

(عطیہ حضرت ناظم سیتاپوری)

○

۶۴ظریف لکھنوی

سید مقبول حسین نام۔ ظریف تخلص۔ ان کے والد ماجد سید فضل حسین صاحب رکن خانوادہ علم و فضل ہونے کے علاوہ نہایت خوش طبع اور زندہ دل تھے۔ ان کا آبائی وطن اولاً فیض آباد۔ پھر عہد شاہی سے شہر لکھنؤ۔ مدت سے محلہ مولوی گنج میں مکان مسکونہ۔

ظریف مرحوم جناب مولانا صفی جیسے ذی علم سلیم المذاق اور قادر الکلام شاعر کے شاگرد اور حقیقی بھائی ان سے آٹھ سال اور کچھ مہینے چھوٹے تھے۔ ولادت ۲۴ فروری ۱۸۷۰ء مطابق ۲۲ ذی قعدہ ۱۲۸۶ھ بروز پنجشنبہ ساڑھے گیارہ بجے شب اپنے مکان مسکونہ مولوی گنج میں ہوئی۔ ۱۸۷۵ء میں تعلیم شروع ہوئی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب سرسید نے علی گڑھ میں انگریزی تعلیم گاہ کھولی۔ ظریف نے کلام مجید اپنی بڑی بھاوج (مولانا صفی کی اہلیہ) سے پڑھا۔ اور اردو فارسی کی درسی کتابیں اپنے بڑے بھائی سے پڑھیں۔ اور اپنے پڑوسی پنڈت رجن لال صاحب سے ہندی بھاشا اور تھوڑی سنسکرت پڑھی۔ نو دس برس کی عمر میں اپنی چھوٹی سی غزل مشاعرے میں پڑھنے لگے تھے۔ تا حیات ریاست محمود آباد ضلع سیتاپور سے خاص وابستگی رہی۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۳۷ء سوا دو بجے بعد دوپہر انتقال کیا۔ آپ کا دیوان ریاست محمود آباد ہی کی قدر شناسی سے کافی رقم خرچ کر کے "دیوان جی" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ آپ کی شاعری کا انداز اکبر کی طرح نشاطیہ ہے اور اس میں اصلاحی۔ اخلاقی۔ معاشرتی اور سیاسی فوائد ملحوظ رکھے گئے ہیں۔

ہندی میں آلھا ایک ایسی زوردار رزمیہ قسم کی نظم ہوتی ہے جس کو خاص لے اور طرز میں گاتے اور پڑھتے ہیں۔ اس سے دلوں میں جوش اور ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ ظریف صاحب کی یہ آلھا ۱۴ شعر کی طویل نظم ہے جو جناب خان بہادر راجہ امیر احمد خاں صاحب محمود آباد کی گدی نشینی کی تقریب سعید میں پڑھی گئی۔ نمونہ کے طور پر

دو چار شعر ملاحظہ ہوں ۔ ؎

ہے جو ریت بشیر سب تے سنورے بھیا بات ہمار
اے محمود آدر ہیا تمھرے کرسن کے بلہار
دیا بھئی اُس نارائن کی، پایا بڑا گنی سردار
دُکھ کی تمھرے ناؤ کھوئیا آن پھنسی بیچ نوں منجھدہار
امیر احمد راجہ صاحب اُن داتا دھرما اوتار
چھِن چھِن یا ڑھے دھن دولت اور سکھی رہی سارا پریوار
ما پچھ کرو جو ہم کہہ ڈارا اچّا چھار ہے تمھار
رہو آنند کھُوسی سب مل جل راجہ کی بولو جے کار

سو دیشی اُردو

سمّت اپنی سبھا میں نہ کیا گنت اُن نے
لاکھو سمیدنہ کی آپ کے شیدائی نے
بچھا اُبھیرا ئے یہی تھا کہ سما چار بتائیں
گنت اُتر نہ دیا مجھ کو کسو بھائی نے
اِس سمے تو تجھے بشواس نہیں ہے مجھ پر
پرشن کیوں یہ کیا اُن کی مسیحائی نے

۶۵ ۔ مضطر خیر آبادی

آپ کا نام مولوی سید افتخار حسین اور تخلص مضطر تھا ۔ حافظ سید احمد حسین رُسوا کے بیٹے اور خیر آباد کے متوطن تھے ۔ والدہ ماجدہ مولوی فضل حق کی بیٹی تھیں، ۱۲۸۲ھ میں ولادت ہوئی (افتخار) سے تاریخ ولادت نکلتی ہے ۔ اپنی والدہ (جو خود شاعرہ اور عربی فارسی کی عالمہ تھیں) سے تعلیم حاصل کی ۔ امیر مینائی سے تلمذ تھا ۔ پہلے کوہ آبو پر سفیر ریاست ٹونک، پھر گوالیار میں ڈسٹرکٹ اور مجسٹریٹ

اور بھوپال میں محکمہ جنگلات کے سکریٹری ہوئے۔ ۱۶/ رمضان ۱۳۴۵ھ میں وفات پائی، آپ والیٔ ریاست ٹونک کے اُستاد تھے۔ اعتبار الملک کا خطاب عطا ہوا تھا، ہندوستان کے مشہور شعراء میں آپ کا شمار تھا۔ آپ کو دنیا صرف اُردو شاعر کی حیثیت سے جانتی ہے لیکن فی الحقیقت آپ ہندی کے بھی باکمال شاعر تھے۔ آپ کا وہ ملہار جو ہندوستان کے برساتی گیتوں کی جان ہے، ملک بھر میں گایا جاتا ہے،

چھا رہی اودی گھٹا جیئرا مورا گھبرائے رے
سُن ری کوئل باوری تو کیوں ملہاریں گائے ہے

او پپیہا آ ادھر میں بھی سراپا درد ہوں
آم پر کیوں جم گیا میں بھی تو دیسی زرد ہوں
فرق اتنا ہے کہ اُس میں رس ہے مجھ میں لے ہے

چھا رہی . . . .

ٹھمری

آؤ آؤ نگریا ہماری رے	تم بِن سونی سیجریا ہماری رے
عید و نا کو بھول گئے کس خیال میں	کیا تم بھی پھنس گئے کسی گیسو کے جال میں
کیوں نہ لینی خبریا ہماری رے	آؤ آؤ . . . .

گیت

موری توری نبھے کیسے پریت	تو تو روٹھ جات بن بات چیت
مضطر پیا سے کہو پپیہا	تم تو رہے سوتنیا کے میت

موری توری . . . .

ہولی

کاہے مضطر گوری کھیلت تھے ہوری
رات سپنے میں آئے پیا کھیلن موسے ہوری
کیسریا گیسوئین پہ باندھے تھا پگ رنگ پڑ وری

ہات لئے رنگ پچکاری ابرا کی ڈاری جھوری
دبے پگ چوری چوری.... رات سپنے میں...

(اقتباس از مقالہ "مضطر ہندی شاعری کی حیثیت سے" علیگڑھ میگزین۔ جنوری ۱۹۳۶ء)

۶۶ ۔ حرماں

آپ کا اسم گرامی بی بی سعیدالنسا اور حرماں تخلص تھا۔ آپ مولوی فضل حق کی دختر نیک اختر شمس العلماء علامہ عبدالحق حقیقی ہمشیرہ اور مضطر خیرآبادی کی والدہ ماجدہ تھیں۔ اُردو، فارسی اور ہندی تینوں زبانوں میں شعر کہتی تھیں۔ آپ کی ٹھمریاں بہت شہرت رکھتی ہیں۔ کلام کا نمونہ دستیاب نہیں ہو سکا۔

(از بیاض قلمی حضرت عادل سیتاپوری)

۶۷ ۔ بسمل خیرآبادی

آپ کا نام سیّد احمد حسین اور بسمل تخلص تھا۔ آپ مضطر خیرآبادی کے حقیقی بڑے بھائی تھے۔ نواب ٹونک پہلے آپ کے شاگرد ہوئے تھے۔ پھر مضطر خیرآبادی سے رجوع کیا۔ آپ ہمشیرہ زادہ شمس العلماء مولوی عبدالحق منطقی تھے۔ اردو اور ہندی میں شعر کہتے تھے۔ نمونہ کلام نہیں مل سکا۔

(از بیاض قلمی حضرت عادل سیتاپوری)

۶۸ ۔ عنواں چشتی منگلوری

صاحب موصوف نے اپنے حالات خود لکھ کر عطا کئے ہیں، جو من وعن (صیغہ واحد متکلم میں) حاضر کئے جاتے ہیں:۔

میرا نام افتخار الحسن ہے۔ دنیائے ادب میں عنواں چشتی کے نام سے بدنام ہوں۔ قصبہ منگلور (سہارنپور) تاریخی مقام، علم و ادب کا مرکز اور شرفا کی بستی ہے

میرا وطن ہے۔ ۱۹۳۵ء میں پیدا ہوا۔ سلسلہ نسب شیخ الشیوخ سید السالکین حضرت شاہ عثمان جہاں گیر چشتی عرف شاہ ولایتؒ تک پہنچتا ہے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ اور اس کے بعد آگرہ یونی ورسٹی سے بی۔ اے اور پھر جامعہ اردو سے ادیب کامل کیا اور آئی۔ جی۔ ڈی بمبئی کا امتحان پاس کیا۔ ذوق شاعری ورثہ میں ملا۔ میرے والد محترم پیرزادہ سید انوارالحسن صاحب انوار منگلوری سجادہ نشین درگاہ حضرت شاہ عثمان جہاں گیر چشتیؒ کہنہ مشق اور معروف شاعر ہیں۔ ابتدا میں میں نے حضرت نکہت علی صاحب ادیب منگلوری اور والد محترم حضرت انوار منگلوری سے اکتساب فیض کیا اور انھیں دونوں بزرگوں کے حکم اور ایما سے سحاب سخن حضرت ابر احسنی گنوری کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہو گیا۔ استاذی حضرت ابر احسنی صاحب نے اپنی تصنیف "میری اصلاحیں" میں خاکسار کو اپنے مخصوص تلامذہ کی فہرست میں رکھا ہے۔ ہندوستان و پاکستان کے اکثر و بیشتر معیاری اخبار و رسائل کی قلمی خدمت کرتا ہوں۔ اب ہندی کی طرف رجحان بڑھ رہا ہے اور گیت لکھنے لگا ہوں۔ آج کل ایس۔ ایم۔ اے۔ او کالج آگرہ میں معلمی کی خدمات انجام دے رہا ہوں:

تنبیہہ:۔ آپ نے یہ حالات مورخہ ۱۲ اگست ۱۹۵۹ء کو عطا فرمائے تھے۔ اب تو ماشاءاللہ آپ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی ہیں اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبۂ اردو کے صدر ہیں۔

نمونۂ کلام

نیر بہائے نین ہماری	اور مسکائے دنیا ساری
پریم سندیسہ دینے آئے	لے کر آئے ساتھ کٹاری
یہ ہے اب سنسار کی حالت	دن کالے ہیں رات اجیاری
گھر نا سے ہے گھرنا مجھ کو	میں تو ہوں اک پریم پجاری

عنوان دنیا سچ کہتی ہے
لاچاری پربت سے بھاری

میں تجھ کو بھولتا جاتا ہوں
میرے ماتھے کا چندن تیرے پگ کملوں کی دھول
میری باہوں کے جھولے میں بھول سکے تو جھول
میں نے تجھ سے پیار کیا ہے یہ ہے میری بھول
بیت نہ جائے رات سہانی انتم بار بلاتا ہوں
میں تجھ کو بھولتا جاتا ہوں

۶۹ حامد الہ آبادی

آپ نے اپنے حالات خود لکھ کر عطا فرمائے ہیں :۔

مکرمی، تسلیم!

چوں کہ اپنے والدین میں سے کسی کو دیکھنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس لئے مجھے اپنا سنہ ولادت بھی معلوم نہیں۔ ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی خانماں بربادی سے دو چار ہونا پڑا۔ ہوش سنبھالا تو غیر شعوری طور پر سیاسی تحریکوں کی نعرے بازی کا شکار رہا۔ والد کا نام زاہد علی تھا۔ بڑی حد تک کاروباری مشغلہ کتب فروشی رہا، جس کا سلسلہ آج کل بھی چل رہا ہے۔ اس کے برعکس اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کاروباری حالات بنتی اور بگڑتی رہتی ہے۔ آج بھی اس کا شکار ہوں۔ فی الحال دو گیت حاضر خدمت ہیں۔

گیت

ایک تو جیرا لاگے ناہیں، دوجے چلت پروائی رے
ساجن بن اب کچھ نہ بھائے، بھول چلی ہرجائی رے
برکھا رت کی ریت یہی ہے سب پر برسے سب پر گرجے
کاری بدریا یہ کیا جانے کس پر کیا بن آئی رے
لاج لگے ہے پربت ہیں پریتم من کی بتیاں کہتے لیکن
بیاکل من دا ہر پھر پوچھے سدھ میری کیوں بسرائی رے

کوئل کوکی، بلبل چہکی، پنکھ پکھیرو بگین جاگے
پاپی پپیہا شور مچائے ساون کی رت آئی رے

پھول کھلے تو آنگن مہکے، چاند ہنسے تو بن مسکائے
پیار کا ناتہ جوڑ کے پنچھی نین کنول سے دھوکہ کھائے
انکھیئں موری درشن پیاسی، تم بن گھر پردیس بھئیو ہے
دور کھڑی میں راہ تکت ہوں ساجن ساون بیتا جائے
آشاؤں کے دیپ جلانا حامل ریت پرانی ہے
اپنی آگ میں جلنا مشکل کون کسی کا من بہلائے

۷۰ - نواب وزیر مرزا قدر پیا

قدر پیا لکھنؤ میں ٹھمری کے بہت مشہور مصنف گزرے ہیں۔ یہ شاہانِ اودھ کے خاندان سے تھے۔ ان کو چوکھی والے نواب بھی کہتے تھے کیوں کہ انھوں نے چار لاکھ روپیہ صرف کر کے ایک عمارت بنوائی تھی جو ہنوز موجود ہے۔ یہ نہایت خوش گلو تھے۔ ان کی ٹھمریاں اہلِ فن میں بہت مقبول ہوئیں۔ آپ کی کچھ ٹھمریاں "کرمک پستک مالیکا" حصہ سوم میں ملتی ہیں۔ مثلاً ؎

قدر اب کیسے لاگے نیا پار (دیا) موہے نندیا لاگی رے

مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی مرحوم ماہنامہ آج کل دہلی، اکتوبر ۱۹۵۶ء کے صفحہ ۴۸ پر رقم طراز ہیں کہ:-

"نواب وزیر مرزا صاحب قدر ماہر موسیقی ہونے کے علاوہ ہندی کے بہت اچھے شاعر تھے۔ ان کی ٹھمریاں خصوصاً ہولیاں صرف لکھنؤ ہی میں نہیں، دور دور مشہور ہیں۔ ؎

پھول گیندوا نہ مارو مہاراج   لگت کرجوا بیں چوٹ

ایسے برج کے کیا نہیں ہوا جارے دار
موپے رنگھی نہ ڈارو ستیاں بار بار

اور نہ معلوم کیا کیا جواہر پارے ہیں۔ موسیقی میں اُن کے شاگرد نواب صادق علی خاں تھے، اور اُن کی شاگرد اُس زمانے کی تمام طوائفیں اور گویے۔"

جناب سائل حیدری مینائی گوالیاری نے قدر پیا کی ایک کانی کی ہولی عطا فرمائی ہے، ملاحظہ ہو۔

موئی پہ ڈاردی بھری رنگ کی گگر   میں دھوکے سے دیکھن لاگی ادھر
بھری ڈاردئی مو پہ رنگ کی گگر
رنگ بھر کوں گی جانے نہ دوں گی   مانو مانو کہی جرا ٹھہرو کدر (قدر)
بھری ڈاردئی مو پہ رنگ کی گگر

۷۱ - بندہ دین مہاراج

مسلمان ٹھمری لکھنے والوں۔ گانے والوں اور بتانے والوں نے کرشن جی سے متعلق اس طرح ٹھمریاں لکھیں گائیں اور بتائیں ہندو مسلمان فرق کہیں نظر نہیں آتا۔ چنانچہ مذہبی رنگ کی ٹھمریاں بندہ دین مہاراج سے زیادہ کسی کی مقبول نہیں ہوئیں۔ یہ خود ٹھمری تصنیف بھی کرتے۔ گاتے بھی اور بتاتے بھی تھے۔ اسی سال کے قریب عمر پاکر ۱۹۲۰ء کے قریب انتقال کیا۔ ان کا مکان محلہ پل بھاؤ لال میں بھیروں جی کے مندر کے قریب ابھی موجود ہے وطن لکھنؤ ہے۔ یہاں اُن کی ایک ٹھمری لکھی جاتی ہے، جو راگ بھیرو میں بندھی ہوئی ہے۔

موہے چھیڑت موہن گرد ھاری
نٹ کھٹ نند جی کو لال نہ مانت   بندہ کہت میں تو انھیں سے ہاری

(از رسالہ آج کل دہلی۔ جون ۱۹۵۸ء صفحہ ۶)

۲۔ ۷ منّے خاں

بڑے منّے خاں لکھنؤ میں فن موسیقی کے بہت بڑے استاد گزرے ہیں۔ نہایت خوش گلو تھے۔ بیشتر خیال گاتے تھے لیکن عوام کو خوش کرنے کے لئے محفل میں ایک دو ٹھمریاں بھی گاتے تھے بول بنانے کا انداز اس قدر دلکش تھا کہ لوگ مست ہو جاتے تھے۔ ان کی ایک ٹھمری یہ ہے۔

چاندنی رات چمک رہے تارے ابھوں نہ آئے بلما ہمارے
چاندنی رات ....

(ماہنامہ آجکل دہلی جون ۱۹۵۸ء صفحہ ۷)

۳۔ ۷ میاں فضل حسین

میاں فضل حسین جو محلہ مرغ خانہ لکھنؤ میں رہتے تھے، مشہور گائک تھے خیال اور ٹھمری دونوں ہی خوب گاتے تھے۔ ایک ٹھمری جو وہ خاص طور پر بتاتے تھے، اور ان کے صاحب زادے مصطفےٰ حسین بھی گایا اور بتایا کرتے تھے درج ذیل ہے ؎

دیکھو ری نہ مانے شیام
ڈگر چلت موری بہیاں گہے لینی ایسے ڈھیٹ سے موہے پڑ و کام
دیکھو ری نہ مانے شیام

آپ نے بیسویں صدی کے آغاز میں پیرانہ سالی میں انتقال کیا۔ آپ کے صاحبزادے مصطفےٰ حسین ۱۹۳۵ء تک زندہ تھے ان کے بعد ان کا ایک لڑکا سخاوت حسین تھا وہ بھی گایا کرتا تھا لیکن اس نے عالم شباب میں وفات پائی۔ (منقول از ماہنامہ آجکل دہلی جون ۱۹۵۸ء صفحہ ۷)

۴۔ ۷ میاں علی جان

میاں علی جان لکھنؤ میں ایک نامی ٹھمری لکھنے والے جمانے والے اور بتانے والے تھے۔
میاں فضل حسین کے چند سال بعد تک زندہ رہے۔ بہت خوب گاتے اور بتایا کرتے تھے

ان کی ایک ٹھمری جو بہت مشہور تھی اور جس کی اکثر فرمائش کی جاتی تھی درج ذیل ہے ؎

پیا سے سندیسا مورا کہیو جائے

کاگا رے جا رے جا رے — پیا سے سندیسا ۔ ۔ ۔ ۔
یاد آوت جب اُن کی بتیاں — بِن دیکھے کل نہ پڑے جیا جائے
پیا سے سندیسا مورا کہیو جائے

(منقول از ماہ نامہ آج کل دہلی جون ۱۹۵۸ء صفحہ ۱۷)

۷۵ ۔ راحت

لکھنؤ میں میاں علی جان کے صاحب زادے راحت حسین نے ماسٹر راحت کے نام سے بڑی شہرت حاصل کی۔ گراموفون کمپنی نے ان کے بہت سے گانے ریکارڈ کئے ہیں۔ ان کے گانے کی سب سے مشہور ٹھمری درج ذیل ہے ؎

اُٹھی ہے گھنگھور ۔ ۔ ۔ گھٹا بینے برسن لاگی

کیسی کروں جیا نہیں مانے۔ گرج رہی بجلی — کڑک مجھ برہن کو یہ ستائے
اُٹھی ہے گھنگھور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
ایک تو اکیلی پیا بِن ڈر لاگے — سونی سیج جیا تڑپے کا سے کہوں
اے ری سکھی بیتی سگری رین — دیکھو بندا گھر شیام نہیں آئے
اُٹھی ہے گھنگھور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(منقول از ماہ نامہ آج کل دہلی جون ۱۹۵۸ء صفحہ ۸)

۷۶ ۔ حیدر جان

لکھنؤ میں ٹھمری کی گائیکی میں حیدر جان نے بھی بڑا نام پایا ہے۔ ان کے ساتھ کچھ ٹھمریوں کی تصنیف بھی منسوب ہے۔

(منقول از ماہ نامہ آج کل دہلی جون ۱۹۵۸ء صفحہ ۸)

۷۷۔ للن پیا

لکھنؤ کے ٹھمری گانے والوں میں للن پیا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ موصوف ٹھمری کے بہترین مصنف اور گانے والے تھے۔ وہ اپنی ٹھمری کو حسبِ فرمائش تال کے کسی بھی ماترہ سے شروع کر دیتے تھے۔ کسی نے حسد سے پان میں سیندور یا کوئی اور ایسی ہی چیز دے دی تھی جس سے آخری عمر میں گلے نے جواب دے دیا تھا پھر بھی تال کا کام اچھا کرتے تھے۔ اگرچہ اصل وطن فرخ آباد تھا لیکن اکثر لکھنؤ میں قیام رہتا تھا۔ ان کی ٹھمریوں کا ایک مجموعہ "للن ساگر" کے نام سے نولکشور پریس سے شائع ہوا تھا۔ للن صاحب اب سے (۱۹۵۸ء سے) تیس سال قبل زندہ تھے۔

(منقول از ماہ نامہ آج کل دہلی جون ۱۹۵۸ء صفحہ ۸)

۷۸۔ اعظم پیا

یہ دادرا کے اُستاد تھے۔ یہاں اُن کا ایک دادرا دیا جاتا ہے جس میں راگ کی پوری پوری پابندی کی گئی ہے۔

استائی

شدھ نہ لینی جب سے گئے نینوا لگائے کے
نینوا لگائے مورا جیرا ڈرائے کے

انترہ

تڑپت ہوں رین دنا چین نہیں اُن بنا
اعظم پیا بیٹھ رہے سوتن گھر جائے کے
شدھ نہ لینی ....

(منقول از ماہ نامہ آج کل دہلی جون ۱۹۵۸ء صفحہ ۱۷)

۷۹۔ امراؤ

کچھ مسلمان حضرات نے مذہبی رنگ میں وادرے لکھے ہیں۔ چودھری امام الدین المتخلص بہ امراؤ کا ایک دادرا ملاحظہ ہوے

دکھائے دیو ہمکا شہر مدینہ...... دکھائے دیو......

تم بن برہا انت دُکھ دینا..... دکھائے دیو.....

شاہ نجف تری بلہاری درشن دیو سپھل ہوئے جینا...

دکھائے دیو.......

پنجتن پاک کی اَننت گاؤں آؤ امراؤ بجاؤ رس بینا

دکھائے دیو ہمکا شہر مدینہ

(از ماہ نامہ آج کل دہلی جون ۱۹۵۸ء صفحہ ۱۸)

تنبیہہ :۔ لکھنؤ کے مشہور موسیقار اُستاد صادق علی خاں ٹھمری کے موجد اور پیش رو سمجھے جاتے تھے۔ علاوہ ازیں معزالدین اپنے وقت کے مقبول ترین ٹھمری گانے والے مانے گئے۔ لکھنؤ ہی ٹھمری کو صحیح فن کارانہ طور پر ادا کرتے ہیں ان کا کمال یہ ہے کہ وہ ایک صاحب تخیل موسیقار کی حیثیت سے ٹھمری کو اس کی تمام فنی خوبیوں اور باریکیوں کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ کلکتہ میں استاد فیاض خاں کی شاگرد ملکہ جان اور آگرہ میں زہرہ جان بھی اس ضمن میں قابلِ ذکر ہیں۔ اُستاد عبدالکریم خاں اور غلام علی خاں کو پنجاب رنگ کی ٹھمری گانے میں کمال حاصل ہے۔

(از ماہ نامہ آج کل دہلی جون ۱۹۵۸ء صفحہ ۳۴-۳۵-۳۶)

۸۰۔ نذرالاسلام

قاضی نذر الاسلام ٹیگور کے بعد کامیاب شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے دو ہزار سے زیادہ گیت لکھے ہیں۔ وہ صرف بڑے شاعر ہی نہیں بلکہ خود ایک اچھے موسیقار بھی

ہیں۔ انھوں نے بنگال کی جدید شاعری میں بیرونی عناصر کو شامل کیا ہے اور اس طرح
ملکی موسیقی میں مفید اضافے کیے ہیں۔ مثلاً انھوں نے غزل اور قوالی کی طرز پر گیت لکھے اور
ان کی گت اور نئے کو بجوں کا توں اپنایا۔ اس کا ایک نمونہ دیکھیے۔ ے
من اُداسی۔ بالنسر یا سی بجاؤ سنے

۸۱ - وزیر

قاضی سیّد ہاشم علی نام۔ وزیرؔ تخلّص۔ وطن پر شیدے پور تحصیل سلون ضلع
رائے بریلی۔ آپ انیسوی صدی عیسوی کے نصف آخری زمانے میں گزرے ہیں۔ آپ
ٹھمری کہتے تھے۔ رائے بریلی میں وکالت کرتے تھے۔

(از بیاض قلمی مہر جائسی مرحوم)

۸۲ - نجف عطا

سلون، ضلع رائے بریلی ایک قدیم قصبہ ہے۔ یہاں ایک بھاشا گو شاعر گزرے ہیں۔
نام نجف عطا تھا۔ "پریم کی پھنگاری" ان کی تصنیف ہے۔

(از بیاض قلمی مہر جائسی)

۸۳ - سیّد حماد علی

حماد علی نام۔ حماد تخلص۔ نسباً سیّد۔ نصیر آباد وطن۔ تعلیم ڈبل ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی
آپ ہندی میں شاعری کرتے ہیں اور اچھا کہتے ہیں۔ ۱۹۵۴ء میں ٹونڈلہ ریلوے کالج سے
بحیثیت لکچرار ریٹائرڈ ہوئے۔ (از بیاض قلمی مہر جائسی)

۸۴ - مہر جائسی (مرحوم)

آل محمد نام۔ مہر تخلص۔ وطن قصبہ جائس ضلع رائے بریلی (اودھ) ماں اور باپ دونوں

کی طرف سے نقوی۔ کھرے سید۔ آپ ملک محمد جائسی کی بہن کی نسل سے ہیں۔ آپ کے والد ماجد کا نام سید اکبر حسین محقق جائسی تھا۔ اُن کا انتقال ۱۹۲۹ء میں ہوا۔ آپ کی والدہ محترمہ کا انتقال ۱۹۴۹ء میں ہوا۔ آپ کی ولادت آپ کے نانا کے مکان واقع محلہ۔ دفعہ نصیر آباد نماز صبح کے وقت ۲۱ جون ۱۹۰۵ء کو ہوئی۔ بچپن ہی میں شعر گوئی کا شوق تھا۔ ۱۹۱۶ء میں شعر گوئی شروع کر دی، اور فہیم لکھنوی کے شاگرد ہوئے۔ ۱۹۴۱ء میں سراج الشعرا کا خطاب پایا۔ ۱۹۳۵ء میں "شاعرِ قوم" اور "شمس الادبا" کے خطابات ملے۔

آپ نے ۱۹۳۶ء میں ملک محمد جائسی کا جیون چرتر نامی کتاب ہندی میں لکھی، جو ۱۹۳۹ء میں ناگری پرچارنی سبھا کاشی (بنارس) کے زیرِ اہتمام شائع ہوئی۔ علاوہ ازیں ۱۹۴۳ء میں ان کی سعی جمیلہ سے رائے بریلی میں ہندی لائبریری قائم ہوئی۔ آپ کے اولاد نہیں ہوئی۔ علمی اور ادبی خدمت زندگی کا ماحصل ہے۔ تصانیف میں چھوٹی بڑی تقریباً سو کتابیں ہوں گی۔ ہندی کلام کا بھی ایک ضخیم مجموعہ ہے۔ ۱۹۷۳ء میں انتقال کیا۔

نمونۂ کلام

ڈکھیا کے کوؤ نہیں سکھیا کے سب کوئے
کہ پاؤن بیرا اُٹھے کہ سر دے دکھ ہوئے
کو آیا حق حق کہے، بھید نہ پاوے کوئے
"حق" ناؤ کے جاپ سے سو نرکس ون ہوئے
کانکر پاتھر جوڑ کے، کوٹ بناوے کوئی
بھیہ ماں نیکھ پنکھیرو کا رین بسرا ہوئے
دوشی نر دوشی بنے، دوش نہ لکھے کوئے
اس اپرادھی کال ماں جو اپرادھ نہ ہوئے
گنگا ماں جمنا ملے رنگ نہ بدلے کوئے
لاکھ امر ہو آتما پرم آتما کے ہوئے

مہر نیوتے بانٹرے کا جگ ماں ناہیں کوئی
کون گتھنتا کے سیمے سنگ سنگھاتی ہوئے

۸۵۔ اثر جائسی

سید محمد ضامن نام۔ اثر تخلص قصبہ جائسی ضلع رائے بریلی وطن۔ اردو اور ہندی دونوں میں شعر کہتے ہیں۔ آپ نے ہندی بھاشا میں حالات شہادت حضرت امام حسینؑ نظم کئے ہیں۔ (از بیاض قلمی مہر جائسی)

۸۶۔ تمنا لکھنوی الجائسی

سید مجاور حسین نام۔ تمنا تخلص۔ لکھنوا الجائسی۔ اردو اور ہندی دونوں کے باکمال شاعر۔ حضرت جاوید لکھنوی مرحوم کے جانشین اور برادر نسبتی تھے۔ ۲۵ رجب ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۹۴۰ء بمقام لکھنوا انتقال کیا۔ شادی نہیں کی تھی۔ عمر ساٹھ سال سے زیادہ تھی۔ مرنے کے وقت تنہا تھے۔ کلام دوسروں کے ہاتھ پڑکر ضائع ہوگیا۔ ان کی مطبوعہ بیاض "نخل ماتم" میں بہت سے نوحے ہندی کے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ہندی گوئی میں آپ کو کس قدر دست رس حاصل تھی۔

(بیاض قلمی مہر جائسی)

۸۷۔ عاشق جائسی

عاشق علی نام۔ عاشق تخلص۔ باپ کا نام ناظم علی مرحوم۔ دادا کا نام خدا بخش جو ہندو سے مسلمان ہوئے۔ محلہ سیدانہ جائس کے رہنے والے ہیں۔ ولادت ۱۹۰۸ء بچپن ہی میں چیچک نکلی۔ دونوں آنکھوں کی روشنی ضائع ہوگئی۔ رنگ گہرا سانولا ہے منہ پر چیچک کے داغ۔ دعا۔ تعویذ پھونک جھاڑ۔ قوالی وغیرہ سے بھی شوق ہے۔ پڑھے لکھے بالکل نہیں۔ شاعری میں مہر جائسی کے شاگرد ہیں۔ ہندی میں ٹھمری۔ دوہا

اور نوحہ خوب کہتے ہیں۔

نمونۂ کلام

زینب دکھیاری کربل بن ماں | رد رو بین سناوت ہے
ہاے حسینا پیرن موے | تم بن جیرا جاوت ہے
زہرا بی بی تھامے کلیجہ | نین نیر بہاوت ہے
نسل نبی کا گیا رھوان ھبر | اس نگری سے جاوت ہے

(از منقول بیاض قلمی تہر جائسی۔ ۵۹-۸-۲۸)

۸۸۔ فغان جائسی

سید حماد علی نام۔ فغان تخلص۔ قصبہ جائس، ضلع رائے بریلی وطن۔ مذاقیہ کلام میں جوکر تخلص کرتے ہیں ہندی میں نوحہ کہتے ہیں۔

(از بیاض مہر جائسی مرحوم)

۸۹۔ کریم گھوسی

کریم گھوسی۔ ساکن محلہ شیخانہ قصبہ جائس۔ عمر تقریباً ۵۵ سال برا لکھنے بھی ہیں اور کہتے بھی ہیں۔ برہا اور شہیدی کہنے میں آپ کی شہرت دور دور ہے۔

نمونۂ کلام

آؤ مور بھیا بلیا لیوں میں کہن بی بی فاطمہؑ للنا
گودی سے ہمرے چلے جات ہو آج اسی سر جات ہو قربان للنا
تم بن حسین جئیں ہم کا نہ پڑے جائی تمری سوبج ماں اب جان للنا

(از بیاض قلمی مہر جائسی مرحوم)

۹۰ - سید کلب مصطفیٰ

سید کلب مصطفیٰ نام - جائس وطن - آپ نے ملک محمد جائسی کی سوانح عمری اور اُن کے کلام پر ناقدانہ تبصرہ کر کے اپنی کتاب "ملک محمد جائسی" شائع کی ہے۔ وہ کتاب انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کے سلسلہ مطبوعات نمبر ۱۶۹ پر شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کے اکثر مضامین رسالہ "نسیم" آگرہ میں بھی شائع ہوئے تھے۔ ہندی میں خوب کہتے ہیں۔ (از بیاض قاضی مہر جائسی مرحوم)

۹۱ - رسول احمد البودھ

آپ کے حالات اور کلام کچھ نہ مل سکا، صرف مختصر سا اشارہ رسالہ نگار لکھنؤ، جنوری ۱۹۳۶ء کے ہندی شاعری نمبر صفحہ ۱۶۷ پر اڈیٹر کے قلم سے ملا جو ثابت کرتا ہے کہ آپ ہندی کے مشہور شاعر ہیں۔

ملاحظہ ہو اڈیٹر کا نوٹ :-

"مجھے اس رسالہ کی ترتیب اور فراہمی مواد میں سب سے زیادہ مدد جناب رسول احمد صاحب سے ملی جو ادا کے بریلی کے رہنے والے اور ہندی میں البودھ تخلص کرتے ہیں - یہ کئی سال سے یہیں لکھنؤ میں مقیم ہیں اور ہندی رسائل میں تحریر و ادارہ کی خدمات انجام دیتے رہتے ہیں۔"

۹۲ - سُواامی مارہری

جناب اختر عادل زدپ نے سوامی جی کے حالات نہایت حسین اور دلکش انداز سے لکھ کر بھیجے ہیں۔ اُن ہی کے الفاظ میں سُنیئے :-

سوامی زندگی کے آئینے میں

آ ڈری سکھیو چل مل جائیں مارہرے میں لاگو میلا
آج اک سوامی درشن دیں گے پریم بٹے گا بھر بھر جھولا

سوامی درشن کو آیئے شاید آپ کو اس در سے کچھ مل جائے۔ لیکن ٹھہریے صاحب! اگر آپ یہ سوچ کر چل رہے ہیں کہ آپ کو وہاں بھگوان بھگتی ملے گی۔۔۔ اگر آپ کے ذہن میں کسی ایسے سوامی کا تصور ہے جو ماتھے پر تلک لگائے، گلے میں مالا پہنے، دھونی رمائے، جنتر منتر پڑھتے ہوں گے تو آپ بندرابن جائیے۔ مارہرے میں جو سوامی ہیں ۔ ۔ ۔ ان کا تو نام ہی سید سرور عالم ہے اور وہ ایک چھوڑ دو دو مسجدوں کے زیر سایہ خرابات سجائے بیٹھے ہیں اور جھولا بھر بھر پریم بانٹ رہے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ سوامی جی کے پاس اتنی افراط سے پریم کہاں سے آگیا۔ یہ ان کے ہاتھ کسی فقیر کی دعا سے نہیں لگا۔ اس کی جڑیں بہت دور تک تقریباً ساڑھے تین سو برس قبل کے زمانے تک گئی ہیں، جب ان کے جد امجد شاہ برکت اللہ صاحب بلگرام سے مارہرہ تشریف لائے تھے اور انھوں نے اپنی ہندی شاعری کے ذریعہ دنیا کو اس وقت انسانیت کا درس دیا تھا جب فارسی حکومت کی زبان تھی اور شاہان مغلیہ کا دور دورہ تھا۔ وہ ولی بھی تھے اور شاعر بھی۔ ان کے ارشادات کا مجموعہ "پیم پرکاش" اسی روشنی سے بھرپور ہے، جب مذہبی تعصب کی تاریکی میں انسانیت کا چراغ بن کر جگمگا رہی ہے۔ ان کے بعد شاہ عالم، پھر مقبول عالم اور پھر سوامی کے والد مرحوم سید افتخار عالم صاحب، سب نے اسے اپنایا، اور شعر و ادب کی خدمت کی۔ لیکن شاید ان کا یہ پیغام ہنوز ایک مخصوص طرز ادا کا تشنہ تھا، اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس کی تکمیل سوامی جی پر ہوتی ہے۔ سوامی جی ان معنوں میں شاہ برکت اللہ صاحب کی جگہ ہوئے ہیں۔ لیکن ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ شاہ صاحب ایک عظیم المرتبت مذہبی شخصیت تھے اور سوامی جی محض نام کے سوامی ہیں۔ وہ مسجد اور مندر دونوں کو

فرضی مقام سمجھتے ہیں۔ اور جب گھر کے بیروں سے خطاب کرتے ہیں تو ایسی کھری کھری
سُنا جاتے ہیں جن سے اُن کی سوامیت کی ساری قلعی کھل جاتی ہے۔ اس لئے آپ ان
منگل آنند کے نام سے فریب نہ کھایئے۔

سوامی جی منگل آنند بھی ہیں۔ وجہ تسمیہ اس نام کی یہ ہے کہ ۸ ستمبر ۱۸۹۴ء کو جب
یہ اپنے گھر میں آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بن کر آئے تو دن منگل کا تھا اور چونکہ پہلی
اولاد تھے، اس لئے آنند کا باعث تو ہوئے ہی۔ بچپن انھوں نے مکتب میں، جو اس زمانے
میں اپنی مخصوص علمی و تہذیبی روایات رکھتے تھے، گزارا۔ مولوی صاحب کے سایہ سے نکل کر
اسکول دیکھا اور وہیں جب ساتویں جماعت کے چھوٹے سے طالب علم تھے، مضمون نگاری
شروع کر دی۔ بچپن ہی سے بزرگوں جیسی سنجیدگی فطرت میں داخل تھی، اس لئے طالب علمانہ
شرارتوں سے اور کھیل کود سے دور بھاگتے رہے۔ جب ان کے ساتھی انھیں کھیل کے میدان
میں نہ پاتے ہوں گے تو کیا جانتے ہوں گے کہ وہ بڑوں کی مجلس میں ایک کونے میں خاموشی
سے بیٹھے ہوئے اُن کی علمی باتیں سُن رہے ہوں گے۔ اور مستقبل کا ایک شاعر اپنی ارتقا میں
اس طرح انہماک سے مصروف ہے۔ ان کے مضامین اسی زمانے سے چھپنا شروع ہو گئے
تھے۔ جنھیں دیکھ کر ان کے چچا نے لکھنے سے روکنے کی کوشش کی کہ کہیں ان کی یہ ادبی سرمستی
انھیں تعلیم سے غافل نہ کر دے۔ لیکن جو فطری جذبہ تھا وہ کہیں نہیں رُکا، وہ شعور کے ساتھ ساتھ
فروغ پاتا گیا اور آخر انتہا کو پہنچ کر اس نے انھیں سوامی بنا ہی ڈالا۔

آپ کے کلام کا مجموعہ "سوامی درشن" کے نام سے ۱۹۵۹ء میں زیورِ طبع سے آراستہ
ہو چکا ہے۔ اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کے دل میں درد ہے۔ سوز ہے
تڑپ ہے۔ بنی نوعِ انسان سے سچی محبت ہے۔ ہر شعر سے آپ کی بلند نظری۔ رواداری
انسانیت نوازی اور وسیع المشربی مترشح ہوتی ہے۔ پھر اس پر لطف یہ کہ جملہ اصنافِ سخن مثلاً
نظم۔ گیت۔ قطعہ۔ شعر۔ دوہا۔ پہیلی۔ چھند وغیرہ میں جولانیٔ طبع کے جوہر دکھائے ہیں۔
نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ؎

"مَن مالا"

مَن دھرم آتم مَن پرم آتم۔ مَن ہی سیتا مَن ہی رام
مَن ہی مورت مَن ہی پجاری۔ مَن ہی رادھا مَن ہی شیام
مَن ہی میں ہیں رام جھروکے۔ مَن ہی میں ہیں ٹھاکر دوارے
مَن کے بھیتر بھوت اُجیتے مَن کے شوالے گھپ اندھیارے

سپنا

سپنوں نے نت روپ ہیں دھارے دنیا ہے بھگوان کا سپنا
مسجد مندر سپنوں کے پھل سورگ نرک انسان کا سپنا
ہر سپنے میں اُلجھا سپنا اُتی اُلجھا ہر گیان کا سپنا
اُلجھی مت بھگوان نہ سلجھے جا سے بھلا نادان کا سپنا
کوئی رشی یاں کوئی مُنی ہے۔ کوئی رام پجاری ہے
کا ہو ہردے رام بسیں نا کہنے کو اوتاری ہے

ماں کی موت پر ایک شعر

ماں تجھی بھی وہیں تھا ساحل پر دُنیا کے سبھی انسان بھی تھے
پر ڈوبنے والا ڈوب گیا کہنے کو وہیں بھگوان بھی تھے

دوہے

نین روگ ابھیرن لاگو، ہردے لاگی پھانس
رووت بلکت نا بنی رے لاج کی لاگی پھانس

اگنی پوجیں بہتیر پوجیں۔ کوئی پوجے بیسر
سوامی پجاری تم کو پوجے، تم ہو سب کے بیتر

ماٹی کی اس کایا بھیتر بس ہیں کر کے پران
تم نے ہم کو منش بنایا آپ بنے بھگوان

اس کتاب کے آخر میں سوامی جی نے اپنا یوں بتایا ہے۔ ؎

سوامی ناؤں بچار کے جنم لیئو واگاؤں
رشیوں کا جو دیش ہے مارہرہ ہے ناؤں
واہی شبھ استھان ہیں سووت شاہ برکات
اسی پرواکی ڈار ہم چپکے چپکے پات
مور لگائیو گیان کوں لابھ بھیو بھرپور
سو وواب آنند سوں برسے چھپا یوں نور

۹۳۔ عمیق حنفی

عبدالعزیز حنفی نام عمیق تخلص۔ ۲۲ر نومبر ۱۹۲۸ء کو مہو چھاؤنی (مدھیہ پردیش) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دیواس میں حاصل کی۔ ۱۹۵۲ء میں ایم۔ اے (سیاسیات) اور ۱۹۵۴ء میں ایم۔ اے (تاریخ) علی الترتیب کرسچین کالج اور ہولکر کالج اندور سے پاس کیے۔ ۱۹۵۲ء میں شعر گوئی شروع کی ان کا کلام ہند و پاک کے مشہور ادبی رسالوں میں شائع ہونے لگا۔ اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ ۱۹۵۵ء میں ہندی نظموں کا ایک مختصر انتخاب "سانسوں کا گیت" اور ۱۹۵۸ء میں اردو کلام کا مجموعہ "سنگ پیراہن" شائع ہوا۔ موصوف نے شعر گوئی کے علاوہ ڈرامے بھی لکھے ہیں۔

دیواس۔ اندور۔ مہو اور آشٹہ میں مدرس رہنے کے بعد آل انڈیا ریڈیو کے اسٹاف میں ۱۹۵۶ء سے شامل ہیں۔ آج کل اندور میں پروگرام اگزیکیٹو کے عہدے پر فائز ہیں۔ نمونہ کلام ؎

خیال مالکوس

یہ تارے ہیں گگن پہ چمکیلے پھول ... ہیں وہی گگن پہ وہی پیاسی دھول

یہ خاموش سنگیت بے لفظ گیت — یہ دھرتی سے آکاش والوں کی پریت
یہ دانتوں سے دبتا ہوا نال پوس — یہ گمبھیر گت چھیڑتا مالکوس

(ماہ نامہ آج کل دہلی۔ اپریل ۱۹۵۷ء صفحہ ۴۴)

"ناگن"

کالی کالی لمبی زلفوں سے بھی لانبی رات — گھات کرے تو زلفوں والے بھی کھا جائیں مات
اس ناگن نے جسے ڈسا ہے اس پر ہے نشہ — میٹھے زہر کی مادک لہروں سے وہ جھوم اٹھا
کتنا دودھ پلایا لیکن یہ پیاسی پیاسی — اس ناگن کی پیاس تو یارو ہے بارہ ماسی

۹۴۔ فیاض خاں

آفتابِ موسیقی فیاض خاں کو قدرت نے بہ یک وقت کئی محاسن عطا فرمائے تھے صورت۔ سیرت۔ دولت۔ عزت۔ موسیقی اور شاعری جیسی نعمتوں سے مالامال تھے۔ ان کے فن کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ دھرپد۔ دھمار۔ استھائی۔ خیال۔ ترانہ۔ سرگم۔ ٹھمری۔ دادرا۔ غزل۔ سوز۔ سلام ان تمام اصناف موسیقی پر ان کو کامل عبور حاصل تھا۔ آفتاب موسیقی کا خطاب مہاراجہ میسور نے عطا کیا۔ اس کے علاوہ بہت سے خطابات اور میڈل کانفرنسوں سے ملے۔ سابق مہاراجا اندور نے ہزاروں روپے انعام دیے، اور ہیروں کا ہار عطا کیا۔ مرحوم نے تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپے کا سرمایہ چھوڑا کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔ نومبر ۱۹۵۰ء بمقام بڑودہ انتقال کیا۔ جس روڈ پر ان کا مکان تھا، بڑودہ میونسپلٹی نے اس روڈ کا نام فیاض خاں روڈ رکھ دیا ہے۔ فیاض خاں نے بہت سی چیزیں بھی بنائی ہیں۔ پریم پیا تخلص کرتے تھے۔ برج بھاشا کے خوش گو شاعر تھے۔ جے جے ونتی کی ایک چیز ملاحظہ ہو۔

"انترہ"

مورے مندر اب کو نہیں آئے — کا ایسی بھول بھئیں مو سے آلی
پریم پیا کو انکھیاں ترس گیئں گن سوتن برمائے۔..... مورے مندر

ان کے یوں تو بہت سے شاگرد ہیں. لیکن خاص خاص لوگ جو ہندوستان میں مشہور رہیں، یہ ہیں:۔

پنڈت ہری کرشن رتنجکر پرنسپل میوزک کالج لکھنؤ۔ دلیپ چندر ویدی۔ کندن لال سہگل۔ سوہن سنگھ۔ بھیشم دیو چیٹرجی۔ عطا حسین۔ بندے حسین خاں۔

(ماہنامہ آج کل دہلی کا موسیقی نمبر اگست ۱۹۵۶ء صفحہ ۶۲)

راگ برواہیں فیاض خاں کی چیز ہے:۔

استائی

باجے موری پائلیا کیسے کر آؤں تمرے پاس بنتوا

انترہ

ساس نند موری جنم کی بیرن چرچا کریں گی بیچ لگوا

(رسالہ شاعر بمبئی کا قومی یک جہتی نمبر ۱۹۷۴ء صفحہ ۲۲۸)

۹۵۔ تصدّق واسد

آگرے کی گائکی کو تقویت پہنچانے، آگے بڑھانے اور ہندوستان میں پھیلانے کے لئے آگرے کے ایک اور مشہور بزرگ تصدق حسین خاں ابن کلن خاں کا نام بھی تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ چالیس سال تک مہاراجہ بڑودہ کے ہاں ملازم رہے۔ پاکستان کے مشہور و معروف موسیقار اسعد علی خاں انھیں کے شاگرد رشید ہیں اور آج آگرے کی گائکی کو ہمسایہ ملک پاکستان میں عروج و عظمت عطا کر رہے ہیں۔

(ماہ نامہ آج کل دہلی کا موسیقی نمبر اگست ۱۹۵۶ء صفحہ ۶۲)

۹۶ شفق اکبرآبادی

آگرہ گھرانے کے موجودہ بزرگ جناب ولایت حسین خاں صاحب شفق اکبرآبادی جو نام ہندوستان میں مشہور ہیں نتھن خاں کے چوتھے صاحبزادے ہیں۔ ابتدائی تعلیم اپنے

دادا کے بھائی کلن خاں اور محمد بخش سے پائی، پھر کرامت خاں مرحوم سے دھرپد، دھمار سیکھا۔ اس کے بعد اپنے بڑے بھائی محمد خاں اور عبداللہ خاں سے تعلیم پائی۔ پندرہ سے بیس سال کی عمر تک فیاض خاں کے ساتھ ہندوستان کا دورہ کرتے رہے۔ پھر بمبئی میں مستقل قیام کر لیا۔ ۱۹۵۶ء میں آپ کی عمر ۶۲ سال تھی۔ مہاراجہ میسور کے ہاں پانچ سال ملازم رہے۔ اس کے علاوہ مہاراجہ کشمیر کی ملازمت بھی کی۔ یوراج کرن سنگھ کو موسیقی کی تعلیم دیتے تھے۔ آپ خوش گو شاعر بھی ہیں۔ آپ نے ایک نہایت جامع کتاب لکھی ہے جس میں زمانہ سلف سے موجودہ دور تک ہندوستان میں موسیقی کے جتنے خاندان گزرے ہیں یا موجود ہیں، ان کا حال نظم و نثر میں تحقیق و تفصیل سے موجود ہے۔ موسیقی کی شاعری میں پران پیا تخلص تھا، اور اردو میں شفق۔ بہادری لوڈی میں . . . . آپ کی چیز ملاحظہ ہو ؎

استھائی

ساجن کی سانوری صورت اب مورے من بھائیں آلی رے

انترہ

مرلی اُدھر دھر گوئیں ہیراوت پران پیا بنواری

(ماہنامہ آج کل دہلی کا موسیقی نمبر اگست ۱۹۵۶ء صفحہ ۶۲ و
ماہنامہ شاعر بمبئی کا قومی یک جہتی نمبر ۱۹۷۰ء صفحہ ۲۲۹)

۹۷۔ درس

محبوب خاں نام۔ درس تخلص۔ موسیقی کی شاعری میں درس پیا بھی تخلص لاتے تھے۔ یہ اترولی کے بزرگ تھے۔ آگرے والے ولایت حسین خاں ان کے سگے بھانجے تھے اور فیاض خاں آفتاب موسیقی کے خسر تھے۔ برج بھاشا کے بہت اچھے شاعر تھے، ان کی بنائی ہوئی چیزیں ہندوستان بھر میں گائی جاتی ہیں۔ ؎

استائی۔ ایک من آئیو ہے دانیہ آن تو سوں کہن کی بات

انترہ ۔ اَور کچھو ہوں جانت ناہیں درس پاؤں دن رات
انھیں کی ایک چیز راگ ودیسی ہیں ہے۔

استھائی ۔ او ڈن ڈن باجے وہ نُلاّ مراری مدھ ماتی کاندھے کمریا
انترہ ۔ دیپک کی جوت میں پرکاش واکی اُور دھونت دھونت باجے مُرلیا

(ماہنامہ شاعر بمبئی کا قومی یک جہتی نمبر ۱۹۷۴ء صفحہ ۲۲۷)

۹۸۔ حافظ علی خاں

ہندوستان کی حسین اور قدیم شاستریہ سنگیت کی کائنات ہیں اُستاد حافظ علی خاں بڑا اونچا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے پردادا غلام بندگی خاں جو بنگش قبیل سے تعلق رکھتے تھے گھوڑوں کی تجارت کے سلسلے میں ہندوستان آئے اور اپنے ساتھ سرود کی میٹھی تانیں بھی لیتے آئے۔ اُستاد حافظ علی خاں صحیح معنوں میں موسیقی کی سچّی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

(ماہ نامہ آج کل دہلی کا موسیقی نمبر اگست ۱۹۵۶ء صفحہ ۱۲)

۹۹ ۔ سنگیت سمراٹ اللہ دیئے خاں ۔ احمد

استاد اللہ دیے خاں صاحب اترولی ضلع علی گڑھ کے ایک مشہور خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے بزرگ مہاراجہ جودھ پور کی طلبی پر اترولی سے جودھ پور آگئے تھے۔ ۱۸۶۴ء میں آپ یہیں پیدا ہوئے۔ قرآن مجید کی تعلیم کے بعد آپ کو اُردو اور فارسی کی تعلیم دی گئی۔ آپ نے اپنے چچا بہاں گیر خاں صاحب سے موسیقی میں مہارتِ تامہ حاصل کی۔ یہاں آپ کے چھوٹے بھائی حیدر خاں بھی ہم سبق تھے۔ موسیقی کی تعلیم کے بعد آپ جے پور آکر نواب کلن خاں صاحب کے یہاں ملازم ہو گئے۔ پانچ سال جے پور میں رہ کر اپنے بھائی حیدر خاں اور چچیرے بھائی دولت خاں کو ساتھ لے کر علی گڑھ اور اترولی آئے۔ ایک سال یہاں رہے۔ پھر لکھنؤ، الہ آباد، پٹنہ اور بنارس میں گئی

سال گزارے۔ پھر کلکتہ ہوتے ہوئے جودھ پور آئے اور چھ مہینے مہاراجہ بڑودہ کے پاس رہ کر ۱۹۱۴ء میں بمبئی جا پہنچے۔ انھیں دنوں آپ کی شادی بڑودہ ہی میں ہوگئی بمبئی کے ارباب ذوق نے آپ کو خوب نوازا۔ اسی زمانے میں چھترپتی شاہو مہاراج والئی کولھاپور آپ کو اپنے دربار میں لے گئے۔ ۳۵ سال کولھاپور میں رہے۔ جب شاہو مہاراج سورگباش ہو گئے تو آپ بمبئی تشریف لے آئے اور آخر عمر تک یہیں رہے۔ ۱۹۴۶ء میں ۸۲ سال کی عمر میں وفات پائی۔

خاں صاحب کو ڈھائی ہزار سے زیادہ چیزیں یاد تھیں جن میں دھرپد، دھمار۔ استھائی۔ خیال۔ ترانے۔ ٹپے اور سرگمیں شامل ہیں۔ خاں صاحب گایک ہونے کے ساتھ ساتھ نایک بھی تھے۔ اپنی بنائی ہوئی چیزوں میں احمد تخلص ڈالتے تھے جو اُن کے پیرو مرشد کا نام تھا۔ سو برس کے عرصے میں اتنا بڑا فن کار موسیقی میں نہیں ہوا۔ ذیل میں ان کی بنائی ہوئی ایک چیز دیکھئے کہ ایک مسلمان ہندوازم کے عقیدے کو کس طرح پیش کرتا ہے۔ ۵

راگ مالی گورا۔ تین تال

استائی۔ ناد وید کو بنار و بھید۔ کیو گُرہ گُن گائیو اُن ہی پایو

انترہ۔ آد ناد تے اوم بھیو جب احمد اکشر وید کہا یو جن ہی تِن ہی لکایو

حسینی ٹوری میں خیال ہے

استائی۔ نرنکار کرتا دکھین کو دُکھ ہرتا ہرا اس کو آدھار نام نرنجن

انترہ تُوہی دھرم تُوہی کرم توہی دیا تُوہی مایا تیرو سمرن کرت رہت سنسار

آپ کا ایک سادھرا راگ مالکوس میں ہے۔

استائی۔ آد داتا انت ذیا ونت تُوہی جگت کرتا توہی نرا کار

انترہ۔ توہی جیو کام رُوپ من بدھی آتما بر ہما وشنو مہیش منی تیرو پایو نہ پار سنجائی ہیچ ہارے کوئی دایئے دیوتا سُر نر سکل جن سنسار

اُبھوگ۔ جیسے احمد ناد ساگر تیرے کو سرستی تھک رہی ہاتھ پسار

(۵ آجکل دہلی موسیقی نمبر اگست ۱۹۵۶ء صفحہ ۱۲۲ و ماہنامہ شاعر بمبئی موسیقی نمبر ۱۹۷۴ء صفحہ ۲۲۶/۲۲۷)

۱۰۰۔ عظمت حسین خاں ہیکش اکبرآبادی

مرحوم استاد عظمت حسین خاں ہیکش، خورجہ، آگرہ، اترولی گھرانوں کے آخری ستون تھے۔ وہ ۱۹۱۱ء میں اترولی ضلع علی گڑھ میں پیدا ہوئے تھے۔ اُن کی ننہال خورجہ ضلع بلند شہر تھی۔ ددھیال بزرگوں میں حسین خاں اور امام بخش اپنے وقت کے مسلم الثبوت استاد فن موسیقی تھے۔ ہیکش مرحوم نے موسیقی کی تعلیم اپنے ماموں حاجی الطاف حسین خاں اور اپنے تایا سنگیت سمراٹ استاد اللہ دئیے خاں سے حاصل کی تھی۔

آپ کے نانا ظہور خاں ممکن ایک بڑے موسیقار کے علاوہ سنسکرت زبان کے پنڈت، اور اُردو فارسی کے شاعر تھے۔ مرحوم فنِ موسیقی کے مسلم الثبوت اُستاد، گایک و نایک تھے۔ اُن کا فن آگرہ اور خورجہ گھرانوں کی گائیکی کا نچوڑ تھا۔ سالہاسال آل انڈیا ریڈیو کے شعبۂ موسیقی سے وابستہ رہے۔ ان کے شاگردوں میں کتنے ہی مشہور موسیقار ہیں۔ مرحوم موسیقی میں دل رنگ تخلّص کرتے تھے اور اُردو شاعری میں ہیکش تخلّص کرتے تھے۔ اُردو شاعری میں مے کش نہایت خوش فکر اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ ۱۹۳۵ء میں علامہ سیماب اکبرآبادی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوئے۔ خاندان سیماب سے مرحوم کا چالیس سال سے گہرا تعلق تھا۔

مورخہ ۲۶ جولائی ۱۹۷۵ء کو دن کے بارہ بجے بمبئی ہسپتال میں ملک کے اس مایۂ ناز موسیقار کا ۶۵ برس کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم کے پسماندگان میں ان کی بیوہ کے علاوہ چار لڑکے، اور چار لڑکیاں ہیں۔

آپ نے کافی استھائیاں اور خیال کہے ہیں۔ ان کی بنائی ہوئی چیزیں عام طور پر ہندو اور مسلمان گاتے ہیں۔ موسیقی کی شاعری میں آپ دل رنگ تخلّص کرتے تھے

نمونۂ کلام:۔

راگ دیوتا بھیرون

استھائی:۔ جا بیرے کا گوا پیا کے دلس بیتیاں موری دیکھو جائے

انترہ ۔ برسن بیتے سدھ ناہیں لینی دل رنگ کون دیس بسائے

راگ چند جوگ

استائی ۔ ہٹیلی کہا مانت ناہیں تو دس رہی بن بات

انترہ ۔ چنچل چپل چیتر البیلی دل رنگ پودون پر اترات

راگ پوریا دھنا شری

استائی ۔ کاہے گمان کرے باورے یا جگ میں جگ نہیں ایک سمان

انترہ ۔ گرب کی بات سے مان گھٹے دل رنگ جائے و دیا گیان

(ماہنامہ شاعر بمبئی کا قومی یک جہتی نمبر ۱۹۷۴ء صفحہ ۲۲۳ و ۲۲۸)

۱۰۱۔ ظہور خاں رام داس

ظہور خاں صاحب سیکش اکبر آبادی کے سگے نانا تھے۔ خورجہ کے رہنے والے تھے۔ موسیقی میں رامداس تخلص کرتے تھے۔ آپ سنسکرت کے پنڈت۔ ہندی کے شاستری اور اردو فارسی کے منتہی تھے۔ موسیقی کے عالم ہونے کے ساتھ اردو فارسی کے صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ ممکن تخلص کرتے تھے۔ آپ تان رس کے بھتیجے تھے نمونہ کلام:

درباری راگ :۔ راگ جھنکارہ میں خیال ہے

استائی ۔ ہے جہاں ج نیک ہمری اور بدھاتا

انترہ ۔ جگت پتا تم ایسی کرپا کرو جیسے پتر پر ماتا

راگ مالکوس میں ایک ہوی دیکھئے

استائی ۔ اے ہو تم کاہے ڈورت ہو موہن کنجن میں سنگ لیے برج بال

انترہ ۔ ایکن پر تم رنگ ڈارت ہو ایکن پر ابیر گلال

(ماہنامہ شاعر بمبئی کا قومی یک جہتی نمبر ۱۹۷۴ء

صفحہ ۲۲۷)

۱۰۲- ابراہیم خاں

ابراہیم خاں کا قیام ریاست بوندی میں تھا اور نواب صاحب ٹونک کے یہاں ملازم تھے۔ راگ باگیسری میں ان کا خیال ملاحظہ ہو ۔

استائی ۔ سکھی من لاگے ناگون جتن جیا مانت ناہیں بہت سمجھائے رہی
انترہ ۔ ناجانو بالم ملیں کب مئین کو ابراہیم پیا پریت کئے پچھتائے رہی

(ماہنامہ شاعر بمبئی کا قومی یک جہتی نمبر ۱۹۷۴ء صفحہ ۲۲۸)

۱۰۳- اُستاد حاجی الطاف حسین خاں

یہ بزرگ جناب مسکین اکبر آبادی مرحوم کے ماموں تھے۔ ظہور خاں صاحب رام داس کے لڑکے تھے۔ ۱۹۶۰ء میں ہندوستان کے صدر شری راجندر پرشاد جی نے ان کو خلعت سے نوازا تھا۔ ان کا ایک خیال راگ پور یا دھناشری میں دیکھیے ۔

استائی ۔ موری مشکل کرو آسان خواجہ معین الدین اجمیری داتا
انترہ ۔ جگت دیس میں نام تہارو مکت بہت چرنن کی آشا

(ماہنامہ شاعر بمبئی کا قومی یک جہتی نمبر ۱۹۷۴ء صفحہ ۲۲۸)

۱۰۴- نواب شبیر نقوی نصیر آبادی

نواب شبیر نقوی نام۔ نواب تخلص۔ نصیر آباد ضلع رائے بریلی وطن ۔ ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے۔ بلحاظ تعلیم اردو میں "اعلیٰ قابل"، فارسی میں خارجی مطالعہ۔ ہندی میں مڈل۔ ذریعہ معاش معلمی ہے۔ محکمہ تعلیم میں ایک اسکول کے صدر مدرس ہیں۔ اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ شاعری کی ابتدا ۱۹۳۰ء سے ہوئی۔

آپ زیادہ تر مذہبی اور قومی نظمیں۔ نوحے اور سلام وغیرہ لکھتے ہیں۔ نمونہ

کلام ہندی ۵

نوحہ (اردو)

کن نگری ماں جائے بسیو، آؤ مورے پاس
مُکھ کا کہہ پر چھانڑ گئے، میں کہہ کی راکھوں آس
ٹھاڑے ٹھاڑے باٹ نہاروں، اب تم گھر ماں آؤ
درشن کو تو رے ترست ہوں بٹیا جلدی رُش دکھاؤ
دھرتی تپت ہے کربل بن کی جا پے موا لال
سیس کٹائے ہائے پڑا ہے رکت ماں اپنے لال
دِنا کٹت ہے مو رے اکبر نینن نیر بہائے
رَین کٹت ہے مو نہہ دُکھیا کی تارے گن گن ہائے

رر

کربل ماں نبی کے نواسے کی جان جات رہی پر بات رہی
پاپی کی نہ بیعت کی شہ نے بپتا کی ندی اُمڈات رہی
تلواروں کے جھنکاروں ماں اور تیرن کے بوچھاروں ماں
وہ دھرم کا پاٹھ پڑھائے گیو تب دھرم ماں اُسکی یات رہی
کیسے تھے ادھرمی کربل کے جن کو نہ تھا دھیان شریعت کا
پیاسا رہا کنبہ محمدؐ کا سنگھ ندیا لہرات رہی
سنسار میں لے نواب کہو اب کس کا ڈنکا بجتا ہے
بجتی کربل ماں کون رہیو اور دھرم ماں کس کی بات رہی

۱۰۵۔ ظفر کپور

ظفر محمد خاں نام۔ ظفر کپور کے نام سے مشہور ہیں۔ تاریخ ولادت ۲۰ / اپریل ۱۹۳۷ء تعلیم انٹرمیڈیٹ۔ والد صاحب کا نام محمود خاں۔ ذریعہ معاش ملازمت

وطن علی گڑھ (یو۔پی) جائے ولادت باجی نگر (مدھیہ پردیش)، نمونہ کلام ؎

اُس بڑی چٹان تک میں بہہ رہا تھا ساتھ تیرے
بٹ گئے وہ دھارے اب شُوپن تیرے اور میرے
آج میں دیتا ودا ہوں

پھول کی شکمارتا پر کنج کی آشا جھلکتی
گبندھ ملیانل لئے جو چاندنی تن سے مہکتی
آج میں دیتا ودا ہوں

چاند چلتا ہوں میں اور چاندنی چپ چاپ ہے
کون جانے کون سا ابھی شاپ ہے ...
رات جاگا اَن گنت پر آج کیسی رات ہے
شُونیہ میں ڈوبا ہوا ہوں اجنبی سی بات ہے
نبند گہری نیند، جیسے موت جگ پر چھا گئی
کون جانے کون سا سنتاپ ہے ...

میں کسی گتی روہ کو جھکتا نہیں   میں کسی انورادھ پر رکتا نہیں
عیام کے ہر سورگ کو ٹھکرا دیا   زندگی کے درد کو اپنا لیا ...
میں تمھاری بانہہ یوں گہتا نہیں

۱۰۶۔ قانت جائسی

قانت صاحب نے اپنے حالات خود لکھ کر عطا فرمائے۔ اس صیغہ واحد متکلم میں درج کئے جاتے ہیں۔

محمد خلیل احمد نام۔ قانت تخلص۔ دموہ وطن۔ ولادت ماہ ستمبر ۱۹۱۲ء میں

بمقام دموہ (سی۔پی) ہوئی۔ والد کا نام عبد الشکور ٹھیکیدار۔ دموہ سے بسلسلہ کاروبار جائس آ گئے۔ تعلیم اُردو۔ ہندی۔ انگریزی۔ فارسی اور عربی میں حاصل کی۔ آرام بچپن سے آج تک نصیب نہیں ہوا۔ ہمیشہ مصائب کا مقابلہ رہا۔ ۱۹۲۸ء میں شاعری کا شوق پیدا ہوا، اور بزم قصرالادب قائم کی۔ باقاعدہ مشاعرے ہونے لگے۔ ۱۹۴۵ء میں محترم حافظ حاجی محدث حضرت نسیم سجادہ نشین خانقاہ شریف سلون ضلع رائے بریلی کی غلامی کا شرف حاصل کیا۔ کچھ فرائض باقی ہیں۔ سیر دُنیا سے جی بھر چکا ہے۔ دو بھجن لکھ کر ارسال کر رہا ہوں۔ ۵

سوچ سمجھ کے کرنی کرے　　کاہے من پچھتائے پاچھے
تا کی ویسی بھرنی بھرے　　جیسا کرے سو پائے

پاچھے کاہے من پچھتائے

بھول گیا سب اپنے وعدے　　چھوڑ دیے سب سانچے ناطے
مانیں ناہیں جب منائے　　پاچھے کاہے من پچھتائے

کاہے من پچھتائے پاچھے

ست وچن اور بات نبا کی　　سیوا تا پر یاد خدا کی
قانت رب کو پائے　　پاچھے کاہے من پچھتائے

کاہے من پچھتائے پاچھے

سنور یا ہیر دھمری اور

صبح بیتی شام بھی کب — رین آدھی بیت گئی اب — ہو نہ جائے بھور

سنور یا ہیر دھمری اور

رین اندھیری کٹھن ہے — بگڑا ہوا سب جگ کا چلن ہے — پگ پگ لاگت چور

سنور یا ہیر دھمری اور

خاک کا پنجرہ جب تک ڈولے سو اس کا پنچھی ہر ہر بولے باندھو الیسی ڈور
سنوریا بسیرو ہمری اور

۱۰۷۔ سائل حیدری مینائی گوالیاری

حضرت سائل حیدری مینائی گوالیاری ۱۱ شوال یوم جمعہ قبل صبح صادق ۱۳۱۰ھ بمقام لشکر گوالیار پیدا ہوئے۔ آپ نجیب الطرفین سادات ہیں۔ نسبی اعتبار سے آپ کی نانہال حسنی اور دادہال حسینی ہے آپ کی ۳۷ ویں پشت جناب مولیٰ علی مرتضیٰ رض سے ملتی ہے اس لئے آپ حیدری بھی ہیں اور ہاشمی بھی۔ قضیات۔ خواجگی ادر پیری مریدی حضرت سائل کے خاندان میں ودیعت ہوتی چلی آرہی ہے۔ ساتھ ہی فن سپاہ گری میں بھی کمال حاصل ہے۔ فوجی پابندیوں اور مصروفیتوں کے باوجود دوران ملازمت میں ادبی مشاغل جاری رہے۔ آپ کا نام میر عنایت علی، تخلص سائل والد ماجد کا نام سید علی حسن حیدری کیپٹن ایم۔ وی۔ او۔ آپ عرب۔ کابل۔ قندھار، اس کے بعد قائم گنج ضلع فرخ آباد میں رہے۔

نواب محمد خاں صاحب بنگش بانیٔ فرخ آباد نے آپ کے بزرگوں کے دست حق پرست بیعت قبول کر کے ۱۷ مواضع بطور نذرانہ مرشدی عطا کیے۔ مہاراجہ گوالیار نے آپ کے بزرگوں کے شجاعانہ اوصاف سن کر دعوت دی اور با اعزاز گوالیار بلا کر مشیر خاص بنا کر اپنی مصاحبت میں رکھا۔

اوائل عمر ہی میں سائل صاحب اپنی گفتگو میں مقفیٰ جملے استعمال کرتے تھے۔ گانا اور قوالی وغیرہ سننے کا بھی شوق تھا۔ ۱۹۰۷ء میں شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا۔ ۱۹۱۲ء میں حضرت مضطر خیر آبادی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ چونکہ مضطر صاحب امیر مینائی کے شاگرد تھے، اس لئے سائل صاحب اپنے آپ کو شاعرانہ تعلق کی بنا پر مینائی لکھتے ہیں۔ اردو کے علاوہ ہندی میں بھی آپ نے طبع آزمائی کی ہے۔ ہندی میں بھجن۔ خیال۔ ٹھمری۔ دادرا ہولی۔ رسیا۔ چوما سے۔ جھولے۔ پد۔ کنڈلیا

دوہے۔ بسنت۔ گیت اور رہنڈوے وغیرہ کہے ہیں۔ نمونہ کلام ؎

"بھون سنسار کا سوجی میلا"

آیا پانی کا اک ریلا جس نے بہا دیا سب بیلا

بوڑھے بہ گئے، بالک بہ گئے۔ بہ گئے سکھی سہیلا

راجہ۔ پرجا دووؔ مل بہ گئے پڑ گیا عجب جھمیلا

آیا پانی کا اک ریلا جس نے بہا دیا سب بیلا

پاپی بہہ گئے۔ پُنی بہہ گئے۔ کرم نے سب کو پیلا

سادھو سنت سبھی مل بہ گئے۔ گرو بچا نہ چیلا

آیا پانی کا اک ریلا ....

رین دنا کس کس سے روئے دُکھ سائل ببیلا

پریم نگر یا سونی ہو گئی، مجنوں رہا نہ لیلا

آیا پانی کا اک ریلا جس نے بہا دیا سب بیلا

ہولی

سنو جی میں تو رنگ تم پہ ڈاروں گی سیاں

چھانڈو چھانڈو جی موری کلیاں

سنو جی میں تو رنگ تم پہ ڈاروں گی سیاں

گلال لگاؤں گی چندر سے مکھ پر روپ نہ بگڑے گو تمرو۔ کیسر کی ماروں گی پچکاری

پکڑو نہ تم موری بیاں

سنو جی میں تو رنگ تم پہ ڈاروں گی سیاں

بھجن

تو کو کب نوں میں سمجھاؤں او من مورکھ بھج لے رام

دیکھ تُمرے ہیں یا کے پھندے۔ چھوڑ دے سب سنسار کے دھندے۔ بھول جا سب آرام

تو کو کب نوں میں سمجھاوں ....

سائل جوگی مثل سنائے۔ گیا وقت کب لوٹ کے آئے۔ جپ لے سہل ہر نام
توکو کب نوں میں سمجھاؤں ادمن مورکھ بھج لے رام

۱۰۸۔ سید فدا حسین۔ فدا ایپا لکھنوی

آپ نے اپنے حالات ۱۳ کو اپنے ہی قلم سے لکھ کر عطا فرمائے ہیں، جو درج ذیل ہیں:۔

میرا جدی سلسلہ میر اکبر الدولہ بہادر نگران اوقاف شاہی واجد علی شاہ مرحوم آخری شاہ اودھ سے ملتا ہے، اور مادری سلسلہ میر واجد علی مرحوم تعلق دار اہما مئو (اودھ) سے ملتا ہے۔

مکان پر کلام پاک اور معمولی کتابیں پڑھوانے کے بعد اسکول میں نام لکھوا دیا گیا۔ پھر میٹرک پاس کرنے کے بعد ہی سینٹری انسپکٹر کی ٹریننگ میں منتخب ہو گیا۔ اس کے پاس کر لینے کے بعد لکھنؤ میونسپلٹی میں ملازمت حاصل ہو گئی۔ پھر ۱۹۴۵ء میں گانا بھی باقاعدہ اسکول میں داخلہ لے کر سیکھا۔ گانے سے فارغ ہو کر ۱۹۴۹ء میں چیف سینٹری انسپکٹر کے امتحان میں داخلہ لیا اور اس کو پاس کرنے کے بعد ۱۹۵۱ء میں چیف سینٹری انسپکٹر کی جگہ پر تقرری ہو گئی جو آج تک قائم ہے۔ ۱۹۵۴ء میں پرائیویٹ طور پر ایف۔ اے۔ ۱۹۵۶ء میں بی۔ اے اور ۱۹۵۸ء میں ایم۔ اے پاس کیا۔ اب یہ خیال گزرا کہ پی۔ ایچ۔ ڈی کیوں رہ جائے۔ لہٰذا میں آج کل اس کی تیاری میں لگا ہوا ہوں۔ آئندہ اللہ کو اختیار ہے۔ اس کے علاوہ دیگر علوم و فنون کے استادوں کی خدمت کا بھی مجھے فخر حاصل ہے مثلاً پیراکی، سید اکبر علی صاحب پرنسپل شیعہ ڈگری کالج سے حاصل کی۔ ران سواری اور منہ زور گھوڑوں کے زیر کرنے کے طریقے جناب لڈن صاحب مرحوم چابک سوار سے حاصل کئے۔ پھر لکڑی۔ بانک بنوٹ۔ کا علم جناب ابو صاحب مرحوم سے سیکھا۔

نمونہ کلام

درسس دو موکا کنور کنہیا ۔ بیچ بھنور موری پریم کی نیّا
فدا پیا جگ ساگر ما ۔ ڈھونڈھوں کرشن دینک کھویا

ہولی

نند کے چھیلا کھیلت ہولی ۔ سنگھ ہیں سکھیاں بھولی بھولی
ابیر، گلال ۔ کیسر، سب رنگ ۔ ہاتھ ماڈُار بے اک اک جھولی
اِک کا چھیڑت اک کا بھجوت ۔ کا ہو کی انگیا کا ہو کی چولی
فدا پیا بھی اُن کے سنگ ہیں ۔ ایسی موہنی اُن کی ٹولی

ایک گوپی کا بروگ

جمنا جل میں بھرن نہ جاؤں ۔ کیسو موہنی صورت بھلاؤں
مانو سکھی کرشن ہے ٹھاڑو ۔ پنگھوٹ گگری جب لے جاؤں
جمنا کنارے روؤں میں گردھر ۔ جل تھل نینن نیر بہاؤں
فدا پیا میں تو شیام بنا
بین بن پانی اُس مر جاؤں

۱۰۹ - تصوّر گوالیاری

آپ نے اپنے حالات مورخہ ۴ ۲ رمئی ۱۹۶۰ء کو عطا فرمائے، جو درج ذیل ہیں :-

نام سیّد ممتاز علی ۔ بی ۔ اے ۔ ایل ۔ ایل ۔ بی ۔ تصوّر تخلّص ۔ ہندی شاعری میں سیّد کوی تخلص ۔ ولادت ، ۷ ر جولائی ۱۹۱۷ء کو ہوئی ۔ وکٹوریہ کالج گوالیار میں تعلیم حاصل کی ۔ دورانِ تعلیم میں میری دوسری زبان ہندی رہی ۔ اُردو میری مادری زبان ہے ۔ والد صاحب کا نام سیّد امتیاز علی ، فرنج ایڈوکیٹ ۔ ان کی صحبت سے

مجھے شاعری کا شوق ہوا۔ کالج کے مشاعروں میں شرکت کی۔ پھر بڑے بڑے انڈو پاک مشاعروں میں بھی بلایا جانے لگا۔ میں نے اپنی شاعری میں فلسفۂ حیات و موت۔ انسانی ہمدردی اور حب الوطنی کا خاص خیال رکھا۔ نمونہ کے لئے دوہے ملاحظہ ہوں ۔

سُونے سُونے دِن پھرے آئی رسیلی رین
رس میں ڈوبے بول ہیں، رس میں ڈوبے بین

کجرارے نین تلے کاجل پھیلو جائے
جھیلن سے ندیا سے جیون اندھیاری چھائے

کچھو نہیں نیکو لگے تیر س یہ مدھو ماس
جانے کاہے اُن بنا منوا رہے اُداس

اُن کے نینن سی کیسے پیت دیا کی آس
مو کہ من بھونرے نہیں ان پھولن میں باس

دانی کا دھن کام کو نگر نگر گن گائے
مایا جوڑی سُوم کی دھرتی میں رہ جائے

پورا دیش کٹمب ہے بھائی سب کچھ جان
بھارت ماں کے پتر ہیں سب جن ایک سمان

کبا برنوں کیا ہوت ہے، اُن کا روپ نکھائے
کو مد کو مد جیوتی سی آنکھن میں بھر جائے

---

۱۱۰ ۔ راجہ مہدی علی خاں

راجہ مہدی علی خاں نام۔ آپ کی ولادت ۱۹۱۷ء میں بمقام کرم آباد متصل وزیر آباد ضلع گجرانوالہ (پنجاب) میں ہوئی۔ آپ پنجاب کے مشہور ادب نواز خاندان کے برگزیدہ فرد ہیں۔ مولانا ظفر علی خاں مرحوم ایڈیٹر اخبار "زمیندار" اور حامد علی خاں ایڈیٹر "ہمایوں" کے بھانجے ہیں۔ والدہ کا نام "ح۔ ب" جو ہندوستان کی مشہور شاعرہ ہیں

اسلامیہ کالج لاہور سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد اخبار نویسی کا پیشہ اختیار کیا۔ مولانا عبدالمجید سالک ایڈیٹر "انقلاب" نے جب پھول اور تہذیب نسواں سے الگ ہو کر انقلاب نکالا تو یہ اُن کی جگہ پر اخبار پھول اور تہذیب نسواں کو ایڈیٹ کرتے رہے، پھر اخبار "خیام" اور رسالہ "عالمگیر" کو ایڈیٹ کرنے لگے۔ جب ان کی شہرت کا آفتاب بلندی پر تھا، انھوں نے ادب کی دنیا چھوڑ کر آل انڈیا ریڈیو دہلی کی ملازمت اختیار کی۔ کچھ عرصے کے بعد فوج میں چلے گئے۔ تقسیم وطن سے پہلے ملک کے مشہور افسانہ نگار سعادت حسن منٹو نے انھیں بمبئی بلا لیا۔ یہاں وہ فلموں کے گیت لکھتے رہے اور تادم آخر یہیں رہے۔ اُردو اور ہندی میں شعر کہتے رہے۔ نمونۂ کلام :-

بسنت رُت کیوں آئی

میرے پیا تو بسیں پردیس رے ہائے بسنت رُت کیوں آئی
اور پون نہ کرے اٹکھیلیاں میرے دل کی کلی مرجھائی
پیا پیا پپیہا گاتا ہے دل غم میں ڈوبا جاتا ہے
پرانوں کو لگے ہے بھئیں رے ہائے بسنت رُت کیوں آئی

"ہمیں چھوڑ پیا کس دیس گئے"

سو جتن سے پریت لگائی تھی یہ دنیا سورگ بنائی تھی
کیوں پریت لگانا یاد رہا کیوں پریت نبھانا بھول گئے
ہمیں چھوڑ پیا کس دیس گئے

"سُندر سپنا"

کیوں کاری بدریا چھائی ہے کیوں کلی کلی مسکائی ہے
میری پریم کہانی ختم ہوئی میرے جیون کا سنگیت گیا
میرا سُندر سپنا بیت گیا

---

۱۱۱ ۔ کاشف ہاشمی اُجینی

ولایت علی نام ۔ کاشف تخلص ۔ وطن اُجین (مدھیہ پردیش) محلہ مرزا واڑی ۔ تاریخ ولادت ۔ ۱۵ نومبر ۱۹۲۳ء تعلیم میٹرک ۔ فارسی اور انگریزی میں بھی دست رس حاصل ہے ۔ پیشہ معلمی ۔ ہندی شاعری کا ذوق قدرت نے آپ کی طبیعت میں ودیعت کر رکھا تھا ۔ صحبت شعراسے وہ اور بھی چمک اُٹھا اور آپ کے ہندی گیت اکثر موقر رسالوں میں چھپنے لگے ۔ گیتوں کے علاوہ فارسی اور انگریزی نظموں کا ترجمہ بھی ہندی نظم میں پیش کرنے کا شوق ہے ۔ نمونہ کلام ۔

سجنی مہندی گھول رہی ہے
امواکی ڈالی پر بیٹھی کوئل کوکو بول رہی ہے
چندن کے ریشے ریشے میں گھا خوشبو گھول رہی ہے
شرمیلی کلیوں کے گھونگھٹ چنچل پُروا کھول رہی ہے
تاروں کی سندر بستی میں سجنی تنہا ڈول رہی ہے
پی درشن کی آس لگائے سجنی مہندی گھول رہی ہے

"بچوں کا گیت"

مات پتا کی آنکھ کے تارے گوُردجن کی آشا ہم ہی ہیں
دھن والوں کی اس بستی میں نردھن کی آشا ہم ہی ہیں
بچے ہیں یہ سچ ہے لیکن لوگوں کی آشا ہم ہی ہیں
مانوتا سے پیار کریں گے ، شکشا کا پرچار کریں گے
ہم ننھے منے بچے ہی دُنیا کا اُدھار کریں گے

۱۱۲ ۔ سلطان احمد صدیقی اُجینی

سلطان احمد نام ۔ سلطان تخلص ۔ وطن اُجین (مدھیہ پردیش) ولادت ۱۹۲۰ء میں

بمقام علی گڑھ ہوئی۔ ۱۹۴۷ء تک آپ نے ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی تک تعلیم حاصل کی سولہ برس کی عمر میں یہ رنگیلا سلطان اُردو میں شعر کہنے لگا۔ آپ کے نانا حافظ عبدالرحیم رحیم بھی شاعر تھے اور ماموں بشیر علوی اور ظہیر علوی بھی شاعر۔ اس ادبی صحبت نے سلطان پر گہرا اثر ڈالا اور شعر گوئی میں خوب ترقی ملی۔ آخر اُردو کے ساتھ ساتھ ہندی میں بھی کہنے لگے۔ نمونۂ کلام ؎

سجنی تم بن جگ اندھیارا

گہرا ساگر دُور کنارا	ڈوب رہا ہے پریت کا مارا
دو آنچل کا تم ہی سہارا	سجنی تم بن جگ اندھیارا
شیام گھٹائیں آتی سیانی	جیون میرا پانی پانی
تم بن روٹھ گیا اُجیارا	سجنی تم بن۔۔۔۔۔

"جاگ رے ہندوستان"

اس رشی منیوں کی دھرتی پر بلہاری بھگوان

خود کو تو پہچان رے بھائی خود کو تو پہچان

بھول نہ اپنا گان جاگ رے ہندوستان

گیت

دُور دیش سے پریتم آئے	سندر سرس سندیشہ لائے
اُن بن رہا نہ جائے	سکھی ری سامنے کیسے جائے

۱۱۳۔ ضمیرالقادری

ضمیر القادری نام۔ اُردو میں ضمیر اور ہندی میں نیلے تخلّص۔ ولادت۔ ۲۴ر دسمبر ۱۹۳۴ء میں بمقام اجین (مدھیہ پردیش) ہوئی۔ شاعری کا جذبہ فطرتاً موجود تھا اس لئے بچپن ہی سے اس طرف رجحان ہو گیا۔ ان کے اسلاف سلطانپور

(یو۔ پی) کے رہنے والے تھے جو بعد میں اجین آکر آباد ہو گئے تھے۔ ان کے دادا محمد حسن مرحوم اُجین میں مجسٹریٹ رہ چکے تھے اور والد بدرالحسن "ظہیر" اجین میں تحصیلدار تھے۔ ظہیر بھی شاعر تھے اس لئے آپ کا ذوقِ سخن اور بھی چمک اٹھا۔ اُردو اور ہندی دونوں میں شعر کہنے لگے اور خوب نام پیدا کیا۔ ہندی میں ہر رنگ اور ہر صنف میں ان کا کلام ملتا ہے۔

نمونۂ کلام ؎

گیت

تمھیں رات بھر مسکرانا پڑے گا	اندھیرے میں دیپک جلانا پڑے گا
میں کیسے مناؤں دیوالی اجالی	تمھیں ہو دیوالی، تمھیں دیپ ڈالی
تمھیں مکھ سے گھونگھٹ ہٹانا پڑیگا	اندھیرے میں دیپک جلانا پڑے گا
کنھیا ہوں میں تم مری بانسری ہو	اُدھر سے لگا لو بھلی یا بری ہو
تمھیں کچھ مدھر آج گانا پڑے گا	اندھیرے میں ....

جاگ اُٹھا انسان

طوفانوں میں باندھا پالا	اور تمر میں کیا اُجالا
مُردہ تھل میں انگڑایا جیون	کرنے آئے ساگر منتھن
دُکھ کی خاطر کرتے آئے ہم سکھ کا سامان	جاگ اُٹھا انسان
سرسوتی نے گیان جگایا	کُٹیا میں اب ناچے مایا
ہر دُشمن کو گلے لگایا	مل کر گیت امن کا گایا
آزادی کی پچھلی منزل کٹی بہت آسان	جاگ اُٹھا انسان

۱۱۴۔ عنایت احمد۔ اسیم

عنایت احمد نام۔ اسیم تخلص۔ آپ کی ولادت ۱۹۲۹ء میں بمقام اُجین ہوئی۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ شاعری کا جذبہ وہبی ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار

نہیں کیا جا سکتا کہ عوارض و شدائد زمانہ انسانی دل پر گہرا اثر ڈال کر اس کو ہی جذبہ کو اُجاگر کر دیتے ہیں۔ یہی حال اسیمؔ صاحب پر طاری ہوا، اور اس کا دل درد و اثر اور سوز و گداز کا مخزن بن گیا۔ نمونہ کلام۔ ؎

کاہے ہوئے ناراج .... بے دردی

سُونا ہے سنگھاسن من کا۔ دیش اجڑتا ہے برہن کا۔ آ کے سنبھالو راج

کاہے ہوئے ناراج .... بے دردی

ہے اسیمؔ اتی پریت کی سیما۔ درد اُٹھائے دھیما دھیما۔ لاج رکھو موری لاج

کاہے ہوئے ناراج .... بے دردی

"اے چمیلی کی کلی"

میں نے مانا کہ یہ بھنورے تیرے من بھاتے ہیں

رس کے لوبھی ہیں یہ رس پیتے ہی اُڑ جاتے ہیں

تُو نہ سمجھی کہ کیا چال ہے بھنوروں نے چلی

اے چمیلی کی کلی ....

تجھ سے آ آ کے پون آنکھ مچولی کھیلے

برکھا آ کر تیرے انگ انگ سے ہولی کھیلے

تیری تقدیر بھی سکھ سوپن کے سانچے میں ڈھلی

اے چمیلی کی کلی ....

۱۱۵۔ عبداللہ عرف گھسّو خاں

جناب منزل لوہا ٹھیری نے آپ کے حالات عطا فرمائے جو درج ذیل ہیں:۔

گھسّو خاں بلحاظ ہندی شاعر ایک نام ور ہستی گذرے ہیں ؎

عبداللہ ہے نام ہمارو گھسّو خاں ہے بانی

غزلن میں فسرہ یاد لکھو ہے آگے رام کہانی

جیسا کہ مذکورہ بالا شعر سے ظاہر ہے، ان کا نام عبداللہ تھا او رگھستو خاں عرف عام انھوں نے عرفِ عام ہی کو آپ نام (تخلص) فرمایا ہے۔ یہ گورامئی ضلع بدایوں کے رہنے والے تھے۔ ان کی صحیح تاریخِ ولادت نہ مل سکی۔ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ ۱۸۲۷ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے تھے اور ۱۹۰۹ء ان کی صحیح تاریخ وفات ہے۔ یہ یہاں کے مشہور ہندی شعرا میں گنے جاتے تھے۔

گورامئی۔ لوہا ٹھیر وغیرہ پرانے زمانے ہی سے ادب نواز ہستیوں کو جنم دیتے رہے ہیں۔ چناں چہ ان ہر دو گاؤں میں آج بھی کافی تعداد میں شعر کہنے والے موجود ہیں۔ گھستو خاں نے دو کتابیں چھپوائیں اور کئی نسخے قلمی چھوڑے جو ان کی ناخلف اولاد نے برباد کر دیے اور آج اُن کا سوائے نام کے ایک ورق بھی دستیاب نہیں۔ "گلدستۂ فریاد" حصہ اول اور دوم میرے سامنے ہیں اور میں ان میں سے تھوڑا سا اقتباس پیش کر رہا ہوں۔ تعلیمی حالت ان کی بلند تھی۔ چناں چہ اسی گلدستہ اول میں فارسی کے اشعار بھی بارہ ماسوں کی ٹیک بنا کر استعمال کئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے یہ شاعر اُردو۔ فارسی اور ہندی تینوں زبانوں پر دسترس رکھتا تھا، مگر خاص طور پر ہندی کا ماہر تھا۔ نمونۂ کلام ۔ ے

بارہ ماسہ (لوند کا مہینہ)

کیا مجھے لوند ماہ نے شاد ۔۔۔ پیا بارہ ماہ کے آئے بعد
سکھی گھستو خاں ہے فریاد ۔۔۔ رہیا و بیر ہین کے برباد
گورامئی گھر خاص ہے جیون اندر سبھا گاؤں
جب تک رہیو پرتھوی تب تک رہیو ناؤں

اٹھوارا

ہیں تیرہ نین ۔ سجن آدھین ۔ نپٹ من ہین
جیسے جل بن مین چلے مجھ پر آرا
کہوں رو دت رو دت باتاں سکھی اٹھوارا

ٹھمری

سجن بن دھمڑکے کرے بجھوا مور

تھم تھم ہوک اٹھت جیرا میں ۔ بیا ملت کیوں نور ۔ سجن بن دھمڑکے کرے بجھوا مور
ظلم کیا پیا گھسوخاں ۔ بھیاں گئے مجبور سجن بن ....

بھجن

اودھو جی کرم لکھی سو ئی سہنا

بنی بات کا کیا ہے سراہن کیا بگڑی کا کہنا
دنیا کے اس ایچ پیچ سے بھلا نرک کا رہنا
بگڑی میں کی کا کو بھیا آکے کا کی بہنا
گو را مئی کے گھسوخاں من سوچ سمجھ کے رہنا

۱۱۶ ۔ سید جمیل الدین عالی

آپ کا خط ہو بہو نقل کیا جاتا ہے جس سے چند دیگر ہندی گو شعراء پر بھی روشنی پڑتی ہے ۔

کراچی
۶۰-۵-۲۰

جناب رتن صاحب !

آداب و نیاز ۔ آپ کا پوسٹ کارڈ مورخہ بارہ اکتوبر ۱۹۵۹ء حرزجان بنائے ہوئے گزشتہ چند ماہ میں، میں نے کئی ہزار میل کا سفر کیا۔ اور اتنا مسلسل اور بے یقین پروگرام رہا کہ آپ کے عنایت نامے کا جواب تحریر نہ ہو سکا، جس کے لئے سکون دماغ کی ضرورت تھی۔ اب میں یہ سمجھ لوں کہ معذرت ہوئی تو آگے چلوں ۔ دوہوں کے لئے تو میں اپنی کتاب بھیجتا ہوں خود ملاحظہ کر لیجئے ۔ یہ کتاب الگ ڈاک سے پہنچے گی۔ حالات یہ ہیں :۔

میں لوہارو کا رہنے والا ہوں۔ دلی میں بلا ثبوت ۱۹۲۶ء میں پیدا ہوا ننھیال

سے خواجہ میر درد کا نواسہ اور ددھیال سے نواب علاء الدین خاں علائی کے بڑے فرزند سرا امیر الدین خاں کا پانچواں بیٹا ہوں۔ عربک کالج (حال دہلی کالج) سے بی اے کیا۔ اور ۱۹۴۷ء میں پاکستان آگیا۔ اب صدر مملکت کے ذاتی سکریٹریٹ میں افسر بکار خاص ہوں۔ دوہے کہتے چودہ برس گزرے یہاں بہت دن اکیلا رہا۔ اب کافی احباب دوہے کہتے ہیں۔ دو تین کے پتے یاد ہیں۔ آپ چاہیں تو انھیں اس پتے پر لکھیے:۔

۱۔ فلائٹ لفٹننٹ مظفر علی سیّد۔ ایجوکیشن برانچ۔ ایر فورس۔ رسالپور
۲۔ ارشد کاکوی۔ مدیر ماہنامہ ندیم۔ ۳۰ پرانا پلٹن۔ ڈھاکہ نمبر ۲
۳۔ "تاج سعید معرفت ضیا احمد فراز۔ ریڈیو پاکستان۔ پشاور
۴۔ نگار صہبائی معرفت آغا شاعر۔ ریڈیو پاکستان۔ کراچی

یہ بھاشا کے اچھے شعرا ہیں۔ کبھی کبھی یاد فرماتے رہا کیجیے۔ آپ کی تحریر سے جی خوش ہوتا ہے۔ آداب و نیاز۔

جمیل الدین عالی۔

نمونۂ کلام ۵ دوہے

ایک تو یہ گھنگھور گھٹا پھر برکھا کی مار
بوند پڑے ہے بدن پہ ایسے جیسے لگے کٹار

ساجن ہم سے ملے بھی لیکن ایسے ملے کہ ہائے
جیسے سوکھے کھیت سے بادل بن برسے اڑ جائے

گھنی گھنی یہ پلکیں تیری یہ گرماتا روپ
تو ہی بتلا او نارنگھی کو چھاؤں کہوں یا دھوپ

کدھر ہیں وہ متوارے نیناں کدھر وہ رخسار
نس نس کھنچے ہے تن کی جیسے ستار کے تار

اک اک تال کھرج ہے من کو اک اک سر ہے پیاس
اک اک سُر کی بدن جلائے جیسے آگ پہ گھاس

اگنی سی ہے رینی دینں میں نس نس دُکھ سے چُور　　عالی ہم پر جیون کا جو وار پڑا بھرپور

ندیں بھی ہے حال وہی جو ندی کے اُوپر جال　　مچھلی بچ کر جائے کہاں جب جل ہی ہے جنجال

روٹی جس کی بھینی خوشبو ہے ہزاروں راگ　　نہیں ملے تو تن جل جائے ملے تو جیون آگ

جنم مرن کا ساتھ تھا جن کا اُنھیں بھی ہم سے بیر
واپس لے چل اب تو عالی ہو گئی جگ کی سیر

۱۱۷۔ تاج سعید

ابھی ابھی ناظرین کی نظر سے جناب جمیل الدین عالی کا خط گزرا۔ خط میں انھوں نے فرمایا کہ پاکستان میں سید مظفر علی۔ ارشد کاکوی۔ تاج سعید اور نگار صہبائی ہندی بھاشا کے اچھے شاعر ہیں۔ اُن کے حکم کے حسب حال مندرجہ بالا حضرات کی خدمت میں خط پیش کیے گئے۔ لیکن کچھ شاعرانہ تساہل، کچھ ماحول کی برہمی ہنوز جواب سے محروم رہا۔ اچانک اپنے ایک دوست سے تاج سعید صاحب کے دو ہندی گیت دستیاب ہو گئے، جو اختصار کے ساتھ نمونتہً ہدیۂ ناظرین ہیں ؎

دیوی پوجا کرنے آئی

مکھڑے پر ہے لاج کی لالی　　ہاتھوں میں پھولوں کی تھالی
رام نام کی لیلا نیاری　　جس نے شدھ بسرائی

دیوی پوجا.........

دھیرے دھیرے بھجن وہ گائے　　نینوں سے جل بہتا جائے
بڑے سمے سے مکتی پانے　　ٹوٹے من کو لائی..... دیوی پوجا...

پریم کے رس میں ڈوبی رادھا آئی تیرے دوار

درس کی پیاسی آئی رادھا — لے کے نئے جیون کی آس
تو ہی پربھو مجھے دیدے شکتی — دیدے پریم اگر کی باس
تو ہی پربھو، تو ہی داتا — تو ہی کھیون ہار
تیرے گن گاتی ہوئی رادھا آئی تیرے دوار

۱۱۸۔ نیاز جاوید

جناب خورشید احمد نے ان کے حالات عطا فرمائے جو درج ذیل ہیں:-
نام عمر نیاز جاوید۔ ولادت (۵ مئی ۱۹۳۵ء) کاروبار (ادبی مرکز پرکاشن گرہ اور فلم ایجنسی)۔ تعلیم (مڈل تک)۔ پتہ: (کھو کھنیٹ۔ مدھیہ پردیش)۔
ہندی کے موجودہ نوجوان مسلم کویوں میں نیاز جاوید اپنا الگ مقام رکھتے ہیں۔ آپ کے والد وقار واثقی اردو کے مشہور شاعر اور رہبی تعلیمی تصنیف و تالیف کے صدر ہیں اور راند ور ریڈیو اسٹیشن میں اردو حصہ کے ڈائرکٹر رہ چکے ہیں جس طرح والد اردو ادب میں شہرت رکھتے ہیں اسی طرح بیٹا ہندی میں شہرت حاصل کر رہا ہے۔ نمونۂ کلام ؎

ماں سرسوتی کی ارچنا میں

ماں! تجھ کو میں پوج رہا ہوں
شیش رہیں گی جب تک سانسیں
لین رہوں گا آرادھنا میں
ہیں تیرا اسّتر تو ہیں

چھوٹا سا سیوک۔ اور بھکاری۔۔۔۔ ماں
ایسا بردان مجھے دے۔ میں کیوں تیرے مندر میں
ایسا گیت سناؤں۔ جو دل کی ہر دھڑکن کی لے میں

اُدھت ہوئیگ میں چھا جائے
میں مر جاؤں
لیکن میرا گیت
جگت کو
جنیوں بانٹے
سورج بن اندھیارا چھانٹے

۱۱۹۔ امیر اُجینی

ولادت (۱۹۱۰ء) تعلیم (اُردو۔ ہندی۔ فارسی۔ عربی)۔

پتہ۔ (امیر اُجینی۔ محلہ طوائفان۔ اُجین۔ مدھیہ پردیش)۔

یہ پُرانے رنگ کے مشہور ہندی کوی ہیں۔ بمبئی۔ بڑودہ۔ احمد آباد۔ آگرہ جودت اور بھوپال وغیرہ شہروں کے مشاعروں میں شریک ہوتے رہتے ہیں۔ علاوہ ازیں مہاراجہ بڑودہ۔ جھالاوار نرنسیں۔ دیواس مہاراج وغیرہ راجاؤں کے درباروں میں بھی اچھی عزت حاصل کر چکے ہیں۔ شاعری کے ساتھ ساتھ مغنی بھی ہیں۔ ان کو بچپن ہی سے شاعری کا شوق ہو گیا تھا۔ جوانی کے عالم میں عشق نے شاعری کو اور چمکا دیا۔ دادرا۔ ٹھمری۔ خیال وغیرہ خوب کہتے ہیں۔

خیال راگنی کنڑہ

پار کرو میری نیّا — مَن کے میت کنہیا
منجدھار ہیں ادھاٹارے — تُم بِن کون کھویّا
من میں آگ لگی برہا کی — تُم جمنا کے پار بسیّا

مکتک

سینے سے گنپتی کو لگائے ہوئے ہیں ہم — شنکر کو اپنے من میں بسائے ہوئے ہیں ہم
کارن یہی ہے آج بھی آزاد ہیں امیرؔ — بھارت میں ایک جیوتی جگائے ہوئے ہیں ہم

۱۲۰۔ منزل لوہا ٹھیری

جمیل الدین نام۔ منزل تخلّص۔ تاریخ ولادت ۱۲ جولائی ۱۹۳۱ء۔ وطن لوہا ٹھیر ضلع بدایوں۔ ہائی اسکول گوراسئی ضلع بدایوں میں ہیڈ ماسٹر ہیں۔ والد کا نام مولوی مسیح الدین ہے۔ تعلیم ہندی۔ اردو منشی ادیب۔ ایچ۔ ٹی۔ سی۔ اردو اور ہندی دونوں میں شعر کہتے ہیں۔ کہانی بھی لکھتے ہیں۔ بنی نوع انسان سے ہمدردی۔ غریبوں سے مروّت۔ وطن سے محبت ان کا شیوہ ہے۔ ان کا ہندی کلام بڑا رسیلا۔ سلیس اور پُر اثر ہے۔ نمونۂ کلام:

ہولی

مانو تا نے آنکھ نہ کھولی

بیت گئی اب کے بھی ہولی

اب کے بھی لگوں گے بدلے   اُچھلے ہیں کیچڑ کے چھینٹے

اب کے بھی سوکھے ہونٹوں پر   گان نہ آئے میٹھے میٹھے

کہنے کو گاتی پھرتی ہے ٹولی   مانو تا نے......

بساکھی

ناچی دھرتی رانی

کیسے اچھے دن آئے ہیں بھاگی ہر دی گرمی

تت پر ہوئے سب کام ہیں اپنے دھرمی اور ادھرمی

پھر میرے ہونٹوں پر اُبھری تازہ ایک کہانی

کھلیانوں کی مالا پہنے ناچی دھرتی.. ...

دوہے

مانجھی بے پیسہ لیے کرے نہیں ہے پار   پیسہ ساتھی یا جگت میں سب مطلب کے یار

جیون ایسا کھیل ہے گر پگ جائیں مات   کوئی بھی ساتھی نہیں جب بات بھرا تا تات

جس پر بیتی ہووے سو ہی گت جانے تس کی — بات ربھرا تا بات سناؤں کس کو کس کی

۱۲۱ ۔ دلکش لوہا ٹھیری

علاء الدین قادری نام ۔ دلکش تخلص ۔ لوہا ٹھیر ۔ ضلع بدایوں (یو ۔ پی) وطن ۔ تاریخ ولادت ۳؍ جنوری ۱۹۴۶ء ۔ والد کا نام مولانا شمس الدین شمس قادری ۔ دس سال کی عمر ہی سے ہندی شاعری شروع کر دی ۔ روز بروز شوق بڑھتا گیا ۔ اسی وجہ سے میٹرک کی تعلیم سے آگے نہ بڑھ سکے ۔ ان کی ہندی شاعری ان کے تخلص کی طرح ٹری دلکش ، شیریں سلیس اور پُر اثر ہے ۔ نمونہ کلام ؎

سُندر پھول

اُگتا ہے نو جیون لے کر — کتنا پیارا کتنا سُندر
چھوٹے چھوٹے پتے لے کر — ننھی ننھی کونپل دے کر
کتنا پیارا کتنا سُندر

رَوی کرنوں کو اُر میں سینتا — دھرتی سے اَن جل لے لے کر
ننھا سا پودا بن لیتا — دھیرے دھیرے ، بڑھتے بڑھتے
کتنا پیارا کتنا سُندر

اُف ری مست جوانی

بچپن کے جو کشٹ تھے جھیلے — مات پتا کی گود میں کھیلے
دیکھے سب دُنیا کے میلے — دھیرے دھیرے ہولے ہولے
اُف ری مست جوانی

جن سے پائی ودّیا مایا — بچپن میں کچھ گورو بنائے
دُور پرورتی کو دُور بھگا کر — پریم دیا کا پاٹھ پڑھا کر
اُف ری مست جوانی

۱۲۲۔ حضور سہسوانی

آپ اُردو کے مشہور شاعر راز احسنی سہسوانی کے فرزند ارجمند ہیں۔ سہسوان ضلع بدایوں میں یکم جنوری ۱۹۳۹ء کو پیدا ہوئے طالب علمی ہی کے زمانے میں شعر گوئی شروع کر دی۔ جوش ملسیانی اور راز احسنی سے اصلاح لیتے رہے۔ اُردو کے علاوہ ہندی میں بھی شعر کہتے ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو ؎

آ بھی جاؤ تم بن ساجن	سونا ہے من وا کا آنگن
بوندیں تیر سے برساتی ہیں	ڈسنے لگا ہے مجھ کو ساون
جیسے مینہ برسائیں بادل	نیر بہاتی ہوں میں برہن
کھوج میں تیری گھر کو چھوڑا	ماری پھرتی ہوں میں بن بن

۱۲۳۔ خورشید اچھے

خورشید نام اور اچھے تخلص۔ اِس طرح خورشید اچھے کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ کی ولادت ۵ ؍ دسمبر ۱۹۳۵ء میں اجین کے ایک برگزیدہ خاندان میں ہوئی۔ آپ کے والد صاحب ہاکی کے مشہور کھلاڑی اور پہلوان تھے، اس لئے خورشید صاحب کو بھی ورزش کا شوق تھا۔ اکھاڑے میں جایا کرتے تھے۔ ۲۹ ؍ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو آپ کے والد کا انتقال ہو گیا۔ سارے گھر کا بوجھ سر پر آپڑا۔ اس لئے معلمی کے علاوہ صبح کو اخبار بیچتے۔ شام کو ٹائپ سکھاتے۔ رات کو سنیما کی مشین چلاتے۔ آپ کے والد صاحب پہلے اجین میں بہ عہدہ ڈاکٹری ملازم تھے۔ پھر تبادلہ (مدھیہ پردیش) تبدیل ہوگئے۔ اور خورشید صاحب بھی ساتھ آگئے۔ ہندی میں وشارد اور انگریزی میں میٹرکنک تعلیم حاصل کی۔ اس کے علاوہ اُردو اور مالوی بھی پڑھی بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا۔ ہمدردی اور ایثار آپ کا خاص شیوہ ہے۔ چناں چہ آپ نے اجین اور بھوپال کے بیشتر ہندی گو شعرا کے حالات عطا فرما کر راقم الحروف کو ممنون کرم فرمایا۔ متعدد کتب تصنیف کر چکے ہیں مثلاً جلتے آنسو

آکاش کسم۔ صبح کے تارے۔ دھرتی کے تارے۔ نئے چراغ ہندی گیتوں کے مجموعے ہیں اور رخون پسینہ۔ اُتھان تین ہندی کی عام کویتا کے مجموعے ہیں۔ بھیڑیا۔ آٹے کا پتلا۔ لنگوٹی شاہ کا دربار۔ شیروانی کا بھوت کہانیوں کے مجموعے ہیں۔ آپ کے کلام میں انسانی ہمدردی مزدوروں اور غریبوں کے لئے تڑپ اور درد موجود ہے۔

نمونۂ کلام

تم وناش کا رنگ نہیں ڈالو
مجھ پر زمانوں کی ہریالی ہے
ماٹی کا پتلا پاہن سے لڑ جاتا
دھرتی کا بیٹا چندر پر چڑھ آتا
یہ مانا میں بے چارا۔ بھوکا۔ ننگا
پر اک دن اٹھاؤں گا آکاش گنگا
ہیں شرم کے رنگ ہیں خون نہیں گنتا
کیوں پانی کا مان کیا کرتا
اب تک کتنا ہو گیا خون پانی
شرم کے پانی میں کتنی لالی ہے

تم وناش کا رنگ نہیں ڈالو

ہیں دوار کھلائے آدن گا جس دن
قدم قدم کا تھال سنجو کر لے آنا
میں چلتا ہوں جب مستی میں گاتا
ہر درد زمانے بھر کا بسرا تا
تب لگی کے دوار جھرو کے سے
پونو کا سُندر چاند نکل آتا

کانگریس سندیش

اُڑا ہے امن پتا کا ویر جواہر لال
باپو کے اس مہا دیش میں کھیلو رنگ گلال

میگھ دوت نے اُڑا گگن میں امن کا کالی داس تھا

شور داس کے طنبورے میں مدھوبن کا بھوماس تھا

بھوشن کی ہنکاروں میں آزادی کا اُلاس تھا

پریم چند کی بانی میں بھی جن من کو وشواس تھا

وہ مذہب کے بھید بھاؤ کو توڑا سنت کبیرا نے
امر پریت میں ہالا ہل پی ڈالا متواری میرا نے
موہن جو دڑوں کے انتر میں گورو ششیش وشال
اُڑا رہا ہے امن پتا کا ویرہ جواہر لال

۱۲۴۔ اکرام ساگری

اکرام اللہ خاں نام۔ اکرام تخلص۔ قصبہ ساگر (مدھیہ پردیش)، وطن۔ اس واسطے اکرام ساگری کے نام سے مشہور ہیں۔ مورخہ ۱۴ فروری ۱۹۲۴ء کو بمقام ساگر (مدھیہ پردیش) پیدا ہوئے۔ انگریزی میں انٹرمیڈیٹ اور ہندی میں ساہتیہ رتن تک تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۴۴ء سے ہندی ادب و شعر میں حصہ لینا شروع کیا۔ آپ ہندی نظم و نثر دونوں میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ آپ کا انداز بیان بال کرشن بھٹ سے ملتا ہے۔ آپ کی ہندی نظموں کا مجموعہ "ستیہ کے آدھار" ۱۹۵۵ء میں منظر عام پر آچکا ہے۔ نمونہ کلام ؎

گیت

جل چکے ارمان ساتھی جل چکے ارمان
پر نہ پگھلے ایک کشن کو یہ نٹھر پاکھان
کٹ چکا ہے ہائے موتی رہ گئی ہے سیپ
ہو چکی ہے دھیمی باتی بجھ رہا ہے دیپ
اور پھر تم کھیرنے کو ہو رہا گتی وان
جل چکے ارمان ساتھی جل چکے ارمان

//

کسی کا پیار پاکر ہنس نہ پائی رو نہ پائی
پیار کے ارمان بن کر جب اُدھر پر گان آئے
بھر گیا یہ کنٹھ سکھ سے اور آنسو مسکرائے

میں چکت سی رہ گئی بس بیخودی میں کھو پائی
کسی کا پیار پا کر ہنس نہ پائی رو نہ پائی

۱۲۵۔ فرمان گگرالوی

آپ کی ولادت مورخہ ۴ر جنوری ۱۹۴۰ء میں بمقام گکرالہ ضلع بدایوں (یو۔پی) میں ہوئی۔ ہندی۔ اُردو مڈل کرنے کے بعد ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا اور ایف اے کی تیاری شروع کر دی۔ امتحان قریب آپہنچا تو زندگی میں ایک خاص تبدیلی رونما ہوئی، جس سے شاعری کا ذوق تو نکھر گیا لیکن زندگی کا شیرازہ بکھر گیا۔ امتحان ادھورا رہ گیا۔ اس کے بعد ٹریننگ سرٹیفیکیٹ حاصل کر کے سرکاری اسکول میں انگریزی کے ٹیچر لگ گئے۔ آپ اُردو اور ہندی دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں، اور دونوں سے بڑا اُنس رکھتے ہیں۔ آپ نے اپنے حالات تو عطا فرمائے، لیکن نہ اپنا نام لکھا، نہ اپنے والد صاحب کا۔ نمونہ کلام ؎

بلیدان اس بھارت ماتا پر

یہ پاون بھومی ہے رشیوں کی — گوتم گاندھی سے سنتوں کی
یہ بھارت ماتا دیووں کی — جننی یہ تینوں لوکوں کی

بلیدان اس بھارت ماتا پر

وہ ویش رتن رانا یودھا — وہ شوا چھترپتی بیر والا
وہ ویر لکشمی سی ابلا — ان سب کا تو سندیش یہ تھا

بلیدان اس بھارت ماتا پر

کوئل تیرے گیت مدھر ہیں — میرے گیتوں جیسے
بالکل میرے گیتوں جیسے — ما نوتا کی ریتوں جیسے
سندر من کے میتوں جیسے — کومل مردو سپنوں جیسے

کوئل تیرے.... بالکل میرے......

۱۲۶۔ چمن اٹاوی

مرزا انور بیگ نام۔ چمن تخلص۔ ولادت ۱۹۲۵ء میں بمقام لکھنا، ضلع اٹاوہ ہوئی۔ اُردو۔ ہندی۔ انگریزی اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔ ہندی اور اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ ذریعہ معاش تجارت ہے۔ آج کل محلہ پوستی خانہ۔ اٹاوہ (اترپردیش) میں مقیم ہیں۔ آپ کی دو کتابیں بہارِ چمن اور ربیدان منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ نمونۂ کلام ؎

وشو کو شانتی کا سندیش

توپیں۔ ٹینک۔ رائفلیں۔ مگ یان بنا سکتے ہو
سارے جگ کو اک کشن میں شمشان بنا سکتے ہو
چاؤ۔ جانسن میکملن۔ کوسی جن اتنا بتلاؤ
تم انسان مٹا تو سکتے ہو، انسان بنا سکتے ہو؟

اِس دُنیا میں دین جنوں کے کام اگر انسان آئے
پھر کس مُنہ سے وہ اس دھرتی ماتا کی سنتان کہلائے
کتنا وہ نِردئی پُرش ہے، کتنا وہ نادان چمنؔ ہے
جو پرتھوی پر مانو بن کر مانوتا کا خون بہائے

مکتک

کسی نے بڑھ کر نیل گگن کے تارے پائے
اور کسی نے ہر ہستہ پر دھتکارے پائے
ہم نے جن کو پھول دیے انگارے پائے
آج دیا کے دیالو بڑے ہتیارے پائے

○

۱۲۷۔ سلطان بھاما

آپ کی ولادت مدھیہ پردیش کے ایک قصبہ "ترانہ" میں ۲، مارچ ۱۹۲۸ء کو ایک معزز جاگیردار گھرانے میں ہوئی۔ مقامی اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ بچپن ہی میں آپ کے اندر بزرگوں کا ادب۔ ملک و قوم کی محبت جلوہ گر تھی۔ اسی جذبہ کے زیر اثر آپ نے کانگریس کی بے لاگ خدمت کی۔ بچپن ہی سے آپ کو فطری طور پر شعر و شاعری کا شوق ہوگیا۔ ہندی اور مالوی دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ مشاعرے میں نہایت دلکش آواز اور مترنم انداز سے پڑھتے ہیں۔ ریڈیو کے پروگرام بھی ملتے رہتے ہیں۔ آپ ہندی ادب کی تن من سے خدمت کر رہے ہیں۔ نمونہ کلام ؎

باغ لگاؤ

لگا سکو تو باغ لگاؤ آگ لگانا مت سیکھو

جگا سکو تو پریت جگاؤ بیر جگانا مت سیکھو

بہا سکو تو سویت بہاؤ رکت بہانا مت سیکھو

چلا سکو تو ناؤ چلاؤ تیر چلانا مت سیکھو

بنا سکو تو نیڑھ بناؤ کینھ بنانا مت سیکھو

بچھا سکو تو پھول بچھاؤ شول بچھانا مت سیکھو

پلا سکو تو امی پلاؤ گرل پلانا مت سیکھو

سُنا سکو تو گیت سُناؤ رُدن سُنانا مت سیکھو

ایک مالوی گیت "ڈھیرا گیرو رے بیل گاڑی کے"

ریشم کی تھبنری پڑی پڑی جاوے ڈھولوا ٹڑی نے ہمارے ماتھا پہ آکرے

مہارا نیناں میں کنکرا بھرائے رے ہٹیلا ذرا ڈھیرا گیرو رے ۔ ۔ ۔ ۔

۱۲۸۔ تاج قائم خانی

آپ کا نام گ۔ خ اور تاج تخلّص ہے "تاج قائم خانی کے نام سے مشہور ہیں۔ میرپور خاص (پاکستان) وطن ہے۔ ہندی میں گیت کہتے ہیں۔ ہندی سے خاص اُنس رکھتے ہیں۔ آپ کے کلام میں انسانی ہمدردی بدرجہ اتم ہے۔ نمونہ کلام ؎

کیا یہ تیری مانوتا ہے

رکھشا کرنے نربلوں کی — تجھے بنایا تھا بل شالی
پر تو اُن کا خون چوس کر — بھرتا ہے نج سوارتھ پیالی
بل سے ابھی راہ بناتا — تو نے نندت راہ بنالی
روند رہا ہے کمزوروں کو — زور نہیں یہ نردینا ہے

کیا یہ تیری مانوتا ہے

"رات بھر یہ کون رویا"

بیل بوٹے پھول گیلے — پیڑ پتے شول گیلے
آنسوؤں سے آج کس نے — پرکرتی کا آنچل بھگویا

رات بھر یہ کون رویا

اس جگت میں دین لاکھوں — پھر رہے مکھ ملین لاکھوں
شول ہائے سبکے ہرے ہیں — سوارتھ وش جگ نے چھبویا

رات یہ کون رویا

۱۲۹۔ مولانا ماہر القادری

آپ نے ۲ر جولائی ۱۹۵۹ء میں اپنے حالات وکلام ہندی اور تصویر عطا فرمائی جو حاضر ہے۔

نام، منظور حسین تخلص ماہر، سال ولادت ۱۹۰۷ء جائے ولادت قصبہ کسیر کلاں ضلع بلند شہر (یو۔ پی) اردو، انگریزی، فارسی اور عربی کی تعلیم پائی۔ ہندی بھی سیکھی۔ پندرہ سال کے لگ بھگ حیدر آباد دکن میں قیام رہا۔ وہاں کے وزیر اعظم مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر نے قدردانی فرمائی۔ ۔ ۔ ۔ کچھ دنوں بچوں کے رسالے "غنچہ بجنور" کی ایڈیٹری بھی کی۔ ۱۹۳۲ء میں عراق کا سفر کیا۔ ۱۹۵۲ء میں حجاز کی زیارت کی۔ چند مہینے فلمی دنیا سے بھی تعلق رہا۔ کئی فلموں میں گانے مقبول ہوئے، مگر اس فضا کو خلافِ طبیعت پاکر کنارہ کشی کرلی تقسیم ہند کے بعد سے کراچی میں قیام ہے۔ رسالہ "فاراں" کی ایڈیٹری کا بار سنبھالے ہوئے ہیں۔ اب تک نثر و نظم کی بائیس کتابیں چھپ چکی ہیں

نمونۂ کلام

من کی باتیں بول ۔ ۔ ۔ ۔ من کی باتیں بول

ڈوب گئے آکاش کے تارے　　نیند سے جاگے پنچھی سارے

پھوٹ بہے کرنوں کے دھارے　　ایک ہم ہیں برہا کے مارے

دل ہے ڈانوا ڈول ۔ ۔ پپیہے من کی باتیں بول

برکھا رُت کا رُوپ نرالا　　اُجلی پھواریں، بادل کالا

بجلی کا کوندا متوالا　　ٹوٹ گئی بوندوں کی مالا

تو بھی موتی رول ۔ ۔ ۔ ۔ پپیہے ۔ ۔ ۔ من کی باتیں بول

گیت

کیسی موجیں کیا منجدھار　　اب کے نیّا آر کہ پار

جتنے دیکھے دُنیا دار　　تن چنگا اور من بیمار

مورکھ ہے وہ پاپی ہے　　فرض کو سمجھے جو بیگار

یہ بھی زمانہ دیکھ لیا　　چور بنے ہیں چوکیدار

۱۳۰ - حضرت سید ڈھنگ شاہ صاحب علیہ الرحمۃ

جناب سائل گوالیاری نے ۲۵ ستمبر ۱۹۵۹ء کو آپ کے حالات عطا فرمائے جو ہدیۂ قارئین ہیں:-

حضرت سید ڈھنگ شاہ صاحب اہل و عیال والے ہونے کے باوجود ایک بہت بزرگِ کامل تھے۔ لشکر گوالیار سے جنوب کی جانب سون ریکھا ندی کے کنارے ایک قبرستان میں چھوٹی سی گپھا بنا کر اس میں رہتے تھے۔ گپھا کی ایک کھڑکی گپھا سے لگے ہوئے ایک اندھے کنوئیں کی طرف تھی۔ جب پانی کی ضرورت ہوتی اس کھڑکی کی طرف ہاتھ بڑھا کر اسی کنوئیں سے پانی بھر لیا کرتے تھے۔ آپ بڑے صاحبِ کشف و کرامات درویش تھے تسبیح ہر وقت پڑھتے رہتے تھے۔ آپ کی درگاہ ہنومان بندھ کے پاس اب بھی موجود ہے۔ ۱۸۳۹ء میں پیدا ہوئے۔ اسّی سال عبادتِ خداوندی اور خدمتِ مخلوق بجا لا کر ۱۹۱۹ء میں پردہ فرمایا۔ آپ ہندی کے بہت بلند پایہ شاعر تھے۔ آپ کے پاس ایک مرتبہ ایک نوجوان تنو مند سادھو قسم کی لنگوٹی لگائے ہوئے، ہاتھ میں ڈیڑھ ہاتھ کا ایک موٹا ڈنڈا لئے پہاڑ کی طرف سے دوڑتا ہوا آیا اور للکار کر بولا:

"اگر درویش ہے تو بتا بھگوان کون ہے اور کہاں ہے۔ ورنہ اس ڈنڈے سے ابھی تیرا سر پھاڑ ڈالوں گا!"

لڑکے کی اس ناشائستہ حرکت پہ مشتعل ہو کر متحرک ہوئے۔ آپ نے ہنس کر سب کو ہاتھ اور آنکھ کے اشارے سے روک دیا اور خود کھڑے ہو کر فی البدیہہ بخندہ پیشانی نہایت خوش الحانی کے ساتھ یہ ہندی کوتا سنائی:-

سنو پاسیدہ سروپ سیاپت آگر نہیں آپ سمایو
یا بدھ روگی مدبہ شامت سیہ دو رنگ جمایو
مدھ بیتل پربت کو دا کھا اور جل بچھمن شترو گھن بجھایو
دوان ورن لال منو نتا سید ڈھنگ نہیں آپ سمایو

یہ کہنا سنتے ہی اس لڑکے نے جھک کر آپ کے پاؤں پکڑے اور جدھر سے آیا تھا اُدھر ہی واپس چلا گیا۔

۱۳۱۔ حضرت عین اللہ شاہ المتخلص بہ عینؔ رحمۃ اللہ علیہ

قلعہ گوالیار ایک بہت بڑا تاریخی قلعہ ہے جس کی فصیل کے نیچے پہاڑ کاٹ کر اس کے اندر ایک گپھا بنائی گئی تھی۔ حضرت عین اللہ شاہ قدس سرہٗ العزیز اس گپھا میں رہا کرتے تھے۔ چنانچہ وصال کے بعد حضرت کو اسی گپھا میں سپرد زمین کر کے آپ کا مزار بنا دیا گیا۔ حضرت شاہ صاحب بہت بڑے بزرگ کامل تھے۔ بلا قید مذہب و ملت جملہ مخلوق خدا آپ کو مانتی تھی۔ ایک مرتبہ گوالیار کے مہاراجہ جیواجی راؤ سندھے صاحب نے آپ کے لئے ایک گھوڑا اور دو شالہ بھیجا لیکن آپ نے قبول نہ کرتے ہوئے فی البدیہہ یہ کنڈلی کہہ کر اس کنڈلی کے ساتھ واپس کر دیا ؎

سادھو کو کیا چاہیے سنبھی دیا بھگوان — کپڑے خاک مسان کے کند موں پھل کھان
کند مول پھل کھان ندی ندی جل پیون دینی — کھپر دونوں ہاتھ گپھا رہنے کو دینی
وچرن کو چاروں دِشا عینؔ بھوگ کو گیان — سادھو کو کیا چاہیے سنبھی دیا بھگوان

آپ کا ہندی کلام ذو تین جلدوں میں قلمی طور پر مہاراجہ گوبند سنگھ صاحب کیلاش باشی والیٔ ریاست دتیا کے پاس محفوظ تھا۔ . . . آپ سمت ۱۹۰۰ بکرم بقید حیات تھے۔ چند کنڈلیاں نمونہ کے طور پر پیش کی جاتی ہیں جن سے پتہ چل سکتا ہے کہ آپ کس پایہ کے بزرگ تھے ؎

اور ہمارے کون جاتے کہیں حضور — دلبیت آپ ہی آپ ہو روم روم بھرپور
روم روم بھرپور ہو رسانولا سانچا سائیں — ہیرے من کی بات چھپی کچھ تم سے ناہیں
جو چاہو سو سائیں کرو عینؔ ہیں منظور — اور ہمارے کون ہے جاتے کہیں حضور

تینوں حرف ہیں عشق کے عین قاف اور شین — عین بہ عبادت عقل گو شین شرم لے چھین

شین شرم لے چھین قاف کو راہ بڑھاوے　　بے صبرا ہو جبھی تبھی وہ تک رشن پاوے
تینوں گن تینوں حرف عین لپیٹ ہیں ہیں　　تین حرف ہیں عشق کے عین قاف اور شین

۱۳۲۔ وامق جون پوری

آپ کا نام احمد مجتبیٰ، تخلّص وامق۔ موضع گجگاؤں، ضلع جون پور وطن ہے۔ آپ نے لکھنؤ یونیورسٹی سے بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان پاس کر کے فیض آباد میں ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۲ء تک وکالت کی۔ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۴ء تک سیاحت کی۔ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۰ء تک یو۔ پی گورنمنٹ میں راشننگ اور سپلائی افسر رہے۔ ۱۹۵۰ء میں نوکری سے استعفیٰ دے کر مشرق کا سفر کیا۔ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۳ء تک اپنے وطن گجگاؤں ضلع جونپور میں دہاتی زندگی اور لوک گیتوں کا مطالعہ کیا اور خود بھی ہندی زبان میں لوک گیت نظم کیے جن میں اودھی اور بھوجپوری کا اثر ملتا ہے۔ آپ کا پہلا ہندی گیت "بھوکا بنگال" ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۵۳ء و ۱۹۵۴ء اُردو ماہنامہ "شاہراہ" کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ ۱۹۵۵ء میں علی گڑھ یونیورسٹی میں نوکری کر لی۔ آپ کا ہندی کلام ہنس اور دوسرے ہندی رسالوں میں چھپتا رہا ہے۔ آپ ترقی پسند تحریک سے متاثر ہو کر اس کے رکن بن گئے۔

نمونۂ کلام سے

بول رے ساتھی بول

راج محل میں آگ لگی ہے　　پنچھی پنجرا کھول۔۔۔۔ بول رے ساتھی بول
جنتا جاگی، بھارت جاگا　　جاگا سب سنسار
بکنے گھاؤ اٹھانے والے　　کھینچے ہیں تلوار
بھبھر بھبھی پو پھٹا اُٹھ لاگی　　سینے ڈم ٹوا ڈول
راج محل میں آگ لگی ہے　　پنچھی پنجرا کھول۔۔۔ بول رے ساتھی بول

گیت

سوریج مکھ کی جوت پڑی تو جیون ساگر جل جائے
نیتے ہر دے کی بانبی سے پیاسا ناگ اُبل اُٹھا ہے
الھڑ بالک مرگ کے پیچھے پیچھے بھاگ رہے ہیں
سوئے سپنے اک اک کر کے دھیرے دھیرے جاگ رہے ہیں
چنچل آندھی آم ٹکورا گچھوں سے ٹکراتی ہے
کالے پیلے جھاڑو لے کر گھر گھر دھول اُڑاتی ہے
دیکھیں کب آتے ہیں ساجن

۱۳۴۔ علامہ کیفی چڑیاکوٹی

محمد مبین عباسی نام۔ کیفی تخلص۔ ولادت ماہ جولائی ۱۸۹۰ء مطابق ۱۳۱۰ ہجری قصبہ ولید پور ضلع اعظم گڑھ میں مشہور درویش وصوفی و فلسفی اور عالم حضرت چراغ ربانی مولانا محمد کامل ؒ کے دولت کدہ پر ہوئی جو علامہ مرحوم کے حقیقی نانا تھے۔ علامہ کی ابتدائی تعلیم اپنے نانا صاحب کی سرپرستی میں ہوئی، اور پھر علامہ مرحوم اپنے والد ماجد حضرت مولانا فاروق صاحب چڑیاکوٹی کے پاس چڑیاکوٹ چلے گئے۔ یہاں اپنے والد ماجد کی نگرانی میں علامہ مرحوم نے سولہ سال کی عمر میں اُردو۔ عربی۔ فارسی۔ ہندی۔ فلسفہ۔ حدیث۔ فقہ۔ منطق اور علوم ادب وزبان وغیرہ کا تکملہ کر لیا اور فارغ التحصیل ہو کر اپنے چچا مولانا عنایت رسول چڑیاکوٹی مرحوم (جو سرسید مرحوم کے استاد تھے) سے ترکی۔ ایرانی۔ عبرانی۔ سریانی وغیرہ زبانیں سیکھیں اور فلسفۂ الٰہیات وطبیعیات بھی پڑھا۔

پھر ۱۹۱۳ء میں رائے بریلی سے انٹرنس پاس کر لیا اور ساتھ ہی ساتھ فرانسیسی۔ جرمن اور لاطینی زبانوں سے واقفیت حاصل کر لی۔ علامہ مرحوم ندوۃ العلماء میں بھی زیر تعلیم رہے۔ ۱۹۴۸ء میں علامہ نے مہاتما گاندھی کی یاد کے نام سے نظموں کا ایک مجموعہ شائع کر دیا۔ پہلی اکتوبر ۱۹۵۶ء بروز دوشنبہ ڈیڑھ بجے دن یک بیک فالج میں مبتلا ہو کر ۶۵ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ نمونۂ کلام سے

بھجن

تج من سب پلوا اپنا کوئی نہیں

برگ پرگ ہٹ بار بیچ کھاتی ۔۔ لوٹت سانجھ سکار ۔۔۔ اپنا کوئی نہیں
ماتا ۔ پتا ۔ بالک اورناری ۔ جگ کے ہیں بیوہار ۔۔۔۔ اپنا کوئی نہیں
سانچ کہوں سب تگ ہیں جھوٹے ۔ پھول پات اور ڈار ۔۔۔۔ اپنا کوئی نہیں
کیفی پیا سب تج کے بیٹھو ۔ پربھو کے دربار ۔۔۔۔ اپنا کوئی نہیں

بن ہرنا ؤ کون ترے

کٹھن کلیس بپت اور سنکٹ ۔ اُن بن کون ہرے
سمندر اپار اتھاہ بجھ دھارا ۔ چاہے تو پار کرے
جب ان نینن آئے لبیں اُن ۔ تب من دھیر دھرے
جن من میں نہیں آس ہے ان کی ۔ چنتا اگن جرے
سوچت ہو تو سوتج لو کیفی ۔ ہاتھن سیس دھرے

دادرا

سپنواں پیارے گرد الگائے دکھ دینو ۔۔۔۔ سپنواں پیارے
نیہ دھرم کا مدھوا پلا کے تن من سب ہر لینو ۔۔۔۔ سپنواں پیارے
نیہہ باٹ میں کیفی پیا نے ۔ دکھ دینو سن لینو ۔۔۔۔ سپنواں پیارے

۱۳۴ ۔ بزمی چیڑیا کوٹی

نام محمد عزیز فاروق عباسی تخلص بزمی ۔ ولادت ۱۸ر جولائی ۱۹۳۰ء کو بمقام دیاں پور ۔ ضلع اعظم گڑھ (یو ۔ پی) ہوئی ۔ علامہ کیفی چیڑیا کوٹی مرحوم ان کے والد ماجد تھے ۔ ادیب اور عالم ماں کی گود میں پرداخت ہوئی ۔ فاضل ادیب اور درویش نانا مولوی محمد عیسیٰ صاحب مرحوم کی نگرانی میں بچپن گزرا ۔ شروع میں فارسی ۔ عربی علوم دینی ۔ منطق

فلسفہ۔ اُردو اور ہندی کی تعلیم گھر ہی میں گیارہ سال کی عمر تک مکمل ہو گئی۔ پھر انگریزی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا اور ۱۹۵۸ء تک علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم۔ اے۔ ایل۔ بی کا امتحان پاس کر لیا۔ شاعری کا شوق دوران تعلیم ہی سے تھا۔ اپنے والد ماجد علامہ کیفی چڑیاکوٹی مرحوم سے اصلاح لی۔ آپ عربی۔ فارسی۔ انگریزی۔ اُردو اور ہندی۔ پانچ زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ ہندی شاعری میں آپ نے آسان زبان استعمال کی۔
نمونۂ کلام ؎

سپنوں کا سنگم

پھولوں سے بھرپور ہو ڈالی   مست ہوا جاتا ہے مالی
آئیں گھٹائیں کالی کالی   رُت آئی ہے پھولوں والی
پریم کی نیا ڈول رہی ہے   من کی کھڑکی کھول رہی ہے

ساون

کالی راتیں کالے بادل   کالے بھنورے کالی کوئل
کالے نیناں کالے کاجل   گورا مکھڑا، کالے آنچل
آشاؤں کی من میں ہلچل   رِم جھم جیسے باجے پائل
رس برسانے مدھ برسانے   ساون آیا ساون آیا

سارے جگ سے پیارا ہم نے تجھ کو جگ میں پایا
جیون کی ہر رات اُجالی تو نے دیپ جلائے
پیار کی بازی ہار گئے ہیں تجھ سے نین ملا کر
تجھ کو پا کر پریم کا جادو جیون پر چل جائے

۱۳۵۔ نثار دھاروی

آپ نے اپنے حالات اور نمونہ کلام ۲/۵۹ ۷ کو عطا فرمائے جو درج ذیل ہیں:۔
تاریخ ولادت، ۳، اگست ۱۹۳۷ء۔ وطن دھار (مدھیہ پردیش) نثار تخلص۔
اس سال (۱۹۵۹ء) بی۔ اے فائنل۔ امتحان میں بیٹھ رہا ہوں۔ بی۔ اے کے بعد ہندی لٹریچر میں ایم۔ اے کرنے کا ارادہ ہے۔ ہندی ساہتیہ سمیلن پریاگ سے وشارد بھی پاس کی ہے۔ ابتدا میں بچّوں کے لئے کوتائیں اور رچنائیں لکھیں۔ کہانیاں اور ریکھ بھی لکھتا رہتا ہوں، ساہتیہ کھشیتر میں مدھیہ پردیش کے مشہور گیت کار شری بال کرشن شرما رودھا۔ جناب امیر محمد صاحب بی اے۔ جامعہ ملیہ اور شری مدھو کر جی کی ترغیب سے میرا ہندی گوئی کا شوق بڑھتا گیا۔ نمونہ کلام ؎

ساون

کتنی جادو بھری بج رہی بانسری — پی سے ملنے چلی کو کلا سانوری
دھانی آنچل اڑاتا اڑاتا — ساون پھر آیا ہے گیت گاتا
سور کی گنگا بھی بیبیر تو آن کہی — تم سجن دور رہو من کی من میں رہی
مجھ کو تو بیری ساون رلاتا — ساون پھر آیا ہے گیت گاتا

میں نے چاہا تھا کہ پا لوں گا تمھیں — اور کھو جاؤں گا کستل گھنی چھایا میں
کنتو سپنے کہیں ساکار ہوا کرتے ہیں — تم کو اپنا نہ بنا پایا میں

۱۳۶۔ توفیق سکندرآبادی

سیّد جلال الدین نام۔ توفیق تخلّص۔ سیّد ابراہیم مہدوی کے فرزند ہیں ۱۲۸۱ھ میں بمقام سکندرآباد (دکن) پیدا ہوئے۔ فارسی مولانا احمد علی سیال کوٹی سے پڑھی اور عربی مولانا منوّر میاں اور مولانا سیّد نصرت سے سیکھی۔ دفتر صدر مجالس میں ملازمت اختیار کی۔

ایک سو روپے ماہوار پاتے تھے۔ صوفی منش تھے۔ ۱۲ ذی الحجہ ۱۳۳۹ھ میں وفات پائی۔ دو لڑکے اور دو لڑکیاں یادگار چھوڑے۔ آپ اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ نمونۂ کلام ہندی ؎

او مورے مورکھ نادان	کاہے بھیو ایسے انجان
تلپت کلپت بیتی رتیاں	تورے دیکھن کو ہمیان
مو ہے لے چلو بالم امر ہیاں	میں بھی ادھر جدھر مورے سیاں
کوئل کوکے پپیہا بولے	جیا تڑپے ری گیاں
سیاں تو توڑیں پیلے پیلے انبوا	توفیق گھوے بھونرا بن جھیاں

۱۳۷۔ نثار اٹاوی

نثار حسین نام، نثار تخلص، وطن مالوف اٹاوہ ہے۔ تاریخ ولادت یکم مارچ ۱۹۱۴ء ہے۔ ہندی، اردو مڈل پاس کرنے کے بعد انگریزی کی جانب توجہ دی اور اردو میں فسٹ کلاس ایم۔ اے کیا، اور اسلامیہ کالج اٹاوہ میں اردو کے لیکچرار لگ گئے۔ مولانا حسرت موہانی پر ایک کتاب ہندی میں شائع کی۔ ۱۹۷۵ء میں وفات پائی۔ نمونۂ کلام۔

تو کاہے نا بولے

تو کاہے نا بولے پیا رے تو کاہے نا بولے
تورے پریم کو مار دچاتک ڈالی ڈالی ڈولے
ڈالی ڈالی ڈولے اپنے ہردے کے پٹ کھولے
ہردے کے پٹ کھولے دنیا نین ترازو تولے
وا کی مدھر مدھر سہانی بانی کانن امرت گھولے

پیارے......

ہائے بھٹک کر جانے والے دیکھی میری پریت
ڈوب گیا آہوں کی لے میں پائل کا سنگیت

میں راجہ نل تو دمینتی پریم کا پانسا پھینک
تن من دھن کا داؤ لگا ہے جیت سکے تو جیت

۱۳۸۔ حضرت شاہ محمد خلیل الرحمٰن رح سرساوہ

حضرت مولانا شاہ محمد خلیل الرحمٰن صاحب جمالی ولی کاملؒ ساکن سرساوہ ضلع سہارنپور (یو۔پی) حضرت پہار قطب ہانسویؒ کی اولاد سے ہیں اور سجادہ نشین بھی۔ آپ کے وصال کے بعد آپ کے بڑے صاحبزادے مولوی شاہ ولی الرحمٰن جمالی خلیفہ اور سجادہ نشین ہیں۔ آپ ۷۴ سال کی عمر پا کر رمضان المبارک ۱۳۴۲ھ ۱۲ تاریخ وقت عصر خدا کو پیارے ہو گئے۔

آپ اپنے وقت کے اولیائے کاملین میں ہوئے۔ آپ کے حلقۂ ارادت میں بڑے بڑے علماء داخل تھے۔ شعر وسخن کا مذاق فطری تھا۔ آپ فارسی۔ اردو اور ہندی تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ نمونہ کلام ہندی؎

ہار سنگار گیو سب میرا برہ کی زردی مکھ پہ رچی رے
آ مل آ مل تورے کارن پیاری جوگن تیری بنی رے
پریت لگا کر پیتم بچھڑے، دُکھ اور درد کوئی نہ پوچھے
نگری نگری دوا رے دوارے پی پی کہہ کہہ ڈھونڈھ پھری رے
خلیل کہاں تک ساجن پیارے رو رو اپنی عمر گزارے
ساجن گیو بدیس نہ آوے، اگن برہ کی من میں لگی رے

ہولی

ہوری کھیلوں گی ہانسی نگر میں — رنگ چڑھی ہے جمال کے گھر میں
یا من شو کی بھانجھ بنایو — انھو کے دف سبھی بجایو
رنگ فنا کا من میں رچایو — ڈال گلال بقا کا سر میں ہوری کھیلوں گی....

۱۳۹ - مولوی شاہ ولی الرحمن جمالی

شاہ محمد ولی الرحمن جمالی سجادہ نشین والد ماجد خود حضرت مولانا شاہ محمد خلیل الرحمن جمالی اولاد و سجادہ نشین بہار قطب ہانسوی ؒ۔ ولادت یکم محرم ۱۳۰۳ھ۔ عربی، فارسی کی تعلیم کامل پائی۔ تعلیم باطنی اپنے والد و مرشد برحق سے حاصل کی تیس ۳۰ سال کی عمر میں خلافت پائی۔ اردو۔ فارسی اور ہندی تینوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ قصبہ سرساوہ ضلع سہارن پور۔ یو۔ پی میں پیدا ہوئے اور یہیں مقیم ہیں۔ نمونہ کلام ہندی ؎

من کی کھڑکی کھول ارے مورکھ من کی کھڑکی کھول

نہ جا کاشی نہ جا متھرا ، نہ جا مسجد نہ جا گرجا
من کے اندر ڈھونڈ سجن کو ، مت پھر ڈانوا ڈول
اے مورکھ من کی کھڑکی کھول

ڈھونڈ ا جگ اور سب سنسارا ، تال سمندر اور کنارا
ہر ہے سادھو سب سے نیارا ، ہر کو من میں ٹٹول
اے مورکھ من کی کھڑکی کھول

گیان دھیان کی ہاٹ لگالے ، ست دھرم کے باٹ بنالے
پیت کا سودا پریم کے ہاتھوں ، جھکتا جھکتا تول
اے مورکھ من کی کھڑکی کھول

ہر کا پنتھ نرالا رے
آپ احد اور آپ ہی احمد آپ خدا اور آپ ہی بندہ
آپ رہی جوت سے جوت ملاوے آپ ہی دیکھن والا رے
ہر کا پنتھ نرالا رے

آپ ہی پنڈت آپ ہی قاضی آپ ہی اپنے من میں راضی
آپ ہی توڑے آپ ہی جوڑے آپ شریعت والا رے
ہر کا پنتھ نرالا رے
آپ مرے نہ اور کو مارے، آپ ہی بولے آپ پکارے
آپ ہی جیو اور آپ ہی جیوے، آپ جلاون والا رے
ہر کا پنتھ نرالا رے

۱۴۰۔ بے چین شفائی

بے چین صاحب نے اپنے حالات ۲۰ ۹/۵۸ کو عطا کیے۔ انھیں کے الفاظ میں سنیے:
میرا نام ہے محمد عمر تخلص بے چین شفائی۔ حضرت شفا گوالیاری کا شاگرد ہوں، اس لئے خود کو شفائی لکھتا ہوں۔ اکثر لوگ بے چین بھارتی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ میں قصبہ باڑی اسٹیٹ دھول پور میں جنوری ۱۹۳۲ء کو پیدا ہوا۔ اس زمانے میں میرے والد محترم مولوی محمد احسان صاحب سہسوان میں درس دیا کرتے تھے مدرسہ مذکور میں، میں نے کچھ اردو اور کچھ مذہبی تعلیم حاصل کی۔ بعد میرے والد صاحب کاروباری سلسلہ میں گوالیار منتقل ہو گئے۔ مجھے گوالیار کا ماحول بہت پسند آیا۔ یہاں میں نے والد صاحب سے عربی و فارسی پڑھی۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگامے نے گوالیار سے پھر باڑی لا پٹکا۔ ۱۹۵۰ء میں پھر گوالیار واپس آ گئے۔ اس کے بعد اپنے چچا کے پاس گنگا پور سٹی میں کئی سال قیام کیا اور یہیں ہندی کلام کہنے کی مشق بہم پہنچائی۔ نمونہ کلام ہندی ؎

بھجن

اے دھرنی دھر، اے مرلی دھر، اے سوامی نیک اپکار کرد
کرشن مراری ات بل کاری، بھنور سے نیا پار کرد
دھرم کی نیا ڈگمگ ڈولے، کھائے رہی پل پل ہچکولے
ڈوب رہی ہے ہوئے ہولے، دیر نہ اب داتار کرد

ہے کوی سادھو دھانی سے وِدیا اور بدھ وانی سے
ہر مُورکھ سے ہر گیانی سے اب پریم کا تم پرچار کرو

برہا کی رین

روتے ہیں نینا ہے اُلپت جیا ہائے برہا کی رین کٹے کیسے پیا
میرے تن میں بھڑکی ہے جوالا مُکھی آجا آجا ادھک آج بیکل بھئی
ہو ہے سینے میں رنج دکھا جا پیا
ہائے برہا کی رین کٹے کیسے پیا

۱۴۱۔ آرزو لکھنوی

میر ذاکر حسین صاحب یاسؔ مرحوم کے دو صاحب زادے میر یوسف حسین صاحب قیاسؔ اور انوار حسین آرزوؔ ہوئے۔ میر ذاکر حسین صاحب رلارام کی بارہ دری لکھنؤ میں رہتے تھے۔ اسی بارہ دری میں جناب آرزوؔ ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۸۹ھ کو منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حکیم قاسم علی سے اور تکمیل مولانا آغا حسن صاحب سے ہوئی۔ بارہ برس کی عمر میں شعر گوئی کی طرف میلان ہوا۔ تیرہ برس کی عمر میں جلالؔ لکھنوی کے شاگرد ہوئے۔ جلالؔ صاحب کا انتقال ۱۳۲۶ھ میں ہوا اور ۱۳۲۶ھ میں آرزو صاحب جانشین جلالؔ مقرر ہوئے۔ آپ کی عرفیت منجھو صاحب اور ابتدائی تخلص مرادؔ تھا۔ آپ ملازمت کے سلسلے میں سندیلہ۔ کلکتہ اور بمبئی میں رہے۔ اُردو کے علاوہ ہندی میں بھی شعر کہتے تھے آپ کے ہندی گیت نیو تھیٹرز کی فلموں میں آکر زبان زدِ خاص و عام ہوئے۔ ۱۷ اپریل ۱۹۵۱ء سو اسّی سال کی عمر میں بمقام کراچی (پاکستان) انتقال کیا۔ نمونۂ کلام ؎

گیت

کھوٹ مٹا دے من کی مورکھ کھوٹ مٹا دے کھوٹ
پاپ کی کالک دُور نہ جائے جوت میں اس درپن کی
کھوٹ مٹا دے من کی......

نردوشی کو دوشش لگانا۔ سبھوپن کو پاپ بنانا
اُجلی بھوّر کو سانجھ بنادے جیسے گھٹا ساون کی
کھوٹ مٹاوے من کی۔۔۔۔۔

پیا ملن چلی۔ میں تو پیا ملن چلی
سگرے جگ ناسب سے کھیلی شام کی گلی
میں تو پیا ملن چلی
چھڑیاں پہنوں جھنی جھنی، چولیا ہوئے کسی کسی
ہونٹوں سے کھلے ان کی ہنسی جیسے کھلے بندھی کلی
میں تو پیا ملن چلی
بنتی کر کر جھاؤں گی۔ بپتاں بپتا دوں گی
جیسے ہٹے مٹاؤں گی۔ موہی من کی بے کلی
میں تو پیا ملن چلی

۲۴۱۔ بزمی گنوری

صابر علی نام۔ بزمی تخلّص۔ والد ماجد کا اسم گرامی۔ حافظ اشفاق علی مرحوم۔ آبائی وطن گنوّر ضلع بدایوں۔ پیشہ کاشتکاری۔ گھر پر ضروری عربی۔ فارسی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مقامی اسکول سے اُردو، ہندی ورنیکولر فائنل امتحان پاس کیا۔ سنِ ولادت ۱۹۱۶ء ہے۔ شاعری کا ذوق بھی آبائی تھا۔ ۱۹۳۲ء میں باقاعدہ شاعری شروع کی، اور آبرا حسنی سے اکتساب فن کیا۔ اُردو اور ہندی دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ نمونۂ کلام ہندی سے گیت:۔

آؤ پیارے ساتھی آؤ
لہراتا ہے سوارتھ کا آنچل نیائے کی سندر آنکھ سے بوجھل

سوکھ رہی ہے من کی کونپل   برسو، بن کر پریم کا بادل
پیاسوں کی بھی پیاس بجھاؤ   آؤ، پیارے، ساتھی آؤ

آشا کے دیپ

پریم کا ساگر امنڈا امنڈا!   من کی نیا ڈوبی ڈوبی
نینوں میں کچھ آشاؤں کے   دیپ جلائے بیٹھی ہو گی
کومل کلیوں کے سینوں میں   تیر رہے ہیں برچھی بھالے
پگ پگ پر بہتے ہیں برمی   کرودھ کپٹ کے ندی نالے

۱۴۳۔ راز بریلوی

حضرت شاہ محمد تقی۔ عزیز میاں المتخلص بہ راز حضرت شاہ نیاز احمد بریلوی رح کے جانشین ہیں۔ آپ درویش کامل اور صاحب ارشاد ہیں۔ آپ کی متعدد تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ حضرت راز فارسی۔ اردو۔ ہندی تینوں زبانوں میں شعر فرماتے ہیں آپ کے کلام میں ایک خاص روحانی کیف ہے۔

نمونۂ کلام

ہر کو ہر کو دیکھے سے مورکھ ہر دیکھے تو ے
دیکھ دیکھا دن دیکھ ہی کا دیکھے موئے
نین بیچ جو جوت نہ پاوں، کان بیچ رس
پنچ اور پنچ کا راز نہ جانے ہردے بیچ کا ہوئے

ہوری

ہولی آئی سوسیاں بسار گیو   موہے سونی سجریا پر چھار گیو
میکا جیا نہ چاہے کھیلن کو   مورا راز پیا من مار گیو

دیگر

پیا ہوری کھیلت موسے راز مچائی   چھین جھپٹ موری گاگر وھڑکائی

رنگ میں اپنے رنگ دینو ری — رنگت بینوالیسی موری سُدھ بسرائی
راز پیا نے اک ہُو نہ مانی — دیت رہی ہیں لاکھ دُہائی

۱۴۴۔ شوقؔ اثری

عثمان علی خاں نام۔ شوقؔ تخلّص۔ رام پور وطن۔ والد کا نام محمد علی خاں اثرؔ رامپوری۔ ۱۹۳۲ء میں پیدا ہوئے۔ ہیلتھ آفس میں ملازم ہیں، اُردو اور ہندی دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ اُردو میں ابر احسنی کے شاگرد ہیں۔ ہندی میں کسی کو کلام نہیں دکھایا۔

جیون

یہ سُنا بہت ہے میں نے بھی لوگوں کو کہتے باربار
جگت میں جیون کیا ہے اور کیا جیون کا ایک آدھار
سب ہی وشاؤں سے میری کانوں میں آئی یہی پُکار
سنگھرش سے ہے گھرا ہُوا پر بڑھتا جاتا وہیں پیار
میں بھول رہا تھا جیون کی کچھ سندر سندر کریڑائیں
پھر آج اچانک اس مانس میں کیوں مُنڈ پڑی ہیں پیڑائیں
میں پر تینوں سے اُس کو انگ کہیں رکھنے میں سلگن رہا
کنتو آتی رہیں نیرنتر یاد مجھے اُس کی کریڑائیں

”نیم گرہی“

تنک سی بات پر ہو جاتا ہے رکت پات
تنک سی بات میں پھانسی بھی چھوٹ جاتی ہے
پلاسٹک کی بنی ہوئی ہے یہاں نیم گرہی
دھن کی آنچ دکھانے سے یہ ٹوٹ جاتی ہے

۱۴۵۔ ادیب گلشن آبادی

ادیب صاحب نے ۲ فروری ۱۹۵۹ء کو اپنا مختصر ہندی کلام جاوِرہ نیم چوک سے عطا فرمایا لیکن نہ اپنا اسم گرامی درج کیا نہ حالات۔ اُن کے دو گرامی نامے فردوس نظر ہوئے جو کچھ اُن سے معلوم ہوا، درج ذیل ہے۔

ادیب تخلص۔ گلشن آباد وطن۔ والد بزرگوار کا اسم گرامی قلندر بادشاہ صاحب۔ اُردو۔ اور ہندی دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ ہندی کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

باپو کی موت پر

مری بانی اگر ست مانتے ہو مان لو یہ بھی
پریم ایک جوت سوئم روپ پہچان لو یہ بھی

اہنسا کا روپ

اہنسا کو سمجھنا ہے تو مَن کی شانت لیلا دیکھ
کرم اور گیان کے رستے سے تو آتم کی شِیلا دیکھ

بھجن

تربینی میں انگ بھگو کر سونا چاندی دان کرے
موکش آشا من میں دھرے، ہری بھجن سے دُور رہے
سمجھ سمجھ لے منوا ناداں ۔۔۔ نام نرنجن سمرن کرے

۱۴۶۔ عزیز (موسیقار)

آپ کے حالات نہیں مل سکے۔ البتہ آپ کا ہندی کلام، کتاب نغمۂ جانفزا مصنفہ منشی جگن ناتھ سہائے ہزاری باغ میں درج ہے، وہاں سے نقل کیا جاتا ہے۔

ٹھمری تصنیف عزیز کھماچ

کاہے برجوری موری گہت کلائی رے۔ ایسی ٹھٹھول توری نہتے سہائی رے
کاہے برجوری ۔۔۔۔

انترہ

کر جورت ہوں عرج کرت ہوں۔ موہے نہ ستاؤ تورے بل بل جائی رے

کاہے بر جوری.....

انترہ۔ پیٹ جھپٹ مورا جوبنا چھووت ہے۔ ایسی چترائی توری موہے نہیں بھائی رے

کاہے بر جوری.....

انترہ۔ عزیز پیا ایسو ڈھیٹھ بھیو ہے پکڑ دھکڑا نگیا مسکائی رے..... کاہے بر جوری.....

(نغمہ جانفزا مصنفہ منشی جگن ناتھ سہائے صفحہ ۲)

۱۴۷۔ نرگس موسیقار

ٹھمری (تصنیف نرگس) کھماچ

ہمارے من بس گئے رادھے شیام۔ ہمارے من

انترہ۔ مور مکٹ کر مرلی سوہے کیا چھب ہے گھنشیام..... ہمارے من

انترہ۔ کر جور بنتی کرت ہے نرگس راکھو سرن سکھ دھام..... ہمارے من

اڈّھا (مصنفہ نرگس) کافی

رام جنمے دسرتھ کے بھون وا ـــــ رام جنمے

انترہ۔ چیت شکل پاکھ نتھہ نومی۔ جنم لیو دسرتھ کے للنوا۔ رام جنمے

انترہ۔ دسرتھ دان رتن من دینھے۔ جانچک گن سب بھئے مگنوا۔ رام جنمے

انترہ۔ منگل گاوت نار سکل مل۔ ناچت سب دسرتھ کے آنگنوا۔ رام جنمے

انترہ۔ نرگس کو سوامی درشن دیجئے۔ نسدن آس ہے تمھری چرنوا۔ رام جنمے

(نغمہ جانفزا مصنفہ منشی جگناتھ سہائے صفحہ ۳)

۱۴۸۔ بیکل اُتساہی وارثی

لودھی محمد شفیع خاں وارثی قادری نام۔ بیکل اُتساہی تخلّص۔ والد محترم کا نام

خان بہادر لودی محمد جعفر خاں وارثی مرحوم۔ یوم ولادت ۱۹ جولائی ۱۹۳۰ء پیشہ
کاشتکاری۔ موضع بڈھوا جوت تحصیل بلرام پور۔ ضلع گونڈہ (یو۔پی) وطن۔ اپنے
گاؤں کا نام بدل کر اب بیکل نگر رکھ دیا ہے اور وہاں بیکل اتساہی جنتا ودیالیہ قائم کر دیا
ہے۔ اس وقت بلرام پور میں سکونت پذیر ہیں۔ تعلیم (عربی میں عالم۔ فارسی میں منشی اعلیٰ قابل۔
انگریزی میں انٹر۔ اردو میں ادیب ماہر کامل۔ ہندی میں وشارد) تعلیمی سرگرمی (جگر میموریل
انٹر کالج گونڈہ' یو۔پی) کے بانی، چیرمین اور سرپرست ہیں۔ ۲۔ جامعہ عربیہ نورالقرآن بلرامپور
کے ہائی نگراں اور سرپرست ہیں۔ ۳۔ بال بھارتی اکاڈمی بلرام پور کے پریذیڈنٹ ہیں۔
۴۔ عربک یونیورسٹی مبارک پور ضلع اعظم گڑھ کے نگراں ہیں)

ادبی۔ ملکی۔ سماجی کارگزاری۔

۱۔ یونیورسٹی کورٹ گورکھپور کے سرکار کی طرف سے ممبر نامزد ہوئے۔
۲۔ سرکار کی طرف سے پی۔ اینڈ ٹی ایڈوائزری کمیٹی یو۔پی سرکل کے ممبر نامزد ہوئے۔
۳۔ ہائی اور میڈیٹ ایجوکیشن بورڈ یو۔پی کے ممبر نامزد ہوئے۔
۴۔ نیشنل رائٹرس فورم آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی طرف سے سکریٹری نامزد ہوئے
۵۔ ۱۹۶۷ء میں مشرق وسطیٰ کا دورہ خیر سگالی اور حج کیا۔
۶۔ ۱۹۶۸ء میں انڈو نیپال فرینڈشپ سوسائٹی کی طرف سے کھٹمنڈو کا دورہ۔
۷۔ ۱۹۶۹ء میں غالب صد سالہ کمیٹی پر انگلستان کی دعوت پر انگلینڈ میں نمائندگی۔
۸۔ ۱۹۷۵ء میں بزم ادب نتال ہندی شکشا سنگھ کی دعوت پر جنوبی افریقہ کا دورہ۔
۹۔ ۱۹۷۶ء میں بھارت سرکار کی طرف سے نامزد ہو کر ہندی کنونشن مارشیش میں گئے۔

تصنیفات۔ وجے بگل۔ باپو کا سپنا۔ لہکے بگیا مہکے گیت۔ نور کی برکھا۔
ہندی کلام کے مجموعے ہیں۔ اس کے علاوہ نشاط زندگی۔ نغمہ و ترنم پروائیاں
اپنی دھرتی چاند کا درپن۔ کومل مکھڑے۔ نور یزداں۔ سرود جاوداں اردو
کلام کے مجموعے ہیں۔

تخلص :- بیکل آستانہ وارثیہ سے کسی بزرگ نے پکار کر کہا اور "اُتساہی" آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو نے پکار کر کہا' اس لئے بیکل اُتساہی تخلص کرنے لگے۔

اعزازات : ۱۹۶۲ء میں قومی ایکتا ایوارڈ ملا۔ ۱۹۶۵ء میں یو۔پی سرکار کی طرف سے قومی شاعر کا خطاب ملا۔ ۱۹۶۹ء میں یو۔پی محمد علی جوہر میموریل کمیٹی نے گیت ایوارڈ دیا۔ ۱۹۷۶ء میں بھارت سرکار نے "پدم شری" کا اعزاز دیا۔

تلمذ :- آغاز میں ہندی میں پنڈت رام اپرگٹ منی سے اصلاح لی اُردو میں مولانا کلیم اللہ صدیقی موہانی بزشین ٹیچر سے اصلاح لی۔

آپ نے اودھی بھاشا کے لوک گیت سے شاعری شروع کی ہندی میں غزل کو متعارف کرایا۔ ہندی بھاشا کو سنسکرت کی پرچھائیوں سے دور رکھنے کی کوشش کی۔ اودھی بھوجپوری۔ برج بھاشا اور دیگر علاقائی بھاشاؤں کے خوبصورت اور خوش سماعت الفاظ غزلوں میں سمیٹے۔ نمونہ کلام ے

نعت شریف

تو نے کارن جے بو بھری دواریا
سیّدنا ہمری لاج رکھو
باوری گرجے بجری لو کے ۔ چاند اُگلے انگارے
بھوئیاں تپے آکاس جرا وے زہر بھکے اندھیارے
ہمرے دکھ ہیریے ہیں بولو کونی او کھیاں
سیّدنا ہمری لاج رکھو

قومی گیت

میں اس دھرتی کا گیت کار ہوں
جس دھرتی کے انگ انگ کو چومیں چاند ستارے
میرا گیت وطن کا پیار
ایکتا میرے گیت کا سنگار شبدامن کا درپن

میری لیکھنی کے آنگن میں مانوتا کا درشن
میری قلم کو "تاج" اجنتا کی تقدیر نہارے
میرا گیت وطن کا پیار

ڈیوگ گیت

گیہوں کی بالیاں پاکی — اُمڑا بھنور گیت
کھیتیاں میں ناچ آرہا رہا — او سانوریا مورے
ہوئی گئے گُگری کا پھول

پھولوا گورو ڈے گجرا — آنسواں میں سوئے گجرا
گُھرِ گئے کو جوامیں پورِیا — او سانوریا مورے
ہوئی گئے گگری کا پھول

غزل

کب یہ ہاتھ کی ریکھاؤں میں ڈھونڈے گا تقدیر رے جوگی
کیا جانے کب ناگن بن کر اس پہ کوئی لکیر رے جوگی
پی کے بان انوکھے چتون بیکل نیناں پیاسے درپن
اُس کے اِن چندن ہاتھوں میں زہر بھی ہے اکسیر رے جوگی

عرضِ نیاز

ہند و پاک میں متعدد مسلمان شعرا ایسے ہیں جو اُردو کے شاعر ہیں لیکن اپنی تخلیقات عالیہ میں ہندی کے اسلوب نگارش پر ہندی گیتوں کو بھی اپنا رہے ہیں۔ مثلاً شکیل بدایونی جاں نثار اختر مرحوم۔ حفیظ جالندھری۔ قتیل شفائی۔ تاج سعید (پاکستان)، ساحر لدھیانوی۔ لالہ رُخ۔ افسر میرٹھی۔ کمال پاشا۔ شاہین غازی پوری۔ زبیر رضوی انسک امرت سری۔ اشرف شبلی فاروقی (پاکستان) صہبا اختر (پاکستان)، سلطانہ قمر (پاکستان)، خاطر غزنوی (پاکستان)، نگار صہبائی (پاکستان)، اکرم افگار (پاکستان) ابن انشا عرفانہ عزیز۔ صادق۔ اعجاز عبید وغیرہ۔ وغیرہ

غور کیا جائے تو ہندی زبان کی خدمت کرنے میں یہ حضرات بھی برابر کے حصہ دار ہیں اس لئے بخوفِ طوالت ان کے حالات نہیں دیے گئے، محض نام ہی پیش کرنے پر اکتفا کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ امیر مینائی معادنین ہندی میں خاص مقام پر فائز نظر آتے ہیں۔ آپ عربی، فارسی کے جیّد فاضل ہونے کے علاوہ ہندی کے ماہر اور سنسکرت سے آگاہ تھے۔ آپ نے اپنی تصنیف منیف (انتخاب یادگار) میں اُردو شعرا کے دوش بدوش ہندی شعرا کا ذکر بھی کیا ہے۔ مثالیہ ہندی اشعار کی تشریح ایسے نادر اور بلیغ انداز سے کی ہے کہ عقل حیران ہوتی ہے۔ ہندو تلمیحات کی تفسیر آپ کی وسعت نظر، عمیق مطالعہ اور رواداری کا ثبوت ہے۔ "حیاتِ امیر مینائی" از حضرت آہ کے تجزیہ سے پتہ چلتا ہے کہ امیر مینائی نہ صرف اُردو کے صاحبِ فن و باکمال شاعر تھے بلکہ انھوں نے صاف اور سلیس ہندی میں بھی اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ لیکن اُن کا ہندی کلام دستیاب نہیں ہوتا۔ کتاب مذکور کے صفحہ ۱۴۹ و ۱۵۰ پر حضرت امیر مینائی کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ تصانیف کی فہرست دی گئی ہے جس میں ۳۷ نمبر پر "ست سیا بہاری" کا نام درج ہے یہ کتاب سات سو ہندی اشعار کا ترجمہ ہے۔ خدا جانے کون کون سے ہندی اشعار ہوں گے جن کا ترجمہ کیا گیا ہوگا۔ لیکن افسوس کہ یہ کتاب شائع نہیں ہوئی، ورنہ آج بڑے کام کی چیز ہوتی۔ آپ کی

ایک ہندی تضمین بھی ملتی ہے۔ کمال پاشا اور سیماب اکبرآبادی نے ہندی بھاشا میں لوریاں لکھی ہیں چنانچہ سیماب صاحب کی لوریاں الیکٹرک ابوالعلائی پریس آگرہ نے کتابی صورت میں شائع کی ہیں۔

آخر پر ہیچمدان مؤلف کو بجا طور پر اس بات کا اعتراف ہے کہ تذکرہ ہذا ہنوز تشنۂ تکمیل ہے۔ درجنوں شعرا کے حالات پردۂ اخفا میں ہیں۔ ویرانے میں بیٹھ کر اپنی ساری زندگی کے بہترین لمحات اس کی تلاش و تدقیق میں خرچ کر کے جو مواد اکٹھا کیا ہدیۂ ناظرین ہے۔

خاکسار حیات و موت کے سنگم پر کھڑا دارالبقا سے آنے والے پیغام کا منتظر اس بات کا متمنی ہے کہ مستقبل قریب میں کوئی دل گُردے کا مالک نوجوان محقق اس میدان میں اُترے اور اس کام کو پورا کر دے۔ ع

ما بجامے کہ ز جسم ماند قناعت کردم
بسکندر بدہید آنچہ ز دارا ماند

اِس عرضِ نیاز کے ضمن میں اظہارِ افسوس کی جرأت بھی کی جا رہی ہے کہ بقیدِ حیات ہندی گو مسلمان شعرا میں سے درجنوں ایسے بے نیاز حضرات بھی ہیں جن کا درِ فیض اثر بار بار کھٹکھٹانے پر بھی محرومی نصیب ہوئی، اور صدائے بازگشت آشنائے گوش نہ ہو سکی۔

○

۱۴۹۔ سیّد خورشید علی نظمی

سیّد خورشید علی نام۔ نظمی تخلّص۔ خورشید نظمی کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ کی ولادت یکم جولائی ۱۹۲۵ء میں مہاراشٹر کے ایک مقام وردھا میں ہوئی۔ انٹرمیڈیٹ کے درجے تک تعلیم پائی۔ آج کل بھلائی نگر، مدھیہ پردیش کے مشہور کارخانہ میں اسپات کے حصہ میں پینجر ہیں۔ ابتدائی تعلیم اپنے آبائی گاؤں وردھا ہی میں حاصل کی۔ ابھی اردو مڈل کی تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ شاعری کا شوق پیدا ہو گیا۔ ۱۹۴۷ء میں میٹرک پاس کرنے پر ناگپور میں مدرس لگ گئے۔ پھر ۱۹۵۰ء میں ناگپور ہائی کورٹ کے دفتر میں نوکری مل گئی۔ ۱۹۵۶ء میں ناگپور سے جبل پور تبادلہ ہو گیا۔ وہاں سے ۱۹۵۷ء میں بھلائی سٹیل پلانٹ میں ملازمت مل گئی۔ ساتھ ہی متعدد کوی سمیلنوں اور مشاعروں میں شامل ہوتے رہے۔ ہندی میں جناب صابر دساسرتلے گانوی سے فیض حاصل کیا۔ ان کے انتقال کر جانے پر اپنے ہی ذوق سلیم کو رہبر بنایا۔ ۱۵ اگست ۱۹۶۰ء میں ہندی کے مشہور شاعر جناب سلیم احمد زخمی کی خدمت میں زانوئے ادب تہہ کیا۔ مختلف ہندی رسالوں میں کلام چھپنے لگا۔ مثلاً ماہنامہ "قمر" بمبئی۔ "فیروز" ناگپور۔ "آکاش بانی" اندور۔ "ایجوکیشن ٹائمز" ناگپور وغیرہ۔ ۱۹۷۲ء میں راج نادگانو اور ۱۹۷۵ء میں رائے پور کے اکھل بھارتیہ کوی سمیلنوں میں اونچا مقام حاصل کیا۔

نظمی صاحب باوجود ملازمت کی مصروفیت کے یادِ خدا اور عبادتِ مولا میں کافی وقت صرف کرتے ہیں۔ صاحبِ ایثار، خدا ترس، خدا پرست اور پارسا انسان ہیں۔ نمونہ کلام ہندی:۔

(مکتک)

تیرا ارجن کا ہے اپوک اب تک ۔۔۔ کام اپنا کیا ہی کرتا ہے

رام آدرش اب بھی ہے پیارا ۔۔۔ راون ہر سال اب بھی مرتا ہے

غزل

ہر من کا گیت ارے من ۔۔۔ پریتم ہر ہر تم، ساجن ساجن

اَب کے برس بھی آئے نہ ساجن — بیتا چلا ہے یہ بھی ساون
جب تک ہوں نہ اُن کے درشن — اسپھل نسچے سارا جیون
ہونٹ گلابی پھول کی پنکھی — کومل کومل پاون پاون
جھن جھن جھن جھن پائل چوڑی — دھک دھک دھک دھک دل کی دھڑکن
من کی آنکھیں کھول تو پگلے — ہر پل ہر کھشن انیک درشن
آنسو آخر کب تک تھمتے — کب تک رہتا سوکھا دامن
عمر تو گھٹتی ہی جائے گی — لوگ بڑھالیں گھر کا آنگن

اپنی کویتا ہی کیا نظمی
اپنے دیا کل من کی تڑپن

مکتک

اپنی ہی نگری میں مجھ سے — اپنی ہی نگری کے لوگ
پوچھتے ہیں نام میرا — اور ٹھکانا دوستو
سوچتا ہوں کس طرح دُوں — اب پریچے میں اُنھیں
یوں تو کہتے ہیں مجھے
خورشید نظمی دوستو

۱۵۰۔ درد ہوشنگ آبادی

اسم گرامی حبیب اللہ خاں۔ درد تخلص ہے۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں بمقام ہوشنگ آباد (مدھیہ پردیش) ایک عالی نسب مسلم گھرانے میں آپ کی ولادت ہوئی۔ آپ کے والد محترم جناب مصطفےٰ خاں مدھیہ پردیش میں محکمۂ پولیس میں تھانے دار تھے۔ پرائمری تعلیم موضع بابئی ضلع ہوشنگ آباد میں حاصل کی۔ والد صاحب کے ریٹائر ہوجانے پر ہائی اسکول کی تعلیم ہوشنگ آباد میں حاصل کی۔ سنہ ۱۹۳۸ء میں میٹرک پاس کرنے کے بعد آپ بطور سب انسپکٹر منتخب کر لیے گئے اور ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد ۱۹۴۱ء میں جبل پور ضلع میں سب انسپکٹر پولیس

کے عہدے پر متعین ہو گئے۔ نومبر ۱۹۷۰ء میں آپ ریٹائر ہو گئے۔

۱۹۴۲ء میں جب کرپس مشن ہندوستان آیا تو اُس وقت آپ کی طنزیہ نظم ہندی ستیاپک شبھ چنتک میں پہلی بار چھپی۔ پھر اسی سالہ میں مضامین اور نظمیں ورد ہوشنگ آبادی کے تخلص سے چھپتی رہیں۔ علاوہ ازیں کرم ویر۔ جے ہند وغیرہ ہندی رسالوں میں بھی ہندی نظمیں اور مضامین چھپتے رہے۔ مدھیہ پردیش کے پولیس رسالہ میں تو سالوں تک آپ کی تخلیقات چھپتی رہیں۔

ہندی میں آپ کے اُستاد شری رام نرائن مشرا تھے جو اب بالاگھاٹ میں پولیس سپرنٹنڈنٹ کے عہدہ سے ریٹائر ہو کر قیام پذیر ہیں۔ ان کے اعزاز میں چار ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ مدن محل۔ پہاڑی پرتاپ۔ نیچی دنیا۔ تخت طاؤس۔

آپ ہندی کے علاوہ اُردو میں بھی شعر کہتے ہیں۔ اُردو کے اُستاد آپ کے عاشق چھندواڑوی اور سلیم احمد زخمی ہیں۔ نمونہ کلام ۔ گیت

پریتی کے دیپ سدا جلتے رہیں گے

آس کی باتی بھلے ہی بجھ گئی ہو، پریتی کے دیپک سدا جلتے رہیں گے

ہم تمھاری پائلوں کی ہر کھنک پہچانتے ہیں

ان سنہری گیسوؤں کی ہم مہک پہچانتے ہیں

آج تم نے سی لئے ہوں ہونٹ چاہے لاج دش

کنتو انتر کی تمھاری ہر کسک پہچانتے ہیں

وشو تو ہر دم ہمیں چھلتا رہا ہے

سوپن چھلیے کب تلک چھلتے رہیں گے

پریتی کے دیپک ،،،،،،

یگ یگوں کے بندھنوں کے یہ بندھے ہیں نہ ناتے

انھیں یہ تو بھول کر بھی ہم نہ تم کو بھول پاتے

چنچل سوئم کو ہی بھلے تم۔ دُور نظروں سے بسے ہو
کنتو پر تی پل ہم تمھارے ہی برہا کے گیت گاتے
پیار کا امرت بھلے ہی چھن گیا ہو — ورد کے سانچے میں ہم ڈھلتے رہیں گے
پریتی کے دیپک سدا جلتے رہیں گے

گیت

جیوتی سے مدھ چھلکتا رہا رات بھر
پران سدھی نے تیری اپنا بے سُدھ کیا — دیپکا کی جگہ دِل جلاتا رہا
یہ مہکتی نشا بھی بہکتی رہی — ایک سپنوں کی دُنیا سجاتا رہا
رات بھر کوئی پروانہ جلتا رہا — کوئی دیپک بھی منتا رہا رات بھر
جیوتی سے مدھ چھلکتا رہا رات بھر
جیوتی سے آج گھر الوکت ہوا — کیوں تم آج آیا میرے دوار پر
جس کو سمجھا تھا اپنا اُسی نے چھلا — زندگی آپ دوں گا اپ ہار پر
رات بھر تار کا کیں سجاتی رہیں
جیوتی سے مدھ چھلکتا رہا رات بھر
آج نینوں سے چھوٹی ہے جو پھلجھڑی — کون جانے کہ کل ان سے برسات ہو
کیا پتہ اس اندھیرے گگن کے تلے — یہ ہمارے لئے آخری رات ہو
کال نے دوار پر میرے دستک دیا — دل تمھارا دھڑکتا۔ رہا رات بھر
جیوتی سے مدھ چھلکتا رہا رات بھر

۱۵۱۔ امین ہوشنگ آبادی

امین اللہ خاں نام۔ امین تخلص۔ اُردو وہندی کے مشہور شاعر حبیب اللہ خاں
درد ہوشنگ آبادی کے صاحبزادے۔ اپنے آبائی وطن ہوشنگ آباد میں بتاریخ

۵ ستمبر ۱۹۴۵ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بیتول میں پائی اور جبل پور میں تعلیم سے فارغ ہوئے۔ کچھ عرصہ ہائی اسکول چھندواڑہ مدھیہ پردیش میں ٹیچر رہے۔ وہاں سید عاشق علی عاشق چھندواڑوی کی صحبت میسر آئی۔ جس کے زیر اثر شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ اردو اور ہندی دونوں میں شعر کہتے ہیں۔ کچھ ہندی کہانیاں بھی لکھی ہیں۔

نمونۂ کلام پیار اور دیپ

مل کر ہند و مسلم دونوں پیار کے دیپ جلائیں اب
سبھی بھول کر بھید بھاؤ ہم شبھ رسومیں سجائیں اب
جب نفرت بڑھ جاتی ہے   جنم ہنسا تب پاتی ہے
بچوں کا بھی پیتی خون   مانس بڑوں کا کھاتی ہے
ایسی شیطان کی بیٹی کو دل سے چلو بھگائیں اب
مل کر ہند و مسلم دونوں پیار کے دیپ جلائیں اب

کچھ بھائی اپنے روٹھے رہے   اور ہم صدیوں سمٹتے رہے
نار نا مرجھائی انکھیوں کو   اب تک ہم جو ڈھوتے رہے
نظروں سے جو گر گئے ہوئے ہیں چلو انھیں اٹھائیں اب
مل کر ہند و مسلم دونوں پیار کے دیپ جلائیں اب

سبھی اور وشواس رکھے گا   تبھی شانتی سمن کھلے گا
تبھی سبھی میں پریم رہے گا   تبھی آگے دیش بڑھے گا
آپس میں نسوارتھ آپ سے دل وشواس جگائیں اب
مل کر ہند و مسلم دونوں پیار کے دیپ جلائیں اب

نہ آپس میں رکھیں بیر ہم   نہ دوجے کو کہیں غیر ہم

مٹا کے شنکائیں آپس کی ہو کر ہرشے کریں سہیرم
جات پات کے توڑ کے بندھن، سب کو گلے لگائیں اب
مل کر مسلم دونوں پیار کے دیپ جلائیں اب

۱۵۲۔ اظہر بخش اظہر

اظہر بخش نام۔ اظہر تخلص۔ یکم اپریل ۱۹۵۲ء میں بمقام بیتول (مدھیہ پردیش) ولادت ہوئی۔ آج کل پورہ (مدھیہ پردیش) میں وکالت کرتے ہیں اور وہاں کی انجمن پاسبانِ ادب کے صدر بھی ہیں۔ ۱۹۶۸-۶۹ء میں بیتول ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا۔ ۱۹۷۲ء میں بی ایس سی کی سند حاصل کی۔ اسکول میں ہاکی کے سربرآوردہ کھلاڑی تھے کالج میں آ کر این سی سی میں داخلہ لیا۔ ہائی اسکول ہی میں شاعری کی طرف طبیعت مائل ہو چکی تھی۔ شعر و شاعری اور این سی سی کے ماتحت انعامات حاصل کیے۔ کالج سے فارغ ہو کر کاروبار پر غور کی تو زمانے کے حالات دیکھ کر طبیعت گھبرا گئی۔ اپنی تھوڑی سی زمین میں کاشت کاری شروع کر دی۔ ساتھ ہی ایل۔ بی میں بھی داخلہ لے لیا اور وکالت پاس کر لی۔ ۱۹۷۹ء وکالت کا کام شروع کر دیا ہے۔ ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ ہندی میں گیت، غزلیں مکتک۔ مرثیے وغیرہ کہتے ہیں، لیکن غزل کی طرف رجحان زیادہ ہے۔ چناں چہ نمونۂ کلام کے ضمن میں موصوف نے ہندی غزلوں کے اشعار عطا فرمائے ہیں، جو ہدیۂ ناظرین ہیں۔

رس بھی جیون میں گھول کر دیکھو میٹھے دو بول ۔ بول کر دیکھو
کتنے موتی ہیں، کتنے پتھر ہیں اپنے اندر کھنگول کر دیکھو
کلپناؤں کے گھروندے نہ رچو گرم ریتی کو رول کر دیکھو

سُکھ میں دُکھ دُکھ میں پلا ہے جیون　　جیسا ڈھالا. ڈھلا ہے. جیون
کبھی پی گیا یہ داوانل　　کبھی اوس میں پلا ہے جیون

شُشی کلا جب لے کر نکلے چاندی کا اک تھال
تم بھی پر یہ بکھیر دینا اپنے مُکھ پر بال
میگھوں کے آنچل میں جب وہ کھیلے آنکھ مچولی
تم مسکان کی چادر سے ڈھک لینا سندر گال
شُشی کلا چندر کا جیون اور اظہر کے جیون کی
تم ہی کلپنا. تم ہی گیت ہو. اور تم ہی سُور تال

سوپن مالی کا جب سپھل ہو گیا　　میری بگیا کا ہر پھول پھل ہو گیا
اب تو دلدل میں آنے لگیں تتلیاں　　کیچ میں جب سے پیدا کنول ہو گیا
بھا گیہ پر جو تو بیٹھا رہا اے اظہر　　میں یہ سمجھوں گا تو بھی نربل ہو گیا

پریت کی پیاس پیاس ہوتی ہے　　مرتے مرتے بھی آس ہوتی ہے
آتما جا ملے گی ایشور سے　　دیہہ نشور رہے ناس ہوتی ہے
جب میں سنکٹ میں مسکراتا ہوں　　تو میرے آس پاس ہوتی ہے

○

کتابیات

نمبر شمار	نام کتاب
۱	کمپیریٹیو گریمر آف دی ماڈرن ایرین لنگویجز آف انڈیا۔ مصنفہ مسٹر جان بیمس
۲	گریمر آف ہندی لنگویج۔ مرتبہ مسٹر کیلاگ
۳	ولسن فلالوجیکل لیکچرز مرتبہ رام کرشن گوپال بھنڈارکر
۴	گریمر آف دی ایسٹرن ہندی۔ از مسٹر روڈلف ہارنلی
۵	شونسگھ سروج۔ از ٹھاکر شونسگھ سینگر
۶	مضامین جارج ابراہیم گریرسن
۷	ماڈرن ورنیکولر لٹریچر آف ناردرن ہندوستان
۸	لینگوشٹک سروے آف انڈیا۔ از جارج ابراہم گریرسن
۹	مراٹھی بھاشا۔ از مسٹر یو۔ ایل بلاک
۱۰	اِمرجن اینڈ ڈویلپمنٹ آف دی بنگال لنگویج مطبوعہ سنہ ۱۹۲۶ مصنفہ سنیت کمار چیٹرجی۔
۱۱	مصر بندھو ونود۔ از پنڈت شیام بہاری مصر
۱۲	ہندی کووِد رتن مالا۔ مرتبہ بابو شیام سندر داس بی۔ اے۔
۱۳	کوتا کومدی۔ مرتبہ پنڈت رام نریش
۱۴	برج مادھوری سار۔ مصنفہ دیوگی ہری جی
۱۵	ہندی ساہتیہ کا اتہاس۔ مصنفہ پنڈت چندر شکل
۱۶	برج بھاشا۔ از بابو رام سکسینہ
۱۷	لا اینڈو ایرین۔ از مسٹر بلاک
۱۸	آدھونک ہندی ساہتیہ کا اتہاس
۱۹	کھڑی بولی اور ہندی ساہتیہ کا اتہاس
۲۰	ناتھ سمپردائے۔ از ڈاکٹر ہزاری پرشاد
۲۱	بھاشا کی شکھشا۔ از شری سیتا رام چترویدی
۲۲	ہندی کا تمیک اتہاس از پروفیسر وشوناتھ
۲۳	ہندی ساہتیہ کا سوبودھ اتہاس۔ از شری گلاب رائے ایم اے

نمبر شمار	نام کتاب
۲۴	ہندی ساہتیہ کا سنکھشت اتہاس
۲۵	ہندی ساہتیہ کی روپ ریکھا
۲۶	ہمارا ہندی ساہتیہ اور بھاشا پریوار از پنڈت بھوانی شنکر
۲۷	ہندی ساہتیہ کا اتہاس۔ از ڈاکٹر دھریندر ورما
۲۸	اکبری دربار سے ہندی کوی۔ از ڈاکٹر سرجو پرساد اگروال
۲۹	منتخبات ہندی کلام از ڈاکٹر محمد حفیظ الله حسن خاں
۳۰	ہندی شاعری۔ از ڈاکٹر اعظم کریوی
۳۱	تاریخ ہندی ادب از سید ظہیر الدین علوی
۳۲	ہندی ادب کی تاریخ از ڈاکٹر محمد حسن
۳۳	جدید ہندی شاعری از ڈاکٹر محمود حسین خاں
۳۴	انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا
۳۵	اریٹین لینگویجز اینڈ پرشین
۳۶	گریرسن مقدمہ لسانیاتی تبصرۂ ہند
۳۷	شاہنامہ فردوسی
۳۸	قدیم فارسی کے کتبے از ڈاکٹر شکمار سین
۳۹	رگ وید
۴۰	شوپران
۴۱	اسکندھ پوران
۴۲	پراکرت پرکاش مع ترجمہ و تشریح

نمبر شمار	نام کتاب
۴۳	ہندی کے مسلم ساہتیہ کار از پرمانند پانچال
۴۴	اُردوئے قدیم از حکیم شمس الدین قادری
۴۵	رام چرت مانس از تلسی داس
۴۶	چیٹرجی بنگالی لینگویج
۴۷	آب حیات از آزاد دہلوی
۴۸	رامائن بالمیکی منظوم از سوریہ نرائن مہر دہلوی
۴۹	ہماری شاعری از سید مسعود حسن رضوی
۵۰	تاریخ ریختی از سید محمد مبین نقوی الٰہ آبادی
۵۱	جذبات بھاشا۔ از نیاز فتح پوری
۵۲	آثار الصنادید از سر سید احمد خاں
۵۳	رسالہ تحقیق زبان ریختہ از مولوی عبد الغفور نساخ
۵۴	باغ و بہار، از میر امن دہلوی
۵۵	ایشیاٹک ریسرچ جرنل از مسٹر کولبروک
۵۶	گل رعنا از سید عبد الحئی
۵۷	ظہیر الانشاء
۵۸	جلوۂ خضر
۵۹	خزینۃ العلوم
۶۰	رسالہ قواعد اُردو از امام بخش صہبائی
۶۱	آریائی زبانیں از پروفیسر ڈاکٹر سدھیشور ورما
۶۲	ہماری قومی زبان از سر تیج بہادر سپرو
۶۳	اُردو ہندی ہندستانی از سجاد ظہیر
۶۴	[illegible]

نمبر شمار	نام کتاب
۶۵	جواہر فریدی
۶۶	تذکرہ ریختہ گویان - از سید فتح علی حسینی
۶۷	پنجاب میں اُردو - از حافظ محمود شیرانی
۶۸	غزالان الہند از غلام علی آزاد بلگرامی
۶۹	جواہر الاسرار اللہ از شاہ علی محمد
۷۰	مثنوی خوب ترنگ، از شیخ محمد خوب
۷۱	مثنوی یوسف زلیخا - از محمد امین
۷۲	سب رس از ملا وجہی
۷۳	خوش نغز از میراں جی
۷۴	معراج العاشقین، از حضرت بندہ نواز گیسو دراز
۷۵	تذکرہ ہندی از مصحفی
۷۶	شرف نامہ
۷۷	عیون الاخبار، از ادریس بن حسن
۷۸	مجالس المومنین
۷۹	راس مالا
۸۰	مرات احمدی
۸۱	پریچنگ آف اسلام
۸۲	مجالس سیفیہ
۸۳	منتخب التواریخ - از پنڈت چندر سین
۸۴	تاریخ ہند از رتن لال
۸۵	تقسیم ہند، از ڈاکٹر راجندر پرشاد سابق صدر جمہوریہ ہند

نمبر شمار	نام کتاب
۸۶	کنٹری بیوشن از جھینہ این سی - صاحب
۸۷	ہسٹری آف جہانگیر از ڈاکٹر بینی پرشاد
۸۸	تاریخ ادبیات بنگال از دنیش چندر سین
۸۹	تاریخ فرشتہ
۹۰	الغفران از ابوالعلا المعری
۹۱	پدماوت از ملک محمد جائسی
۹۲	چشمہ کوثر، از علامہ شیرانی
۹۳	تزکِ بابری
۹۴	ہسٹری آف پرشین لینگویج اینڈ دی لٹریچر ایٹ دی مغل کورٹ
۹۵	مغل بادشاہوں کی ہندی
۹۶	مسلمانوں کی ہندی سیوا
۹۷	بابر نامہ
۹۸	اشٹنی چیتر از لال جی
۹۹	تزکِ جہانگیری
۱۰۰	اکبر نامہ از ابوالفضل
۱۰۱	آئین اکبری از ابوالفضل
۱۰۲	ہزہری کے وِدوہ و ثیبک چھند
۱۰۳	ہندی لٹریچر
۱۰۴	طبقاتِ اکبری
۱۰۵	معاصر الامرا
۱۰۶	معاصر رحیمی

۱۰۷ رحیم ستناولی
۱۰۸ خان خاناں نامہ
۱۰۹ ہندی گدھیہ وکاس
۱۱۰ بزم تیموریہ
۱۱۱ اسرار معرفت از بابالال داس جی
۱۱۲ رقعات عالمگیری
۱۱۳ مشک بہتّری
۱۱۴ کافر بودھ
۱۱۵ پرتھوی راج راسو از چند بردائی
۱۱۶ ہمیر راسو
۱۱۷ لباب الالباب از محمد عوفی
۱۱۸ عزۃ الکمال از خسرو
۱۱۹ تاجک نیل کنٹھی
۱۲۰ قاموس المشاہیر جلد اول و دوم (نظامی بک ڈپو)
۱۲۱ مآثر الکرام یا سرو آزاد - از مولانا آزاد بلگرامی
۱۲۲ مثنوی بوعلی شاہ قلندر
۱۲۳ بہار، اور اردو شاعری، از محمد معین الدین دردائی
۱۲۴ سلاطین ہند کی علم پروری از محمد حفیظ اللہ
۱۲۵ سخنوران دکن از سید تمکین عابدی

نمبر شمار نام کتاب

۱۲۶ سوانحعمری امیر مینائی (از حضرت آہ)
۲۲۷ ہندی گیت - از بدر الحسن اختر
۲۲۸ نظیر اکبر آبادی (مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی)
۲۲۹ کیفیہ از کیفی دہلوی
۱۳۰ کبیر دوہاولی
۱۳۱ بابا فرید کے دوہے
۱۳۲ واجد علی شاہ اختر، از ڈاکٹر محمد تقی احمد
۱۳۳ خزینۃ الاصفیا
۱۳۴ قلمی بیاض از مہر جائسی مرحوم
۱۳۵ قلمی بیاض از سید محمد اکبر عادل سیتاپوری
۱۳۶ قلمی بیاض از نادم سیتاپوری
۱۳۷ قلمی بیاض از پروفیسر لوگندر پال صابر، شکوہ آبادی
۱۳۸ سیر محمدی
۱۳۹ تاریخ حبیبی
۱۴۰ تذکرہ طور کلیم، از مولانا سید نور الحق خاں
۱۴۱ تذکرہ انتخاب یادگار از امیر مینائی
۱۴۲ اردو شہ پارے - از ڈاکٹر محی الدین قادری زور

نمبر شمار	نام کتاب
۱۴۳	ارمغان یوم محمد قلی قطب شاہ
۱۴۴	طبقات الشعرا
۱۴۵	تذکرہ تاریخ شعرائے اردو۔ مولوی کریم الدین
۱۴۶	تذکرہ شعرائے اردو۔ از میر حسن
۱۴۷	تذکرہ نکات الشعرا از میر تقی
۱۴۸	مراۃ سکندری
۱۴۹	سیر المتاخرین
۱۵۰	مراۃ السلاطین
۱۵۱	مخزن الاصفیا
۱۵۲	بھگت مال
۱۵۳	پریم پرکاش۔ از شاہ برکت اللہ پیمی۔
۱۵۴	دیوان ظفر (ہر چہار جلد)
۱۵۵	نادرات شاہی۔ از شاہ عالم ثانی
۱۵۶	تذکرہ کاملان رام پور
۱۵۷	مرأۃ الجنان، از محمد باقر آگاہ
۱۵۸	من لگن از بحری دکنی
۱۵۹	(تذکرہ اذکار الابرار، مطبوعہ شاہی پریس لکھنؤ)
۱۶۰	تذکرہ گلشن بے خار
۱۶۱	تذکرہ بزم سخن
۱۶۲	تذکرہ سخن الشعرا
۱۶۳	تلامذۂ غالب از مالک رام
۱۶۴	ریاض الفصحا از مصحفی
۱۶۵	تاریخ محمدی المعروف حدیقۂ اصفہان ٹونک۔
۱۶۶	پیت کی ریت (دیوان ہندی حکم حیدرآبادی)
۱۶۷	حیات وارث از مرزا محمد ابراہیم بیگ لکھنوی
۱۶۸	بھجن شائق وارثی۔ از شائق وارثی
۱۶۹	ست گرو وارث، از الف شاہ وارثی
۱۷۰	پریم لیلا از شائق وارثی
۱۷۱	کربل نگری از نجم آفندی
۱۷۲	مثنوی طلعۃ الشمس۔ از شمس لکھنوی
۱۷۳	پریم بھگتی از نجم آفندی
۱۷۴	تاریخ اسلام ہندی منظوم از نجم آفندی
۱۷۵	دیوان جی۔ از ظریف لکھنوی
۱۷۶	سوامی درشن۔ از سوامی مارہری
۱۷۷	نغمۂ دل ربا حصہ اول۔ از منشی جگن ناتھ سہائے
۱۷۸	نغمۂ دل ربا حصہ دوم، از منشی جگن ناتھ سہائے۔

نمبر شمار	نام کتاب
۱۷۹	نغمۂ جانفزا، حصہ سوم از منشی جگن ناتھ سہائے
۱۸۰	پیری خانہ از واجد علی شاہ اختر
۱۸۱	تاریخ ال اصفیا
۱۸۲	ماہ نامہ نگار لکھنؤ
۱۸۳	ماہ نامہ آج کل۔ دہلی
۱۸۴	رہنمائے تعلیم لاہور۔ حال دہلی
۱۸۵	ماہ نامہ معارف اعظم گڑھ
۱۸۶	ماہ نامہ اوم دہلی
۱۸۷	ماہ نامہ سرسوتی (ہندی)
۱۸۸	ماہ نامہ دھرم یگ (ہندی)
۱۸۹	ماہ نامہ کلیان گورکھپور (ہندی)

نمبر شمار	نام کتاب
۱۹۰	رسالہ سب رس حیدرآباد۔ دکن
۱۹۱	رسالہ مارننڈرڈ لاہور
۱۹۲	رسالہ وگیان دہلی
۱۹۳	علی گڑھ میگزین
۱۹۴	ماہ نامہ شاعر بمبئی کا قومی یکجہتی نمبر
۱۹۵	رسالہ نوائے ادب بمبئی
۱۹۶	ہفتہ وار اخبار ہماری زبان
۱۹۷	اخبار سناتن دھرم پرچارک
۱۹۸	اخبار ویر بھارت
۱۹۹	اخبار ہریجن سیوک
۲۰۰	رسالہ آردو
۲۰۱	تاریخ نافع السالکین